بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسلسلہ اصلاح افکار

# مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار

حصہ دوم

## اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا

# تحقیقی جائزہ

مؤلف

مفتی محمد رضوان

ادارۂ غفران راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار

اور

# تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات

# کا تحقیقی جائزہ

(حصہ دوم)

''مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ''
تالیف اور متعدد اہلِ علم واہلِ فکر حضرات کے متعلق ایک کتاب اور مضمون میں
درج شدہ بعض تنقیدات، اعتراضات ومغالطات
اور الزامات کے جوابات، تنقیحات وتوضیحات
اور مولانا سندھی صاحب وغیرہ کے بعض افکار پر کلام

مؤلف
مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

www.idaraghufran.org

(جملہ حقوق بحق ادارہ غفران محفوظ ہیں)

نام کتاب: مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ (حصہ دوم)

مؤلف: مفتی محمد رضوان خان

طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ 1440 ہجری - جولائی 2019 عیسوی

صفحات: 564

ملنے کے پتے

Idara Ghufran

# فہرست


| مضامین | صفحہ نمبر |
|---|---|
| تمہید (از مؤلف) | 9 |
| ایک صاحب کی طرف سے موصول شدہ تحریر | 38 |
| مندرجہ بالا تحریر کا جواب از: مفتی محمد رضوان | 40 |
| (مقدمہ) | // |
| مولانا سندھی صاحب کی خدمات وشاذ افکار کا معاملہ | 45 |
| ہماری اصل کتاب کا بنیادی مقصد | 48 |
| مولانا سندھی صاحب کے متعلق مختلف نظریات اور اعتدال | 50 |
| مولانا سندھی صاحب کے متعلق ناانصافی کا الزام | 67 |
| حضرت مدنی کا موقف | 69 |
| مولانا احمد علی لاہوری صاحب کا موقف | 71 |
| مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا موقف | 72 |


Idara Ghufran

| | | |
|---|---|---|
| | مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا موقف | 74 |
| | مولانا سید محمود میاں صاحب کا موقف | 75 |
| | مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کا موقف | 76 |
| | بندے کا موقف | 84 |
| | مولانا زرولی خان صاحب کا موقف | 85 |
| | (فصل نمبر 1)<br>**حضرت مدنی کے بیان کے جھوٹا ہونے کا الزام** | 98 |
| | مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی تصریح | 107 |
| | مولانا لغاری، اور غلام مصطفیٰ خان صاحبان کی تصریح | 111 |
| | پروفیسر محمد سرور اور مولانا سندھی صاحبان کی تصریح | 135 |
| | مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی تصریح | 138 |
| | مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی تصریح | 139 |
| | مفتی محمد شفیع، مولانا بنوری اور علامہ عثمانی صاحبان کی تصریح | 142 |
| | مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تصریح | 148 |
| | مولانا سید محمود میاں صاحب کی تصریح | 149 |
| | مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب کی تصریح | 150 |
| | **خبر کا درجہ عینی مشاہدہ کی طرح نہیں ہوتا** | 154 |
| | جناب ماہر القادری صاحب کی تصریح | 158 |


Idara Ghufran

| | |
|---|---|
| جناب موسیٰ بھٹو اور عبدالماجد دریابادی صاحبان کی تصریح | 158 |
| جناب شکیل عثمانی صاحب کی تصریح | 163 |
| ماضی کے بجائے حال کے صیغوں کا قضیہ | 167 |
| دماغ خراب ہونے کی تعبیر | 170 |
| (فصل نمبر 2) **حضرت مدنی کے مضمون میں تحریف کا الزام** | 171 |
| ''عقیدت مند'' اور ''غیرت مند'' میں تبدیلی کا الزام | 177 |
| ''حجاز پہنچے'' اور ''پہنچے ہیں'' میں تبدیلی کا الزام | 179 |
| ''رحمۃ اللہ علیہ'' میں تبدیلی کا الزام | 181 |
| ''وہ آئے'' اور ''آئے اور'' میں تبدیلی کا الزام | 183 |
| ''شمع'' اور ''شموع'' میں تبدیلی کا الزام | 184 |
| ''حصہ تھا'' اور ''حصہ شامل تھا'' میں تبدیلی کا الزام | 186 |
| ''متخالف امور وطرز ہوتے'' میں تبدیلی کا الزام | 187 |
| (1)..... حضرت مدنی کا ''البلاغ'' میں شائع شدہ مکمل مضمون | 189 |
| (2)..... حضرت مدنی کا ''انوارِ مدینہ'' میں شائع شدہ مکمل مضمون | 199 |
| (3)..... حضرت مدنی کا ''الخیر'' میں شائع شدہ مکمل مضمون | 207 |
| (4)..... حضرت مدنی کا ''برہان'' میں شائع شدہ مکمل مضمون | 215 |
| (5)..... حضرت مدنی کا ''ذاتی ڈائری'' میں شائع شدہ مکمل مضمون | 222 |


Idara Ghufran

| | |
|---|---|
| (6).....حضرت مدنی کا ''صدق'' میں شائع شدہ مضمون | 230 |
| (فصل نمبر 3)<br>حضرت مدنی کے بیان کی غلط تشریح کرنے کا الزام | 233 |
| حضرت مدنی کے بیان کی توضیح | // |
| مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی بیان کردہ توضیح | 250 |
| مولانا سید محمود میاں صاحب کی بیان کردہ توضیح | 251 |
| مولانا ظہور احمد بگوی صاحب وغیرہ کی بیان کردہ توضیح | 267 |
| مشہور مؤرخ صاحبِ ''موجِ کوثر'' کی بیان کردہ توضیح | 269 |
| مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی بیان کردہ توضیح | 274 |
| اختلاف کے باوجود، شخصی احترام کی وجہ | 300 |
| (فصل نمبر 4)<br>حضرت لاہوری کے اختلاف سے متعلق الزام | 306 |
| مولانا لاہوری کے اختلاف سے متعلق مولانا سندھی کا مکتوب | 307 |
| مولانا سندھی سے اختلاف کے متعلق مولانا لاہوری کا مکتوب | 314 |
| مولانا دین محمد وفائی کا مشاہدہ اور تصریح | 317 |
| مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بیان کردہ توضیح | 319 |
| مولانا سندھی صاحب کے مکتوب کے ایک جملے کی توضیح | 323 |


www.idaraghufran.org

| | |
|---|---|
| (فصل نمبر 5) حضرت تھانوی کے اختلاف سے متعلق الزام | 328 |
| مولانا تھانوی کا مولانا سندھی سے اختلاف اور حسنِ سلوک | 330 |
| مولانا تھانوی کا مولانا سندھی کو سرسید احمد کی طرح مخلص کہنا | 335 |
| سرسید احمد خان کے متعلق، حضرت تھانوی وغیرہ کی رائے | 340 |
| سرسید احمد، نیچریت اور مولانا سندھی کے افکار | 380 |
| مولانا ابوالکلام آزاد اور سرسید احمد خان | 447 |
| ذاتی اختلاف کے بجائے، علمی و دینی اختلاف | 485 |
| (فصل نمبر 6) مولانا مسعود عالم ندوی کے اختلاف سے متعلق الزام | 493 |
| مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کی بنا مسلکی اختلاف نہیں | 496 |
| مولانا مسعود عالم ندوی کا اختلاف اور شخصی احترام | 502 |
| مولانا سید سلیمان ندوی کے تاثرات | 505 |
| مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات | 510 |
| مولانا عبدالماجد ندوی کے تاثرات | 521 |
| مولانا ریاست علی ندوی کے تاثرات | 523 |
| مولانا مسعود عالم ندوی سے مولانا سندھی کی مکاتبت | 524 |


Idara Ghufran

| | | |
|---|---|---|
| | (فصل نمبر 7)<br>چند مزید الزامات پر کلام | 528 |
| | الزام نمبر 1 پر کلام | // |
| | الزام نمبر 2 پر کلام | 532 |
| | الزام نمبر 3 پر کلام | 541 |
| | الزام نمبر 4 پر کلام | 542 |
| | الزام نمبر 5 پر کلام | 543 |
| | الزام نمبر 6 پر کلام | 544 |
| | الزام نمبر 7 پر کلام | 547 |
| | الزام نمبر 8 پر کلام | 548 |
| | ختم شد | 561 |


Idara Ghufran

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تمہید

(از: مؤلف)

معاشرہ میں متعدد فکری ونظریاتی غلط فہمیوں کے پائے جانے کی وجہ سے بندہ محمد رضوان نے کچھ عرصے قبل ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی تھی، جس میں بندہ نے مختلف اہلِ علم، اہلِ قلم واہلِ فکر حضرات کے متعدد مضامین وتحریرات کو جمع کیا اور ترتیب دیا تھا، جن میں سے بعض نایاب مضامین وتحریرات، چند اکابر ومشائخِ دیوبند کی بھی تھیں۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے متعلق متعدد اہلِ علم واہلِ قلم اور تجزیہ نگار حضرات کی طرف سے آرا وتبصرے موصول ہوئے، ان آرا وتبصروں کو مذکورہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا۔

کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بندہ کو ایک فاضل ناقد کی طرف سے مذکورہ کتاب کے متعلق جذباتی تنقید پر مشتمل خط موصول ہوا، جس میں موضوع سے ہٹ کر اور کچھ ذاتی نوعیت کی تنقیدات بھی تھیں، ساتھ ہی موصوف کی طرف سے اس خط کے جواب کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا، تاکہ اُن کی بدگمانی دُور ہوسکے، بندے نے اس خط کا موصوف کو مختصر جواب دیا تھا، پھر دوبارہ موصوف کی طرف سے ایک اور اسی نوعیت کا خط موصول ہوا تھا، جس کے بعد بندے کو موصوف کی طرف سے ان کے خط میں تنقیدات کے جوابات تحریر کرکے ان کو شائع کرنے کا خیال ہوا، لیکن بعض بزرگوں اور احباب سے مشورے کے پیشِ نظر ان تنقیدات کے جوابات کے بجائے، صرف متعلقہ موضوع سے متعلق کیے جانے والے دو شبہات کے جوابات کسی نام کی صراحت کے بغیر اگلے ایڈیشن کے ''ضمیمۂ ثانیہ'' میں شائع

کیے گئے۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں شامل ''حضرت مدنی وحضرت تھانوی کے مولانا سندھی سے متعلق موقف پر شبہ کا ازالہ'' کے عنوان سے مضمون موصوف کی طرف سے پیش کیے گئے، ان ہی شبہات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے بعد اس کتاب کا ایک ضمیمہ بھی الگ سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد موصوف نے گزشتہ دنوں ایک کتاب ترتیب دی، اور اس کتاب کے مخصوص انتساب، بعنوان ''انتصاف'' میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (جامعہ دارالعلوم کراچی) مولانا ابن الحسن عباسی صاحب (کراچی) اور مولانا زرولی خان صاحب (جامعہ احسن العلوم کراچی) کے ساتھ، بندہ ''محمد رضوان'' کا نام بھی تحریر کیا، اور مذکورہ حضرات وافراد کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم وناانصافی کے ارتکاب سے بچنے اور انصاف کرنے کی دعوت دی، اور ساتھ ہی بعض دیگر اہلِ علم حضرات پر بھی اس طرح سے تنقید کی، جس سے ان کی دیانت داری، دینداری اور علمی وتحقیقی سنجیدہ خدمات پر بھی زَد پڑتی ہے۔

اس کتاب سے متعلق بندہ کو ایک صاحب کی طرف سے تحریر موصول ہوئی، جس میں اس کتاب اور اس میں مذکور بعض ابحاث سے متعلق چند سوالوں کے جوابات کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ موصوف فاضل ناقد کا تحریر فرمودہ ایک اور مضمون بھی نظر نواز ہوا، اس میں بعض مندرجات اسی طرح کے تھے۔

اس مضمون اور کتابِ مذکور کے بعض مندرجات کو مطالعہ وملاحظہ کرنے کے بعد فاضل ناقد صاحب کی طرف سے بعض مقامات پر عبارات وحوالہ جات اور ان کی توضیحات وتنقیدات میں تحقیق کے معتدلانہ وغیر متعصّبانہ اصولوں کی رعایت ملحوظ ہونے میں کچھ کمی رہ جانے کا احساس ہوا، اگرچہ کسی دوسرے کی نظر میں ایسا نہ ہو، جس سے محسوس ہوا کہ ان امور کی افراط

وتفریط سے بچ کر معتدلانہ، دیانت دارانہ اور غیر متعصّبانہ، تحقیق وتنقید اور توضیح وتشریح کی ضرورت ہے، اگرچہ متعدد امور کی تحقیق وتوضیح بندہ کی مفصل کتاب کے مضامین اور بندہ کی کتاب کے ضمیمہ جات میں بھی شائع ہوچکی ہے، لیکن مذکورہ تحریر کو ملاحظہ کرنے کے بعد بعض امور کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی، جن کی وضاحت نہ ہونے کے باعث متعدد شبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں، بلکہ ہورہی ہیں۔

اس لیے اب بندہ نے اس موصول ہونے والی تحریر کے جواب میں زیرِ نظر مضمون مرتب کیا، جس کو ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ (حصہ دوم)'' کے طور پر شائع کیا جارہا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں بعض جگہ متن یا حواشی کے اندر چند عبارات میں تکرار نظر آئے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب اور مضمون میں بعض مقامات پر مختلف قسم کے شبہات واعتراضات یا سوالات اُٹھائے گئے ہیں، جن کا تعلق مختلف فصلوں سے ہے، اور ان کے جوابات ایک ایک عبارت ہی سے مختلف پیراؤں میں معلوم ہوتے ہیں، ایسی صورت میں بعض قارئین کے لیے متعلقہ مقامات پر پوری عبارت ملاحظہ کیے بغیر محض حوالہ دے دینا مقصود ومدعا کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کافی نہ ہوتا، بلکہ دشواری اور الجھن کا باعث بنتا، اس لیے بعض عبارات کو ایک سے زیادہ مقامات پر تحریر ونقل کیا گیا ہے، جو اپنی جگہ افادیت سے خالی نہیں، قارئین سے درخواست ہے کہ اس کی وجہ سے اکتاہٹ محسوس نہ فرمائیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ زیرِ نظر مضمون مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی خدمات واوصاف کی توضیح یا ان کے متنازع افکار وخیالات کی تردید کے موضوع پر مستقل حیثیت سے ترتیب نہیں دیا گیا، بلکہ اس سلسلہ میں بعض تنقیدات وشبہات اور اعتراضات ومغالطات کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، اور مولانا سندھی صاحب کے اوصاف وخدمات یا ان کے غلط افکار وخیالات سے متعلق کچھ باتیں اس میں ضمناً آ گئی ہیں، اس پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر اس مضمون کو مطالعہ

وملاحظہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔

جہاں تک مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی خدمات واوصاف یا ان کے افکار کا معاملہ ہے، تو ان دونوں امور پر متعدد حضرات نے اپنے اپنے انداز اور بساط کے لحاظ سے کتب ورسائل یا مقالات ومضامین تحریر کیے ہیں، وہ اس وقت ہمارا مستقل موضوع نہیں، البتہ اس سلسلہ میں متعدد مضامین ہم نے اپنی مفصل کتاب میں بھی نقل کردیئے ہیں، وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، بعض دوسرے مضامین بھی اس موضوع پر موجود ہیں، خاص طور پر مولانا سندھی کی ذاتی ڈائری اور مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی خدمات واوصاف کے متعلق تاریخی گفتگو ہے۔

تاہم موجودہ دور کے بعض افراد کے اس سلسلہ میں تحریر کردہ مضامین ملاحظہ کرنے سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے مولانا سندھی صاحب کے دینی افکار وخیالات اوران کے اسباب وعوامل کی سنجیدہ وعلمی تحقیق کے مسئلہ کو ذاتی اَنا اور گروہی عصبیت کا مسئلہ بنالیا ہے، اسی وجہ سے اس سلسلہ میں ان کا قلم، دینی علمی وتحقیقی دلائل کو ملاحظہ اوران کا سامنا کرنے کی بجائے علمی وتحقیقی کارناموں اور دین کے سنجیدہ خدام کی تحقیر وتنقیص اور مخالفت کرنے پر اپنی صلاحیتوں کو زیادہ تر خرچ کرنے لگا ہے، اوراس کے نتیجہ میں اب یہ مسئلہ دینی وعلمی نکتۂ نظر سے صحیح وغلط افکار وخیالات کی تحقیق وتنقید اوران کے متعلق افہام وتفہیم سے زیادہ، افراط وتفریط، تعصب و تحزب اور ذاتی ضد بازی ونفسانیت کی نذر ہونے لگ رہا ہے۔

حالانکہ اولاً تو اگر کسی صاحبِ علم کو دوسرے کی علمی ودینی رائے سے اتفاق نہ ہو، بلکہ اختلاف ہو، تو اسے اپنی فیما بینہٗ وبین اللہ دیانت دارانہ علمی ودینی رائے کو ظاہر کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، لیکن اس علمی ودینی اختلاف کو افراط وتفریط، باہمی تعصب وتحزب اور ذاتی ضد بازی ونفسانیت اور دوسرے اصحابِ علم ومشاہیر کی ذاتی وشخصی بے احترامی اور تحقیر وتنقیص یا ان سے حسد، بغض وعداوت قائم کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

فقہائے کرام میں ایک نہیں ہزاروں مسائل میں باہم بلکہ پیر کا مرید اور استاد کا شاگرد کے ساتھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اور اب بھی ہے، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط کی حد تک اپنے نزدیک راجح رائے پر شرعی وفقہی دلائل قائم کیے ہیں، لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے شخصی احترام کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی، اور دوسرے کی ذات پر آنچ نہیں آنے دی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس قسم کا اجتہادی وفقہی اختلاف ہونے کے باوجود ان تمام فقہائے کرام واکابرِ عظام کا ایک دوسرے کے متبعین ومقلدین اور معتقدین کے دلوں میں احترام قائم اور باقی ہے، ہمارے مدارسِ دینیہ وجامعات اور متعدد اسلامی یونیورسٹیوں میں روزمرہ ایسے مسائل طلبۂ کرام کے سامنے زیرِ درس وزیرِ بحث آتے ہیں کہ ان میں اساتذہ وطلبہ کی رائے کسی ایک فقیہ کی رائے کے مطابق ہوتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ہر قدم پر دوسرے فقہائے کرام واکابرِ عظام کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور عین اختلاف اور دوسرے کی رائے کی علمی وفقہی کمزوری کے اظہار کے وقت بھی دوسرے کی شان اور رائے میں تحقیر وتذلیل پیدا کرنے کے پہلوؤں سے نہ صرف یہ کہ اجتناب کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، بلکہ دل میں بھی ان کے احترام میں کمی نہیں پاتے، اصل دیوبندی مکتبِ فکر میں اس کا خاص اہتمام ولحاظ پایا جاتا ہے، البتہ آج کے دور میں کچھ ناعاقبت اندیش یا تزکیۂ نفس سے محروم عناصر اس کے برعکس، طرزِ عمل اختیار کر کے اپنی عاقبت وآخرت خراب کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ نظریاتی وفکری بے راہ روی کو عام فقہی وفروعی مسائل کے اختلاف کا درجہ دے کر نظرانداز کرنا بھی درست نہیں ہوتا۔

البتہ جن مسالک وشخصیات کا باہم نظریاتی وفکری اختلاف ہوا، ان میں بھی سنجیدہ علمی شخصیات نے ایک دوسرے سے سخت سے سخت اختلاف کرنے کے باوجود، ایک دوسرے کے شخصی وذاتی احترام کو ہدف بنانے سے حتی الامکان اجتناب کیا، اور اسی کے ساتھ بوقتِ ضرورت دوسرے کی عمدہ صفات وغیرہ کا بھی اعتراف کیا، اور اختلاف کو اختلاف کی حد تک محدود رکھا،

اختلاف برائے اختلاف سے کنارہ کشی اختیار کی۔

خود مولانا سندھی صاحب کے بعض متضاد و متنازع اور شاذ افکار و خیالات پر تنقید کرنے والے مستند و سنجیدہ حضرات نے بھی بے جا تعصُّب و تحزُّب سے بچتے ہوئے مولانا سندھی صاحب کی ذات و شخصیت کا احترام اور ان کے اوصاف و خدمات کا اظہار و اعتراف کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے متبعین میں مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار و خیالات سے اختلاف کے باوجود، ان کی خدمات وصفات کا اعتراف اور ان کا ذاتی و شخصی احترام آج تک قائم و باقی ہے۔

لیکن آج کے دور میں کچھ غیر سنجیدہ افراد کی طرف سے کسی بھی قسم کے اختلافِ رائے کی صورت میں ان چیزوں کی رعایت کم ہی باقی رہ گئی ہے، اور بعض حضرات وافراد کا طرزِ عمل یہ بن گیا ہے کہ وہ کسی مسئلہ کی تحقیق کے دوران اپنے مخالف کی رائے کو مرجوح اور اس سے بڑھ کر مردود قرار دینے کے لیے غیر متعلقہ بلکہ دوسرے کے ذاتی و نجی امور اور مزین و مطول الفاظ کے ذخیرہ کو زیرِ بحث لاکر اور دوسرے کی ذاتی و شخصی بے احترامی اور تحقیر و تنقیص کا ارتکاب کر کے اپنی رائے میں وزن پیدا کرنے، اس کو سو فیصد صواب اور دوسرے کی رائے کو سو فیصد خطا قرار دینے اور اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے اور منوانے کی بے جا کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تعصُّب و تحزُّب پر مشتمل یہ طرزِ عمل شریعت کے مزاج اور سلف کے طریقہ، بطورِ خاص اصل اکابر و مشائخِ دیوبند کے مزاج و مزاق سے مطابقت نہیں رکھتا، اور اسی وجہ سے اس میں خیر و برکت اور سلامتی و عافیت نظر نہیں آتی اور اس کے معاشرہ پر اچھے ثمرات و نتائج مرتب ہوتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔

ماضی میں زمانہ قریب کے اکابر و مشائخ اور اہلِ علم و اہلِ قلم بلکہ اہلِ حق پیر و مرید، استاد و شاگرد کے باہمی آراء کے اختلافات کا طرزِ عمل بھی موجودہ دور کے ان غیر سنجیدہ حضرات

وافراد کے مذکورہ طرزِ عمل سے قطعی طور پر موافقت نہیں رکھتا، اس مسئلہ کی تفصیل بندہ نے اپنی مستقل تالیف ''اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب'' میں ذکر کردی ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

اگر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف نیک نیتی کے ساتھ اور محض دین کے لیے ہو، تو کچھ مضائقہ نہیں ''الافاضات الیومیہ'' (ماخوذ از: آپ بیتی نمبر ۶ یا یادِ ایام نمبر ۵، صفحہ ۳۳۰، فصل نمبر ۱۵ ''اکابر کا معمول، تنقیدات اور آپس کے اختلاف کے بارے میں'' مطبوعہ: مکتبۃ الشیخ، بہادر آباد، کراچی)

اور فرماتے ہیں:

ہمارے اندر یہی باتیں تو نہیں رہیں، بلکہ اس کے بجائے تحزّب اور گروہ بندی کا مرض آگیا ہے (امت کے باہمی اختلافات اور ان کا حل، ص ۱۹۱، افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ انتخاب وترتیب: محمد زید مظاہری ندوی۔ ناشر: ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنو)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''تحزب، و تعصب للتحزب'' مدارس کی طرح جماعات کا بھی پسندیدہ نہیں۔

''بغضک للشئ یعمی و یصم و کذلک حبک للشئ یعمی ویصم'' (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 185، مکتوب نمبر: 108، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

اس سے معلوم ہوا کہ بے جا تعصب وتحزب، خواہ کسی کی محبت کی صورت میں ہو، یا بُغض کی صورت میں، وہ مبتلیٰ بہٖ کو حقائق سے دُور کردیتا ہے، بلکہ اندھا بہرا بنادیتا ہے، بعض احادیث

وآثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اپنے ایک اور مکتوب میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہئے، تصلب اور تعصب حکمِ دین میں چاہئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت۔ **بل ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين**'' (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 114، مکتوب نمبر: 73، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

اس سے معلوم ہوا کہ اشخاص ومسالک میں تعصب وتشدد، پسندیدہ نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے مختلف فتنے اور حقائق کا انکار لازم آتا ہے، جیسا کہ گزرا۔

شیخِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

کسی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت میں جب نفسانیت شامل ہوجاتی ہے، تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے، نہ مخالفت، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہو، اسے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہو، اسے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی۔

آج کل حمایت ومخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہوچکے ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظورِ نظر ہوا، تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف وتوصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا، اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیرِ عتاب آ گیا، تو اس کی ساری خوبیاں ملیا میٹ ہوگئیں اور اس میں ناقابلِ اصلاح کیڑے پیدا ہوگئے.....

بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہوجاتی ہے، تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افواہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے، اور اس میں

تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، حضرت والد صاحبؒ ایسے موقع پر متعلقین کو اس طرزِ عمل سے سختی کے ساتھ روکتے، اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے، تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً بری ہی ہوں گی (میرے والد میرے شیخ، ص ۱۴۷، ۱۴۸، ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1430 جنوری 2009)

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

آج کل تو دعووں اور اظہار برتری کا نام علمی تحقیق رکھ دیا گیا ہے اور حملہ بازی اور دوسرے کی تنقیص و تذلیل کو تنقید کا مقدس نام دے دیا گیا ہے، کسی سے عقیدت ہو تو، اینک ماہ و پروین، کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں، عقیدت نہ ہو تو اس کی ہر دلیل صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔

جو بات ایک مرتبہ زبان یا قلم سے نکل گئی، پتھر کی لکیر بن کر وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے، لیکن یہ سب باتیں نفسانیت کی پیداوار ہیں اور جہاں فریقین کا مقصود ہی حق کی تلاش ہو، وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کہنے والا میری رائے کے موافق کہہ رہا ہے، یا مخالف، وہاں نظر اس پر رہتی ہے کہ کیا کہہ رہا ہے، کس دلیل سے کہہ رہا ہے

(البلاغ، اشاعت خصوصی، جمادی الاخری، تا شعبان، ۱۳۹۹ھ، ص ۱۷۱، مرتبہ: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص یا جماعت کی حمایت یا مخالفت میں نفسانیت کا شامل ہونا بُرا ہے، اور اس سے وہی مختلف فتنوں پر مشتمل تحزب و تعصب اور تحاسد و تباغض وغیرہ وجود میں آتا ہے، جس کا ذکر پیچھے گزرا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دل آزار اسلوبِ بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس کے بجائے ہمدردی و دلسوزی اور نرمی و

شفقت سے کام لے کر ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق کو حق یا باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیا جائے، کیونکہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کے تسکین کے لئے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ داعیِ حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہئے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو، لیکن اگر اسے کوئی توڑنا چاہے، تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے، چنانچہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحب حق کے معاملہ میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا، جس سے عناد کے بجائے دلسوزی، حق پرستی اور للّٰہیت مترشح ہوتی تھی.....

جس شخص یا گروہ کے خلاف بات کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات وافکار اور اس کے منشاومراد کی اچھی طرح تحقیق کرلی جائے، اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے، جو اس نے نہیں کہی، یا جو اس کی عبارتوں کے منشا کے خلاف ہو۔

آج کل بحث ومباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط وتثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں، جو اس نے نہیں کہی ہوتی ہیں۔

یہ طرزِ عمل اول تو انصاف کے خلاف ہے، دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بسا اوقات اس کے نتیجے میں بحث ومباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، جو افتراق وانتشار پر منتج ہوتا ہے۔

(میرے والد میرے شیخ، ص ۱۱۳، و۱۱۴، ناشر مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید : محرم الحرام 1430 جنوری 2009)

www.idaraghufran.org

اس سے معلوم ہوا کہ باطل کے مقابلہ میں مداہنت سے بچتے ہوئے، حق گوئی میں بھی اپنی نفسانیت کی تسکین کے لئے طعن و تشنیع اور فقرہ بازیوں کے انداز سے اجتناب کرنا چاہئے، چہ جائیکہ جس سے اختلاف حق و باطل کا بھی نہ ہو۔

نیز دوسرے کی تردید کے جوش میں غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا، انصاف کے خلاف اور مختلف فتنوں کا سبب ہے، اختلاف کی صورت میں اس کی حدود کی رعایت بہت ضروری ہے۔ خواہ اختلاف کسی سے بھی ہو، یہاں تک کہ استاد اور شاگرد کے مابین، امام ابوحنیفہ اور آپ کے تلامذہ، نیز اکابر و مشائخ، اہلِ علم و اہلِ فضل حضرات نے باہمی اختلاف کے دوران بھی اس کا خوب اہتمام کیا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> قلب میں اکابر کی محبت و عظمت اور ان کے علمی و عملی بلند مقام کی وقعت کے باوجود مسائلِ شرعیہ میں دلائل کے پیشِ نظر ان سے اختلافِ رائے واجب ہے (رسالہ ''صبح صادق''، مشمولہ احسن الفتاویٰ جلد ۲ صفحہ ۱۹۰)

حضرت شیخ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

> الحمدللہ! جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم و تلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے، اس لیے بنامِ خدا تعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھ پر واضح ہوا، وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں۔ آمین۔
>
> (فقہی مقالات، جلد ۲، صفحہ ۵۵، ۵۶، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، اشاعت: جولائی 1996ء)

نیز فرماتے ہیں:

> علم و تحقیق کے سفر میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں، جہاں ایک طالب علم کو کسی

دوسرے عالم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے، اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ نہ تو کسی کا ادب واحترام اس سے اختلافِ رائے کے اظہار میں مانع ہوا، اور نہ کبھی اختلاف رائے نے ادب واحترام میں ادنیٰ رخنہ اندازی کی، آپ نے بعض مسائل میں بڑے بڑے علماء سے اختلاف کیا، بلکہ اپنے شیخ ومربی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلاف رائے رہا، اور خود حضرتؒ نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمہارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا، اور میرے دلائل پر تمہیں شرح صدر نہیں، اس لئے دونوں اپنے موقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں، لیکن ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلافِ رائے ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ ان کے ادب واحترام میں کوئی ادنیٰ فرق نہ آنے دیتے، بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح محمل بھی تلاش کر کے لکھ دیتے۔ (میرے والد میرے شیخ، ص ۱۳۸، ۱۳۹، ناشر: مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1430 جنوری 2009)

اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

بعض اوقات کسی مسئلہ کی تحقیق میں مرشد ومرید کا اختلاف بھی ہو جاتا، صفحے کے صفحے اپنے اپنے دلائل اور اشکالات کے جواب میں بذریعہ خطوط لکھے جاتے، کبھی مرید اپنے مرشد کی تحقیق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا، کبھی مرشد، مرید کی تحقیق کو ترجیح دے کر اپنی رائے سے رجوع کر لیتا اور اگر کبھی ایک دوسرے کے دلائل میں پورے غور وفکر اور باہمی مشوروں کے باوجود اختلاف رائے باقی رہتا تو مسئلہ دریافت کرنے والے پر اختلاف کا اظہار کر دیا جاتا، تاکہ اسے جس کے فتوے پر زیادہ اطمینان ہو، اس کے مطابق عمل کرے (ماہنامہ ''البلاغ''، اشاعت خصوصی، جمادی الاخری، تا شعبان، ۱۳۹۹ھ، ص ۱۷۰، مرتبہ: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

www.idaraghufran.org

مولانا مفتی صبار دانش صاحب، لکھتے ہیں:

آپ (یعنی مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ) کی تصانیف وتحریرات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ نے مسائل کے اختلاف میں کبھی سخت متعصّبانہ الفاظ نہیں استعمال کئے، ذاتیات سے ہمیشہ دامن بچایا اور کبھی ایسا انداز بیان اختیار نہیں فرمایا جس سے دوسرے عالم کی توہین وتذلیل ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اختلافات میں آپ بہت محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے اور وہ اختلافات صرف مسئلے کی حد تک ہوتے تھے، تلخی کلام کی نوبت نہیں آتی تھی اور اختلاف رائے پر کبھی غصہ یا ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے اگرچہ اختلاف کرنے والا آپ کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب جو کئی سال تک حضرت کے زیر سایہ فتاوی کے جوابات دیتے رہے، فرماتے ہیں۔

احقر کو بہت سی جگہ اختلاف رائے بھی ہوتا، بندہ عرض کردیتا کہ یہ جواب آپ کی رائے کے مطابق لکھ دیا ہے، آپ دستخط فرمادیں، میں دستخط نہیں کروں گا، میری گذارش بشاشت سے قبول فرماتے اور دستخط فرمادیتے (البلاغ، اشاعت خصوصی، جمادی الاخری، تا شعبان، ۱۳۹۹ھ، ص: ۷۲۹، و ۷۳۰، مرتبہ: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

مزید لکھتے ہیں:

آپ (یعنی مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ) نے بعض مسائل میں اپنے شیخ ومربی حکیم الامت، مجدد الملت حضرت تھانوی قدس سرہ سے بھی اختلاف فرمایا ہے ،جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ شیخ سے فقہی اختلاف اپنے نفس کی اصلاح میں مانع نہیں اور شیخ کو بھی مرید کے فقہی اختلاف سے اظہار ناراضگی یا انقباض نہ ہونا چاہئے، بلکہ شیخ کی اپنی غلطی ہو، تو اس سے رجوع ہوجانا چاہئے،

www.idaraghufran.org

جیسا کہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ کا طرزِ عمل تھا (البلاغ، اشاعت خصوصی، جمادی الاخری، تا شعبان، ۱۳۹۹ھ، ص: ۷۳۳، مرتبہ: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ کسی کا ادب واحترام، اس سے اختلافِ رائے کے اظہار میں مانع نہیں ہونا چاہئے، جس طرح اختلافِ رائے کا اظہار کسی کے ادب واحترام میں مانع نہیں ہونا چاہئے، اس اصول کے پیشِ نظر استاد وشاگرد اور پیر ومرید کا اختلاف اور ادب واحترام بھی ایک دوسرے کے منافی نہیں۔

اسی اصول کے پیشِ نظر اکابر ومشائخ اور اہلِ علم واہلِ فضل عمل کرتے رہے، جس کی وجہ سے دین بھی محفوظ رہا، اور شخصیات کا درجہ بھی اپنی جگہ برقرار رہا، اور باہمی بغض وعداوت کی فضا قائم نہیں ہوئی، مگر افسوس کہ آج کے دور میں بعض حضرات وافراد ان دونوں چیزوں میں فرق نہیں سمجھتے، اور علمی ودینی سنجیدہ اور باوقار اختلاف کو دوسرے کے ادب واحترام کے خلاف سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہوکر طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔

مولانا مفتی شعیب اللہ خان مفتاحی صاحب (بانی الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور، انڈیا) لکھتے ہیں:

> ایک وجہ غلو کی تعصب ہوتا ہے اور تعصب کی تعریف یہ ہے کہ حق وناحق سے قطعِ نظر اپنے لوگوں کی تائید ونصرت کرنا، خواہ وہ اپنے لوگ نسب وخاندان کے لحاظ سے اپنے ہوں، یا مسلک ونظریے کے لحاظ سے اپنے ہوں، یا کسی جماعت وطبقے کے لحاظ سے اپنے ہوں۔ [1]
>
> پھر یہ تعصب طبقاتی وجماعتی بھی ہوتا ہے اور افراد وشخصیات کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے، چناں چہ بہت سی جماعتوں اور فرقوں کی جانب سے تعصب کی بنا پر دین میں غلو کی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں، وہ اپنے مسلک ونظریے کے لیے تعصب برتتے

---

[1] قرآن وسنت میں اس کی مذمت اور بُرائی آئی ہے، جیسا کہ آگے ''مقدمہ'' میں آتا ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

ہوئے، کبھی قرآن سے اور کبھی حدیث سے دلیل لیتے ہیں، حال آں کہ نہ وہ قرآن کا منشا ہوتا ہے، نہ حدیثِ رسول کا، اس طرح یہ لوگ دین میں غلو کر جاتے ہیں۔

اسی طرح اپنی جماعت اور اپنے طبقے و مسلک کے لوگوں سے کچھ بھی ہو جائے، وہ روا رکھا جاتا ہے اور وہی بات دوسرے کی جانب سے پیش آئے، تو اس پر رد و انکار کیا جاتا ہے۔ یہی وہ تعصّبات ہیں، جو دین میں غلو کا سبب بنتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ کسی شخصیت کے سلسلے میں تعصب برتتے ہوئے غلو کرنے لگتے ہیں اور اس کی اچھی و بری باتوں، یا حق و ناحق باتوں کو ایک درجہ دیتے چلے جاتے ہیں، گویا کہ وہ شخصیت معصوم ہے۔ اسی تعصب نے غلو کو یہاں تک پہنچا دیا کہ اس نے عجیب عجیب گل کھلائے (غلو فی الدین، حقیقت، اسباب اور صورتیں، ص ۱۱۶، و ۱۱۷، مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور)

اس عبارت سے بھی باہمی تعصب کی مذمت معلوم ہوئی۔

نیز موصوف لکھتے ہیں:

ہر اختلاف مذموم و برا نہیں ہوا کرتا اور نہ ہر اتفاق محمود و قابلِ تعریف ہوتا ہے؛ بلکہ ان میں الگ الگ درجات ہیں۔

مگر بعض لوگ شدید سے شدید اختلاف و اصولی اختلاف کو بھی یہ کہہ کر ہلکا و معمولی قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں دو رائیں و نظریے ہیں؛ لہٰذا کوئی بڑی بات نہیں، حتی کہ ان اصولی و شدید اختلافات کو حضراتِ صحابہ و ائمہ کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات سے تشبیہ دیتے ہیں۔

حالانکہ صحابہ و ائمہ میں جو اختلاف تھا، وہ فروعی مسائل میں تھا، اصولی مسائل میں نہیں تھا۔

دوسری جانب کچھ حضرات وہ ہیں، جو ہر اختلاف کو اصولی اختلاف اور ایمان وکفر کے اختلاف کا ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اس سے وہی معاملہ کرتے ہیں، جیسے اصولی اختلاف سے ہونا چاہیے۔

حال آں کہ یہ اختلاف نہ کوئی مذموم ہے، نہ ممنوع۔

اب ہم آگے بڑھتے ہوئے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں قسم کے اختلاف کا حکم ودرجہ یکساں نہیں ہے؛ بل کہ دونوں کے درجے میں ایسا ہی فرق ہے، جیسے زمین وآسمان میں اور حق وباطل میں اور حرام وحلال میں ہے۔ [1]

مگر بعض لوگ اس فرق کو نظر انداز کر کے دونوں اختلافات کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں اور دونوں کو مذموم وحرام قرار دیتے ہیں اور ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو اختلاف کی قسمِ اول کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ان آیات واحادیث سے صرف اس اختلاف کی مذمت وبرائی ثابت ہوتی ہے، جو بغیر دلیلِ شرعی، نفسانیت وشرارت سے کیا جائے اور بنیادی و مسلمہ عقائد ومسائل میں ہو؛ لیکن دوسری قسم کا اختلاف جو دلائل کی روشنی میں کیا جائے اور اجتہادی وفروعی مسائل میں ہو، ان سے اس کا مذموم ہونا ثابت نہیں ہوتا (غلو فی الدین، حقیقت، اسباب اور صورتیں، ص ۴۱۳، مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور)

مزید لکھتے ہیں:

آیات واحادیث میں جس اختلاف کی مذمت وبرائی آئی ہے، اس سے پہلی قسم کا اختلاف مراد ہے، یا اس سے مراد گروہ بندی وپارٹی بازی ہے، جس کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق وتضلیل کی جائے اور ان جزوی مسائل کی بنا پر حسد وبغض

---

[1] یعنی غیر اجتہادی حرام وحلال میں، ورنہ اجتہادی حرام وحلال کا اختلاف فروعی نوعیت کا ہوتا ہے، جس میں فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

رکھا جائے، یہ بلاشبہ سخت قبیح چیز ہے۔

رہا فروعی مسائل میں آرا کا اختلاف، جو قرآن وحدیث کے فہم اور ان کی تعبیر و تشریح میں تفاوت کی بنا پر واقع ہوا، وہ نہ قرآن وحدیث میں مذموم ٹھہرایا گیا، نہ ممنوع قرار دیا گیا۔

اور اسی لیے فروعی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی یا ایک دوسرے پر ملامت و مذمت یا طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بل کہ تمام ائمہ وعلما کا احترام اور عظمت کرنا چاہیے اور ان سے محبت و الفت کا طریق اپنانا چاہیے۔

چناں چہ سلفِ صالحین کے یہاں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔

امام یحییٰ بن سعید تابعی رحمہ اللہ نے بڑی حقیقت افروز بات بیان فرمائی:

**اهل العلم اهل توسعة ، و ما برح المفتون يختلفون، فيحلل هذا ، و يحرم هذا ، فلا يعيب هذا على هذا ، و لا هذا على هذا(تذكرة الحفاظ: ج ۱ ،ص ۱۲۴ )**

(اہلِ علم توسع رکھنے والے ہیں اور ہمیشہ سے حضراتِ مفتیان کے مابین مسائل میں اختلاف رہا ہے کہ یہ مفتی کسی چیز کو حلال کہتے ہیں، تو دوسرے مفتی اس کو حرام قرار دیتے ہیں؛ لیکن نہ یہ ان پر کوئی عیب لگاتے، نہ وہ ان پر کوئی نکتہ چینی کرتے ہیں)

لہٰذا ائمہ کے درمیان ہونے والے اختلاف کو اسی حد میں رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

لیکن اب بعض لوگوں نے اسی کو حق و باطل کا معیار قرار دے کر امت کے شیرازے کو منتشر کرنا شروع کر دیا ہے اور خود کے اختیار کردہ مسئلے و مسلک کو صحیح و درست اور

دوسرے کے مسلک کو باطل قرار دینے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ائمہ وفقہا کی توہین وتذلیل کو دین سمجھنے وسمجھانے کی فکر کی جاتی ہے، یہ غلو کی وہ صورت ہے، جس سے امت میں انتشار کا رونما ہونا یقینی بات ہے (غلو فی الدین، حقیقت، اسباب اور صورتیں، ص ۴۱۷، و ۴۱۸، مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور)

موصوف اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

جس طرح فروعی اختلاف کو اصولی اختلاف کا درجہ دینا غلط و بے اعتدالی کی بات ہے، اسی طرح اصولی اختلاف کو جزئی وفروعی اختلاف کا درجہ دے کر اس کو روا رکھنا بھی صحیح نہیں ؛ بل کہ ایک بنیادی غلطی ہے (غلو فی الدین، حقیقت اسباب اور صورتیں، ص ۴۲۱، مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

یہاں ایک اور بات پر توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ مختلف فرقوں اور ان کے باطل وغلط نظریات سے اختلاف کرنا اور ان سے اتفاق نہ کرنا، تو لازم ہے؛ لیکن اس تردید واختلاف میں وہ صورت اختیار کرنا چاہیے، جو قرآن وسنت نے ہمیں تعلیم دی ہے اور اسوۂ نبوی نے فراہم کیا ہے؛ کیوں کہ قرآن کریم نے ہمیں ایسے وقت کے لیے ’’ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ‘‘ کی تعلیم دی ہے کہ اگر بحث ومباحثے ومناظرے کی نوبت آجائے تو اچھے انداز سے مناظرہ ومباحثہ کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مباحثہ نرمی و خیر خواہی اور عمدہ خطاب سے ہونا چاہیے.....

الغرض! اصولی اختلاف کرنے والوں سے اختلاف تو کیا جانا چاہیے، مگر ایسا نہیں کہ ان کو گالی دی جائے یا طعن وتشنیع سے کام لیا جائے یا گری ہوئی زبان استعمال کی جائے؛ بل کہ قرآن اور انبیا کی تعلیم کے مطابق نرمی وسنجیدگی، علمی دلائل ومحکم

براہین سے کام لیا جائے ؛ ورنہ یہ بھی ایک قسم کا غلو فی الدین ہوگا (غلو فی الدین، حقیقت، اسباب اور صورتیں، ص ۴۳۳، ۴۳۴، مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور)

اس سے معلوم ہوا کہ اصولی وفروعی نظریاتی وعملی ہر قسم کے اختلاف کو ایک درجہ حاصل نہیں، اور دوسرے سے کسی بھی قسم کا اختلاف ہونے کی صورت میں شرعی قواعد کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس صورت میں شرعی احکام، بالخصوص ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ''اور''اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنْ'' کے مقتضیات سے اپنے آپ کو بری سمجھنا درست نہیں۔

سنجیدہ اصحابِ علم وفکر اور اصحابِ قلم اور اہلِ فضل حضرات کی طرف سے مولانا سندھی صاحب کے افکار سے اختلاف کے باوجود ان کے ذاتی وشخصی احترام کے مناظر کا ذکر تو آنے والے اصل مضمون میں متعلقہ مقامات پر جابجا کردیا گیا ہے، ذیل میں صرف دو اکابر و مشائخِ دیوبند کے باہمی اختلافِ رائے اور ایک دوسرے کے ذاتی وشخصی احترام کے سلسلہ میں چند نمونے ذکر کیے جاتے ہیں۔

قیامِ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، اپنے 6 رجب 1353 ہجری کے مکتوب میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے مرتبہ ومقام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''آنجناب کے علمی کمالات تحریر وتقریر میں فائق وماہر، ذکاوت وحافظہ میں بے نظیر ہونے کا اقرار کرتا ہوں، اور دارالعلوم دیوبند کے لیے صدارتِ تدریس آپ کے شایانِ سمجھتا ہوں، اور قسمیہ کہتا ہوں کہ میں اپنی استعداد اور قابلیتِ علمی، آپ کے شاگردوں کے پائے کی بھی نہیں پاتا'' (تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی، اشاعتِ خاص ماہنامہ ''القاسم''، زیرسرپرستی: مولانا عبدالقیوم، ص ۶۷، درذیل: شیخ الاسلام کا علمی مقام، از پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی، مطبوعہ: القاسم اکیڈمی، خالق آباد، نوشہرہ، تاریخِ طباعت: ذی الحجہ 1426 ہجری، جنوری 2006ء)

اس سے پہلے اپنے قیامِ دارالعلوم دیوبند ہی کے زمانہ میں حضرت مدنی نے 21 رجب

1352 ہجری کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے نام ایک تفصیلی مکتوب ارسال کیا، جس میں انہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

''میری اصل غرض اس عریضہ سے یہ ہے کہ جناب کے صدمہ کا ازالہ ہو جائے، اور اگر میں خطاوار ہوں، تو اس کی معافی ہو جائے۔

میں صدارتِ تدریس کے لیے آپ کی ذات کو بدل و جان قبول اور منظور کرنے والا ہوں، ایک مجھ جیسے پردیسی غریبُ الوطن کی حالت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

بنا بریں امیدوار ہوں کہ دل سے رنج اور صدمہ میری طرف سے حسبِ ارشادِ خداوندی نکال دیں، حقیقت وہ ہے کہ جو عرض کی گئی۔

اور چونکہ خواجہ تاشی (اور ایک سلسلہ سے وابستگی) کی نعمت بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہے، اس لیے ہمارا آپس کا جنگ و جدل اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول نہ ہونا چاہئے۔

ایک وقت میں لڑیں گے، اور دوسرے وقت میں ملیں گے، عداوتِ قائمہ اور عداوتِ قلبیہ نہ ہوگی'' (انوارِ عثمانی، ص ٦٦، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

ایک وقت میں لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ایک دوسرے سے علمی و اجتہادی اختلافِ رائے ہوگا، وہاں اس اختلاف کا اظہار کریں گے، لیکن دوسرے اوقات میں ایک دوسرے سے ملیں گے، نہ تو اپنے عمل سے ایسی عداوت و مخالفت ظاہر ہوگی کہ اختلافِ رائے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے میل و ملاقات اور خوشگوار تعلقات بھی ترک کر دیئے جائیں، اور نہ ہی دل میں عداوت ہوگی، بلکہ دل عداوت و مخالفت، کینہ کپٹ اور تحاسد و تباغض سے پاک ہوگا۔

سبحان اللہ! یہ ہے، اعتدال، جس کی آج بہت سے افراد میں کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ دوسرے سے اس طرح کے اختلاف کو ''نعوذ باللہ'' ذاتی دائمی بغض و عداوت اور دیرینہ بلکہ

دائمی ترکِ تعلقات کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

حضرت مدنی کے مذکورہ مکتوب ہی کے جواب میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی تفصیل سے جواب تحریر فرمایا، جس کے شروع میں علامہ عثمانی نے یہ تحریر کیا کہ:

''الطاف نامہ غیر متوقع طور پر پہنچا، جس محبت و اخلاص اور حسنِ نیت کے جذبے سے وہ لکھا گیا ہے، اُسی روشنی میں بندہ نے پڑھا، سچ یہ ہے کہ یہ مکتوب میرے نزدیک جناب محترم کی سیادت و شرافت اور جانشینی اور استاذ مرحوم کا مرقع ہے، آپ کے بزرگانہ اخلاق سے ہم نیازمند یہی توقع رکھتے ہیں۔ **فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ احسن الجزاء ووفقنا و ایاکم لما یحب و یرضیٰ۔**

اس کے بعد چند حقائق عرض کرنا چاہتا ہوں'' (انوارِ عثمانی، ص ۶۷، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

پھر علامہ شبیر احمد عثمانی نے چند حقائق ذکر کرنے کے بعد اپنے اسی تفصیلی مکتوب کے آخر میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

''آپ کے لکھنے پر یہ چند الفاظ لکھے گئے ہیں، ورنہ اس وقت اپنے عقیدہ میں دیوبند کی صدارتِ تدریس کے لیے آپ کو احق ترین سمجھتا ہوں، پھر آپ سے کینہ کپٹ کیسے رکھ سکتا ہوں۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن　　آئین ما است سینہ چو آئینہ داشتن

جو الفاظ آپ کی شانِ گرامی کے خلاف لکھے گئے ہوں، ان سے کریمانہ مسامحت فرمائیں۔

بھلا دو میرے منہ سے بات اگر کوئی بری نکلی
یہ بیدردی ہے کہنا، آہ بسمل بے سری نکلی

والسلام

www.idaraghufran.org

(انوارِ عثمانی، ص ۷۱، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی، دونوں حضرات ایک دوسرے سے اختلافِ رائے کے باوجود، ایک دوسرے کی دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس قبول ومنظور اور تسلیم کرنے کے لیے کس طرح آمادہ وتیار ہیں، اور ایک دوسرے کی اپنے طرزِ عمل سے اکرام اور دل سے عزت میں کسی اختلاف کی وجہ سے کمی نہیں آنے دیتے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب بھی اخلاقِ حسنہ اور صفاتِ عالیہ میں حضرت مدنی سے پیچھے نہیں، ان دونوں شخصیات وحضرات کے الفاظ وکلمات پڑھ اور سُن کر علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مدنی کے مابین اخلاقِ حسنہ اور صفاتِ عالیہ کی سبقت میں فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے، کیونکہ مختلف جہات سے ہر ایک ہی دوسرے سے بڑھ کر نظر آتا ہے۔

حضرت مدنی اور علامہ عثمانی کے مذکورہ مکتوبات کو نقل کرنے سے پہلے، پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن صاحب شیرکوٹی صاحب لکھتے ہیں:

''میں ان دونوں حضرات کے خطوط کو تبرک سمجھ کر اس مجموعۂ مکتوبات میں پیش کررہا ہوں۔

قارئین کو ان دونوں حضرات کے خیالات کی روشنی میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے اکابر کے درمیان اگر اختلاف ہوئے بھی ہیں، تو ان کا ظہور نیک نیتی پر مبنی ہوتا تھا، آپ کو دونوں حضرات کے خطوط میں صفائی قلب اور خوشگوار تعلقات رکھنے کا جذبہ موجزن نظر آئے گا، آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے کمالات کے اعتراف میں اپنے آپ کو، دوسرے سے کمتر سمجھنے میں کس قدر پیش پیش ہیں۔

اختلافات کہاں نہیں ہوتے، البتہ اکابر میں مخالفتیں نہیں ہوا کرتیں، ان دونوں

خطوط میں بھی اختلاف تو نظر آتا ہے، مگر مخالفت کا نام نہیں، بس اس جذبہ کے ماتحت ان تبرکات کو پڑھا جائے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان خطوط کو زندہ رکھنے کے لیے اس مجموعہ میں ان کو جگہ دی ہے کہ اہلِ بصیرت کو اکابرین کے اختلافی نظریات میں بہت سی مشکلات کا حل مل جاتا ہے (انوارِ عثمانی، ص ۶۳ و ۶۴، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

ان حضراتِ اکابر و مشائخ کی مذکورہ اور ان جیسی صفاتِ عالیہ و اخلاقِ حسنہ اور صدق و اخلاص کی بدولت آج دارالعلوم دیوبند جیسے اداروں کے تشخص کو پورے عالم میں بحمد اللہ تعالیٰ خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض افکار سے بھی اہلِ دیوبند کو اختلاف تھا، اور آج بھی ہے، مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے بعض افکار پر بڑی کڑی تنقید فرمائی ہے، جو ان کی بعض تالیفات میں طبع ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود مشائخِ دیوبند نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے ذاتی و شخصی احترام و اکرام کو اپنی جگہ باقی رکھا۔

چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد کے علم اور ذاتی عقائد و خیالات پر میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔

نہ میں ان کو خود غرض سمجھتا ہوں، لیکن فی الحال جس لائن پر چل رہے ہیں، میرے نزدیک وہ اس منزلِ مقصود پر پہنچانے والی نہیں، جس کا نشان انہوں نے ''الہلال'' وغیرہ میں دیا تھا۔

اس کے باوجود میرے قلب میں ان کی عزت برابر موجود ہے'' (انوارِ عثمانی، ص ۲۰۰، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

ملاحظہ فرمائیے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب سے اختلاف

www.idaraghufran.org

کے باوجود، نہ تو ان کو خود غرض قرار دیا، اور ان ہی ان کی قلب میں عزت کی نفی محسوس کی۔

حضرت مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبان کے مابین آزادی سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ کی حمایت میں اختلاف تھا، حضرت مدنی، کانگریس کی حمایت کے اور علامہ عثمانی مسلم لیگ کی حمایت کے قائل تھے، لیکن اس کے باوجود، وہ دونوں ایک دوسرے کا احترام واکرام کرتے تھے، اور کسی کو اپنی رائے منوانے اور دوسرے کی رائے ترک کرنے پر جبر نہیں فرماتے تھے، نہ ہی اس سلسلہ میں دوسرے کی ذاتی تحقیر و تنقیص کو گوارا فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ عثمانی کے پیغامِ کلکتہ اور خطبۂ صدارت مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ کی وہ عبارت پڑھیے، جس میں علامہ عثمانی نے مسلم لیگ کے حامیوں کی، مولانا حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کی شان میں گستاخیاں کرنے والوں کی پُرزور مذمت کی ہے، اور اسی طرح قائدِ اعظم کو کافر کہنے والے کانگریسیوں کی بھی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کی۔

علامہ نے لیگ اور کانگریس کے معتقدین اور سیاستدانوں کو حدِّ اعتدال اور دائرۂ تہذیب میں رہ کر کام کرنے کی طرف پورے خلوص اور حسنِ نیت سے توجہ دلائی ہے۔

خطبۂ صدارت مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ میں علامہ عثمانی نے، مولانا مدنی کے متعلق تحریر فرمایا:

''بعض مقامات پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ کیا گیا ہے، میں اس پر اظہارِ بیزاری کیے بغیر نہیں رہ سکتا، مولانا کی سیاسی رائے خواہ کیسی ہی ہو، ان کا علم وفضل بہرحال مسلم ہے، اور اپنے نصبُ العین کے لیے ان کی عزیمت وہمت اور انتھک جدوجہد ہم جیسے کاہلوں کے لیے قابلِ عبرت ہے، اگر مولانا کو

اب مسلم لیگ کی تائید کی بناء پر میرے ایمان میں خلل بھی نظر آئے، یا میرے اسلام میں شبہ ہو، تو مجھے ان کے ایمان اور ان کی بزرگی میں کوئی شبہ نہیں''۔

یہ عبارت علامہ کی بلند کرداری اور اعلیٰ انسانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے'' (تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی، اشاعتِ خاص ماہنامہ ''القاسم''، زیرِ سرپرستی: مولانا عبدالقیوم، ص۲۲۳، درذیل: شیخ الاسلام کے اوصاف وکمالات، از: محمد اکبر شاہ بخاری، مطبوعہ: القاسم اکیڈمی، خالق آباد، نوشہرہ، تاریخِ طباعت: ذی الحجہ 1426ہجری، جنوری 2006ء)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ میرے دل میں حضرت مدنی کا وہ مقام ہے کہ اگر بالفرض نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ حضرت مدنی کو ان کے ایمان واسلام میں شبہ ہو، تب بھی ان کو حضرت مدنی کے ایمان اور ان کی بزرگی میں شبہ نہیں ہوگا۔

شیخ الحدیث مولانا فیض احمد صاحب (ملتان) مقدمہ تفسیرِ عثمانی، مرتبہ: مولانا محمد اشفاق احمد صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ بعض نادان کانگریس کے حامی طلباء نے گستاخی کی اور غلیظ پرچے حضرت عثمانی کے گھر پھینک دیئے۔

اس اطلاع پر حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنی نے نمازِ جمعہ کے بعد دیوبند کی مسجد میں تقریر فرمائی، آپ نے فرمایا:

''میں عرصہ تک بلادِ عربیہ رہا ہوں، مگر جو بات میں نے ہندوستان کے علماء میں دیکھی، وہ کہیں نہیں دیکھی، اور ہندوستان کے علماء میں جو بات میں نے دیوبند کے علماء میں دیکھی، وہ کہیں نہیں دیکھی، اور دیوبند کے علماء میں جو بات میں نے مولوی شبیر احمد کے اندر دیکھی، وہ کہیں نہیں دیکھی، اور میرا خیال ہے کہ جب امت میں کوئی خلل واقع ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ مخصوص بندوں کو بھیج کر اس کی اصلاح کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مولوی شبیر احمد انہی لوگوں میں سے ہیں، لہٰذا

آئندہ مجھ کو معلوم ہوا کہ کسی نے گستاخانہ کلمات لکھ کر ان کے مکان میں ڈالے ہیں، تو میں رات کو اُٹھ اُٹھ کر اس کے لئے بددعا کروں گا'' (تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانی، اشاعتِ خاص ماہنامہ ''القاسم''، زیرِ سرپرستی: مولانا عبدالقیوم، ص۱۰۴، درذیل: علامہ عثمانی ایک جامع شخصیت، از: شیخ الحدیث مولانا فیض محمد صاحب ملتان، مطبوعہ: القاسم اکیڈمی، خالق آباد، نوشہرہ، تاریخِ طباعت: ذی الحجہ 1426ہجری، جنوری 2006ء)

حضرت مدنی کی مذکورہ عبارت کو ملاحظہ کرنے سے ہندوستان کے علماء اور بالخصوص علمائے دیوبند اور بالاخص علمائے دیوبند میں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کے مخصوص امتیازی وصف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ شبیر عثمانی صاحب، اپنے ایک مکتوب میں مسلم لیگ کی حمایت اور اس کے حق میں دلائل ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''آخر میں عرض ہے کہ یہ میری اپنی رائے ہے، کسی دوسرے کو اس کا پابند کرنا مقصود نہیں، جو شخص جس جانب کو اصلح سمجھے، اسے اختیار کرلے۔

ہاں میرا مشورہ دریافت کرنے والوں کے لیے یہی ہے۔

میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہیں آسکتا کہ مولانا مدنی اور حضرت مفتی (کفایت اللہ) صاحب محض ذاتی مقاصد کی بناء پر ہندوؤں کے ساتھ ہیں، یا ان حضرات کا اتباع معاذ اللہ کفر ہے۔

وہ اپنے نزدیک جس چیز کو حق سمجھتے ہیں، اسی کے حامی ہیں، اور اسی کو اپنے استاذ مرحوم کا مسلک سمجھتے ہیں۔

ہاں ضروری نہیں کہ ان کی یہ رائے حق وصواب ہو، یا دوسرے لوگوں پر ان کی تقلید واجب ہو۔ والسلام

شبیر احمد عثمانی۔ از دیوبند۔ 7 ذی الحجہ 1364ہجری

www.idaraghufran.org

(انوارِ عثمانی، ص۲۲۳، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435ہجری، بمطابق اکتوبر 2013عیسوی)

مگر افسوس کہ بہت سے حضرات قیامِ پاکستان کو ستّر (70) سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک اس مسئلہ میں اکابر کے اس عادلانہ ومنصفانہ طرزِ عمل سے ہٹے ہوئے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کی مذکورہ تحریر کی روشنی میں ہم بھی قارئین وسامعین سے عرض کریں گے کہ آنے والے مضمون میں ہمارے نزدیک **فیما بینہٗ وبین اللہ** جورائے راجح ہے، اس کا ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ کسی دوسرے کے نزدیک کوئی دوسری رائے راجح ہو۔

مذکورہ عبارات میں اکابر ومشائخ کے اختلافِ رائے کے یہ صرف چند نمونے ذکر کیے گئے ہیں، ورنہ اس طرح کے مناظر کی تعداد ومقدار کچھ کم نہیں ہے۔

جن لوگوں کی نسبت ان بزرگ واکابر حضرات کے ساتھ وابستہ ہے، انہیں اپنے ان بزرگ واکابر حضراتِ گرامی کے طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر موجودہ دور کی باہمی آراء کے اختلافات کے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اگر آج بھی ان اکابر ومشائخ کے نقشِ قدم پر چلا جائے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارے اس قسم کے اختلافات باہمی خوشگوار تعلقات اور آپس کے اتحاد واتفاق میں حائل نہ ہوں گے، اور اس قسم کے مسائل میں دوسرے سے اختلاف کی بنیاد پر عوامی دنیا میں، اختلاف کنندہ کے خلاف ذہن سازی اور محاذ آرائی کی فضا قائم کرنے کی کوششوں سے نجات حاصل ہوگی۔

ویسے بھی علمی ودینی اختلاف کی بناء پر ذاتی بغض وعداوت، مخالفت ومنافرت اور تحقیر وتنقیص کا طرزِ عمل درحقیقت علمی ودینی کوششوں کے اجر وثواب اور ان کی برکت ونورانیت کو کم یا ختم کرنے کا سبب، اور عنداللہ قابلِ مؤاخذہ ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لاَ تَبَاغَضُوْا، وَلاَ تَحَاسَدُوْا، وَلاَ تَدَابَرُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَلاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ (بخاری، رقم الحدیث ٦٠٦٥، کتاب الادب، باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم (اے مومنو) ایک دوسرے سے بغض وعداوت نہ رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے اعراض کرو، اور تم اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہوجاؤ، اور مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی رکھے (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَجْتَمِعُ فِيْ جَوْفِ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ غُبَارٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَفَيْحُ جَهَنَّمَ، وَلَا يَجْتَمِعُ فِيْ جَوْفِ عَبْدٍ اَلْإِيْمَانُ وَالْحَسَدُ (صحیح ابن حبان، رقم الحدیث ٤٦٠٦، کتاب السیر، باب فضل الجهاد) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن بندہ کے دل میں اللہ کے راستہ میں غبار اور جہنم کی آگ جمع نہیں ہوسکتی، اور نہ مؤمن بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع ہوسکتا (یعنی حسد، ایمان کے مقابل چیز ہے) (ابن حبان)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ

[1] قال شعیب الارنؤوط: إسناده حسن (حاشیة ابن حبان)

www.idaraghufran.org

الْـحَـقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ (مسلم، رقم الحدیث ۱۴۷ "۹۱" کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا، جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی کبر ہوگا۔

ایک آدمی نے عرض کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے، کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اور اس کے جوتے اچھے ہوں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ جمیل (یعنی زینت والا) ہے، جمال (یعنی زینت) کو پسند کرتا ہے۔

کبر تو حق کو ٹھکرانے، اور لوگوں کو کمتر وحقیر سمجھنے کو کہتے ہیں (مسلم)

ان احادیث سے مسلمان کی تحقیر وتذلیل کی ممانعت کے ساتھ ساتھ تکبر اور حسد کرنے کی ممانعت بھی معلوم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ تحاسد وتباغض، افراط وتفریط اور تعصب وتحزب سے بچ کر اعتدال وتوسط کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد رضوان خان

15/ شوال المکرّم/ 1439ھ

بمطابق 30/ جون/ 2018ء بروز ہفتہ

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

Idara Ghufran

# ایک صاحب کی طرف سے موصول شدہ تحریر

محترم جناب مفتی محمد رضوان صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

عرض یہ ہے کہ گزشتہ دنوں آپ کی تالیف ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کا دوسرا ایڈیشن ملاحظہ کیا، جس میں کتاب کے پہلے ایڈیشن پر مختلف تبصرے و تجزیے بھی شاملِ اشاعت ہیں، کتاب کے مضامین بڑے قابلِ قدر اور نایاب ہیں، جن کو ملاحظہ کر کے بندہ بہت متاثر ہوا۔

اس کے بعد اس کتاب کے متعلق جناب کا تحریر کردہ تیسرا ضمیمہ بھی ملاحظہ کیا، جو الگ سے کتابچے کی شکل میں شائع ہوا ہے، اس کو پڑھ کر بھی کئی قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہوا۔

ابھی حال ہی میں مئی 2018ء کو کراچی کے ایک .....نامی شخص نے ''یادگارِ اکابر'' کے نام سے ایک مفصل کتاب شائع کی ہے (مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کراچی)

اس کتاب میں جناب کے ساتھ ساتھ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (جامعہ دارالعلوم کراچی) مولانا مفتی زرولی خان صاحب (جامعہ احسن العلوم کراچی) جناب ابن الحسن عباسی صاحب (کراچی) اور مولانا سید محمود میاں صاحب (جامعہ مدنیہ لاہور) کو متعدد مقامات پر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، اور مذکورہ حضرات کو مخاطب کر کے ان کے موقف پر رَد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بلکہ اس کتاب میں انتساب کی جگہ انتصاف کو عنوان بنا کر درج بالا حضرات وافراد کی طرف کیا گیا ہے، گویا ان حضرات نے مولانا سندھی صاحب کے متعلق ''احوال واقعی'' ذکر کر کے بڑا

ظلم ڈھایا ہے، ناقد اب ان کو ڈانٹ ڈپٹ سے انصاف پہ لانا چاہتے ہیں۔

یہ کتاب جناب کے ملاحظہ کے لیے پیشِ خدمت ہے، امید ہے کہ آپ اس کتاب سے متعلق اپنے تاثرات سے آگاہ و مطلع فرمائیں گے، اور اس میں جو درجِ بالا حضرات وافراد کے موقف پر کئی جگہ تنقید کی گئی ہے، بطورِ خاص اس پر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں گے۔

اس کے علاوہ مذکورہ کتاب کے مرتب صاحب کا ایک مضمون بھی ''ماہنامہ الجمعیۃ، راولپنڈی'' میں شائع ہوا تھا، اس میں بھی کچھ اسی قسم کی تنقیدات کا ذکر ہے، یہ مضمون بھی جناب کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہے، اگر اس کے متعلق بھی کچھ وضاحت کردی جائے، تو نوازش ہوگی۔

یہ مسئلہ بڑا اہم ہے، اور اس سلسلے میں بہت افراط وتفریط دیکھنے میں آرہی ہے، ایک طبقہ مولانا سندھی صاحب کو مشائخِ دیوبند میں سے ہونے کی بنیاد پر ان کے بے شمار غلط افکار ونظریات کی تبلیغ وتشہیر میں مشغول ہے، اور دوسرا فریق مولانا سندھی صاحب کے متعلق اس قسم کے افکار ونظریات کو جھوٹا اور غلط قرار دیتا ہے، اور جو باتیں مولانا سندھی صاحب کے حوالے سے تاریخی حوالوں سے بالکل واضح ہیں، ان کا موثر ومعقول جواب دینے میں مختلف طرح کی باتیں کرتا ہے۔

امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں افراط وتفریط سے ہٹ کر منصفانہ تحقیق وتفصیل سے مستفید فرمائیں گے، کیونکہ تنقیدات کا تعلق جن افراد یا ان کے مضامین سے ہو، ان کی طرف سے جواب کے بغیر بات نہیں بنتی، اور اس طرح کی تنقیدات اور شبہات کے متعلق ہمارے بزرگوں کے خاموشی اختیار کرلینے اور جواب نہ دینے سے ہمارے خیال میں بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوتا ہے، اس پہلو کو سامنے رکھ کر جواب سے مستفید فرمائیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

فقط۔ والسلام۔ (مولانا) محمد ہارون خواجہ

محلّہ صادق آباد، ٹرانسفارمر چوک، راولپنڈی

www.idaraghufran.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مندرجہ بالا تحریر کا جواب

از: مفتی محمد رضوان

## (مقدمہ)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کی ارسال کردہ تحریر موصول ہوئی، یادآوری اور ذرہ نوازی کا شکریہ!

**جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء .**

جناب کی طرف سے ساتھ میں ارسال کردہ تحریر اور ذکر کردہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' کو بندے نے ملاحظہ کیا، جناب نے اس کتاب اور منسلک تحریر کے متعلق بندے سے تبصرہ و تجزیہ کی خواہش ظاہر کی ہے، اور اس کتاب اور مضمون میں مذکورہ بعض تنقیدات واعتراضات کے متعلق بندے کی رائے معلوم کی ہے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ مذکورہ کتاب اور مضمون میں ذکر کردہ متعدد تنقیدات وشبہات کے جوابات بندے کی اس موضوع سے متعلق مفصل تالیف کے ضمیموں میں شائع ہو چکے ہیں، بلکہ بعض شبہات وتنقیدات کے جوابات کتاب کے پہلے ایڈیشن میں مختلف اکابر واہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کی تحریرات کے ضمن میں بھی موجود ہیں۔

لیکن فاضل ناقد کی تحریرات اور انداز سے خیال ہوتا ہے کہ موصوف نے شاید ان کا گہرائی سے مطالعہ نہیں فرمایا، یا پھر بعض مضامین ان کی نظر سے نہیں گزر سکے۔

اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ فاضل ناقد نے بندے کی تالیف کے پہلے ایڈیشن کو ملاحظہ کر کے بندے کو خط ارسال کیا تھا، اور جواب کا بھی حکم فرمایا تھا، اگرچہ بندے کی نظر میں فاضل ناقد کا

خط اس قابل محسوس نہیں ہورہا تھا کہ اس کا جواب دیا جائے، لیکن فاضل ناقد کی خواہش پر بندے نے مختصر جواب تحریر کر کے موصوف کو ارسال کردیا تھا، جس کے بعد فاضل ناقد کا دوبارہ خط موصول ہوا تھا، اور اس خط میں بھی موصوف نے وہی سابق انداز اختیار کیا تھا، جس کے بعد اول وہلہ میں بندے نے فاضل ناقد کے خط کے بعض مندرجات کے جوابات تحریر کر کے ان کی خدمت میں ارسال کرنا چاہے، جس میں کچھ باتیں فاضل ناقد کی طرف سے غیر متعلق یا ذاتی نوعیت کی باتوں کے اجمالی اور مختصر جوابات پر بھی مشتمل تھیں، لیکن اس سلسلے میں بعض بزرگوں اور احباب سے مشورے کے بعد لکھنے کی طرف رجحان نہیں بن پایا تھا، اور اس کے بجائے فاضل ناقد نے جو اپنے خط میں دو شبہات ذکر کیے تھے، ایک حضرت تھانوی سے مضمون کے متعلق، اور دوسرا حضرت مدنی کی تحریر سے متعلق، صرف ان کے جوابات کتاب کے اگلے ایڈیشن میں نام کی صراحت کے بغیر تحریر کرنے پر اکتفا کرنے کی طرف رجحان ومیلان بنا تھا۔

چنانچہ اس کے مطابق کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے ضمیمۂ ثانیہ میں ''حضرت مدنی وحضرت تھانوی کے مولانا سندھی سے متعلق موقف پر شبہ کا ازالہ'' کے عنوان سے اس کو شائع بھی کردیا گیا تھا۔

لیکن چونکہ فاضل ناقد نے اپنی مرتب کردہ مذکورہ کتاب میں اور اس کے علاوہ اپنے ایک دوسرے مضمون میں متعدد تنقیدات واعتراضات اور شبہات کو نام کی صراحت اور انتساب بعنوان انتصاف کے ساتھ شائع کردیا ہے، اس لیے اب فاضل ناقد صاحب کے اعتراضات، شبہات وتنقیدات کا صراحت کے ساتھ جواب دینے میں مضائقہ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اب اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس وقت فاضل ناقد جناب قاری تنویر احمد شریفی کی زیرِ ادارت اور ترتیب شدہ کتاب ''یادگارِ اکابر، امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نمبر'' ہمارے سامنے ہے، جو شعبان المعظم

1439 ھجری، مئی 2018 عیسوی کو (مکتبہ رشیدیہ، کراچی) سے شائع ہوئی ہے۔

فاضل ناقد کا ''ماہنامہ الجمعیۃ، راولپنڈی'' میں شائع شدہ تبصرہ بھی اس وقت ہمارے سامنے ہے، جو ماہنامہ ''الجمعیۃ'' کے دو شماروں، جولائی، اور اگست 2017ء کی دو اقساط میں شائع ہوا۔

فاضل ناقد جناب تنویر احمد شریفی، حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ..... ہیں۔

حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز، اور جامع مسجد سٹی اسٹیشن کراچی کے امام وخطیب تھے۔

آپ کی ولادت 1332 ہجری، بمطابق 1914 عیسوی میں کیرانہ، ضلع مظفر نگر، یوپی انڈیا میں ہوئی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے خاص اساتذۂ کرام میں سے تھے۔

مولانا قاری شریف احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آزادی سے قبل دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کیا، آزادی کے بعد پاکستان تشریف لے آئے، اور کراچی شہر کی سٹی ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں امامت وخطابت کے ساتھ، جامعہ تعلیم القرآن شریفیہ کے ذریعے، قرآن مجید کی تعلیم کا سلسلہ جاری فرمایا، اور زندگی بھر غیر ضروری مشاغل، اور عملی سیاست وغیرہ سے الگ تھلگ رہ کر دینی خدمات سرانجام دیں۔ **فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔**

فاضل ناقد صاحب کی اس نسبت کے پیشِ نظر یہ بات نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ ان کی متعلقہ عبارات کی تصریح وتعیین کے ساتھ نقد وتبصرہ کیا جائے، پھر اس قسم کے تبصروں کو سنجیدہ طبقے میں نہ تو زیادہ تر پسند کیا جاتا، اور نہ ہی عام طور پر بندے کا اپنا ذوق اس قسم کے نقد وتبصروں کا ہے، لیکن فاضل ناقد نے چونکہ اپنی تنقیدات واعتراضات کو متعدد حضرات

کے ''انتساب'' کے بجائے ''انتصاف'' کے مخصوص عنوان کے ساتھ، باضابطہ شائع کردیا ہے، اس لیے اب بندے کی نظر میں، ان کے جوابات اور تنقیحات وتوضیحات کو تحریر کرنے اور ان کی اشاعت کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔

پھر یہ معاملہ اگر مولانا سندھی صاحب یا فاضل ناقد یا کسی اور کی صرف ذات کا ہوتا، تو سلسلہ آگے چلانے کے بجائے یہیں ختم کردیا جاتا، کیونکہ برائی کا بدلہ اس کے مثل سے اگرچہ جائز ہے، لیکن اس کو کو درگذر کردینے کی بہت فضیلت ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے فتنہ دب جائے، اور مرتکب کو جسارت پیدا نہ ہو، مگر افسوس کہ یہ معاملہ دین کا ہے، اور اس کو درگذر کردینے سے اسلامی افکار ومقتضیات کے خلاف جسارت، اور مسلمانوں میں بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ [1]

---

[1] فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّه. وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (سورة البقرة،رقم الآية،١٩٤)

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ. وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ . إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيم.وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ(سورة الشورى،رقم الآية،٤٠،الى٤٣)

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِين. وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ . إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ (سورة النحل(سورة الشورى،رقم الآية،١٢٦،الى١٢٨)

فمن عفا أى عمن ظلمه وأصلح أى بالعفو بينه وبين الظالم فأجره على الله(تفسير الخازن،ج٤،ص١٠٢،سورة الشورى)

وقوله تعالى :فمن عفا أى عن المسيء إليه وأصلح ما بينه وبين من يعاد به بالعفو والإغضاء عما صدر منه فأجره على الله فيجزيه جل وعلا أعظم الجزاء(روح المعانى،ج١٣،ص٤٧،سورة الشورى)

الإمام متى رأى بعد التأمل والتجرد عن حظوظ النفس ترك التعزير للعفو سببا للفساد والتجاسر على التعدى وتجاوز الحدود عزر بما تقتضيه المصلحة العامة وليبذل وسعه فيما فيه إصلاح الدين وانتظام أمور المسلمين(روح المعانى،ج١٣،ص٥٠،سورة الشورى)

جميع الآيات دالة على أن العفو أحسن قال تعالى :وأن تعفوا أقرب للتقوى (البقرة) وقال :وإذا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

جس پر حسبِ استطاعت نکیر واجب ہے اور اس پر مداہنت ناجائز، بلکہ مختلف فتن کا سبب ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

مروا باللغو مروا كراما (الفرقان) وقال :خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين (الأعراف) وقال وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصابرين (النحل)

فهذه الآيات تناقض مدلول هذه الآية والجواب :أن العفو على قسمين أحدهما :أن يكون العفو سببا لتسكين الفتنة وجناية الجانى ورجوعه عن جنايته والثانى :أن يصير العفو سببا لمزيد جراء ة الجانى ولقوة غيظه وغضبه، والآيات فى العفو محمولة على القسم الأول، وهذه الآية محمولة على القسم الثانى، وحينئذ يزول التناقض والله أعلم، ألا ترى أن العفو عن المصر يكون كالإغراء له ولغيره، فلو أن رجلا وجد عبده فجر بجاريته وهو مصر فلو عفا عنه كان مذموما، وروى أن زينب أقبلت على عائشة فشتمتها فنهاها النبى صلى الله عليه وسلم عنها فلم تنته فقال النبى صلى الله عليه وسلم :دونک فانتصرى .وأيضا إنه تعالى لم يرغب فى الانتصار بل بين أنه مشروع فقط، ثم بين بعده أن شرعه مشروط برعاية المماثلة، ثم بين أن العفو أولى بقوله فمن عفا وأصلح فأجره على الله فزال السؤال والله أعلم(التفسير الكبير،للرازى، ج٢٧،ص،٦٠٤،سورة الشورى)

فجعل العفو مقروناً بالإصلاح .فالعفو قد يمكن أن يكون غير إصلاح، فقد يكون هذا الذى جنى عليک واجترأ عليک رجلاً شريراً معروفاً بالشر والفساد، فلو عفوت عنه لتمادى فى شره وفساده فالأفضل فى هذا المقام أن تأخذ هذا الرجل بجريرته، لأن فى ذلک إصلاحا ً .قال شيخ الإسلام ابن تيميه :الإصلاح واجب، والعفو مندوب، فإذا كان فى العفو فوات الإصلاح فمعنى ذلک أننا قدمنا مندوباً على واجب، وهذا لا تأتى به الشريعة(مكارم الأخلاق،لمحمد بن صالح بن محمد العثيمين ،ص٢٧،مجالات حسن الخلق)

[1] عن أبى سعيد الخدرى، قال :سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم -يقول: "من رأى منكرا فاستطاع أن يغيره بيده، فليغيره بيده -وقطع هناد بقية الحديث، ومر فيه ابن العلاء -فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع بلسانه فبقلبه، وذلک أضعف الإيمان(سنن أبى داود،رقم الحديث ٣٤٤٠)

قال شعيب الارنووط: إسناده صحيح( حاشيةسنن أبى داود)

حدثنا عمر بن حفص بن غياث، حدثنا أبى، حدثنا الأعمش، قال :حدثنى الشعبى، أنه سمع النعمان بن بشير رضى الله عنهما، يقول :قال النبى صلى الله عليه وسلم " :مثل المدهن فى حدود الله، والواقع فيها، مثل قوم استهموا سفينة، فصار بعضهم فى أسفلها وصار بعضهم فى أعلاها، فكان الذى فى أسفلها يمرون بالماء على الذين فى أعلاها، فتأذوا به، فأخذ فأسا فجعل ينقر أسفل السفينة، فأتوه فقالوا :ما لک، قال :تأذيتم بى ولا بد لى من الماء ، فإن أخذوا على يديه أنجوه ونجوا أنفسهم، وإن تركوه أهلكوه وأهلكوا أنفسهم (بخارى،رقم الحديث ٢٦٨٦)

www.idaraghufran.org

اس لیے اس مضمون کو دینی ضرورت کی حیثیت سے ملاحظہ کیا جائے، اور اس کو مولانا سندھی صاحب، یا فاضل ناقد یا کسی دوسرے کی ذات کی تحقیر و تنقیص یا ذاتی و شخصی نوعیت کے اختلاف پر محمول نہ کیا جائے، اور اس کو کسی کی ذات کی اونچ نیچ یا ہار جیت کا مسئلہ نہ سمجھا اور بنایا جائے۔

اس کے باوجود بھی اگر فاضل ناقد یا کسی اور صاحب کو بندے کی کسی تعبیر یا تحریر کے انداز سے کوئی ذاتی تکلیف پہنچے، تو بندہ پیشگی معذرت خواہ ہے اور بندہ بحمد اللہ تعالیٰ اپنے قلب میں مولانا سندھی صاحب یا فاضل ناقد وغیرہ کی ذات سے کینہ کپٹ اور ذاتی بغض و عداوت محسوس نہیں کرتا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

## مولانا سندھی صاحب کی خدمات و شاذ افکار کا معاملہ

فاضل ناقد نے اپنی مرتب کردہ مفصل کتاب میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی خدمات و اوصاف پر جو متعدد حضرات کے مضامین جمع و مرتب کر کے شائع کیے ہیں، ان کے متعلق ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ ہمیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی صفات و خدمات سے انکار نہیں، اور نہ ہی ان سے کسی منصِف مزاج اور اعتدال پسند کو اختلاف ہونا چاہیے، خواہ اس کو مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار و خیالات بلکہ ان کی طرف منسوب اصل مسلک و مشرب کی بنیادی چیزوں سے ہی اختلاف کیوں نہ ہو، جیسا کہ مختلف حضرات نے مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کرتے اور تنقیدی مضامین لکھتے وقت بھی اس کا اعتراف و اظہار کیا ہے۔

یہاں تک کہ پروفیسر محمد سرور صاحب کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ابتدا ہی میں اس بات کا اعتراف و اظہار کیا کہ:

''مولانا سندھی مرحوم، جن کی وفات زمانہ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں

میں سے تھے، جو اپنے مقصد اور تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں، جو اِن کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔

لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش اور ولولہ رکھتے تھے، انھیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا، جو اِن کی بات سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی۔

خود مولانا سندھی مرحوم بھی اپنی زندگی میں ان کی توثیق فرما چکے ہیں کہ یہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی ہے، لہٰذا یہ کتاب اس لحاظ سے، اور صرف اسی لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے کہ یہ قریبی عہد کے ایک ایسے صاحبِ فکر کی واضح ترجمانی کرتی ہے، جو خود اپنے آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکا تھا۔'' (''ادبیاتِ مودودی'' صفحہ 303، مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بارِ دوم: جولائی 1985ء)

مولانا سندھی صاحب کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ہی لکھا:

''جہاں تک مولانا سندھی کی ذات کا تعلق ہے، کوئی شخص خواہ ان سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو، بہرحال ان کے علم و فضل اور ان کی وسعتِ نظر اور ذکاوت وجَودَت سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔'' (ماخوذ از: ترجمان القرآن، بابت اپریل 1942ء، جلد 2، عدد 2، بحوالہ ''ادبیاتِ مودودی'' صفحہ 222، مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد، مطبوعہ: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، بارِ سوم: مارچ 1985ء)

اس لیے مولانا سندھی صاحب کی ذات کے بجائے اصل اختلاف مولانا سندھی صاحب کے ان افکار و خیالات سے ہے، جو بطورِ خاص (1333 ہجری، 1915ء میں، ہندوستان سے

چلے جانے کے بعد) ان کے متعلق ان کی مختلف تحریرات وتقریرات کے ذریعے سامنے یا منظرِ عام پر آئے، اوران سے اختلاف مولانا سندھی صاحب کے زمانے اوران کے مابعد زمانے کے متعدد مستند اہلِ علم واہلِ فکر حضرات کو رہا ہے، اوراس سلسلے میں انھوں نے مولانا سندھی صاحب کی تحریرات وتقریرات کے علاوہ اپنے متعدد مشاہدات کو بھی پیش کیا ہے، کیونکہ یہ معاملہ کسی کے شخصی اور ذاتی یا نجی اختلاف کے بجائے دین کا ہے، البتہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے ان متعدد متضاد و غیر معتدل افکار وخیالات کا سبب کیا تھا؟ آیا کہ ان کی خاص ذہنی ودماغی انقلابی کیفیت یا کچھ اور؟

یہ ایک الگ اور آگے کا مرحلہ ہے، جس کا تعلق مولانا سندھی صاحب کی ذات اور نجی نوعیت سے ہے، جیسا کہ ملک کی کسی عدالت کے جج کا کام آئین وقانون کی رُو سے کسی کے قصور اور اس کی سزا کا تعین کرنا ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس خاص قصور کے علاوہ وہ کتنا باکمال، صاحبِ کردار اور کن کن عمدہ خصلتوں کا حامل ہے۔

فاضل ناقد کی مرتّبہ کتاب کے بعض مضامین جو مولانا سندھی صاحب کے مناقب، خصائل اور استخلاص وطن کے لئے قربانیوں پر مشتمل ہیں، ان سے ان حضرات وافراد کو نہ انکار ہے، نہ توحش، جن کو انتصاف میں نامزد کیا گیا ہے، یا مولانا سندھی صاحب کے غلط وشاذ افکار کے متعلق جن حضرات وافراد کے مضامین ہماری تالیف میں موجود ہیں۔

تاہم اس کتاب کے بعض مضامین نے مولانا سندھی صاحب کی طرف منسوب بعض ایسے شاذ افکار کی مزید تشریح کردی ہے، جو ایک مخصوص حلقہ کو مسلم نہیں تھے، یا وہ حلقہ ان میں بے جا تاویل کا قائل تھا، جس طرح اس کتاب کے بعض مضامین مولانا سندھی صاحب کی طرف منسوب شاذ افکار کی دور دراز کی تاویلات پر بھی مشتمل ہیں۔

لیکن اگر کچھ لوگ نہ تو مولانا سندھی صاحب کے غلط وشاذ افکار کو غلط افکار تسلیم کرنے کے لیے

تیار ہوں، نہ ہی مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں خاص ذہنی ودماغی کیفیت اور اس کے عوارض کو تسلیم کریں، بلکہ اس کے برعکس غلط افکار کی تبلیغ وتشہیر کو وقت کی ضرورت اور نصبُ العین بنالیں، تو حسبِ قدرت واستطاعت ان کی تردید وتحقیق اپنے مقام پر ضروری ہوتی ہے۔

## ہماری اصل کتاب کا بنیادی مقصد

ہم نے اپنی زیرِ بحث تالیف ''مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکر ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے آغاز میں یہ وضاحت کردی ہے کہ آج کل وطن کے مختلف حصوں میں ایک جماعت تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نام سے کام کررہی ہے، تنظیم کے سرکردہ افراد کی طرف سے وقتاً فوقتاً ایسے غیر معتدل افکار وخیالات کا اظہار واشتہار کیا جاتا رہا ہے، جو ایک مسلمان کے لیے باعثِ تشویش یا تضلیل ہیں۔

تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے سرکردہ افراد اپنی تحریک کو مولانا عبیداللہ سندھی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے افکار کی ترجمان قرار دیتے ہیں، اور بطورِ خاص مولانا سندھی صاحب کے حوالہ سے کئی متنازع وشاذ افکار کو اپنی فکر کی بنیاد بناتے، اور ان کو اہل السنۃ والجماعۃ کی فکر بتاتے ہیں، جب کہ مولانا سندھی صاحب کی نسبت سے پیش کیے گئے متنازع اور شاذ افکار کی اصولی یا کسی قدر تفصیلی انداز میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد متعدد ومستند اکابر، اہلِ علم اور اہلِ فکر حضرات نے تردید وتنقید کی ہے، ان متعدد ومستند اکابر، اہلِ علم اور اہلِ فکر حضرات نے بطورِ خاص مولانا سندھی صاحب کے ان افکار وخیالات کو ناقابلِ قبول قرار دیا ہے، جن کا اظہار انھوں نے روس، ترکی اور حجاز میں قیام کے زمانے میں اور پھر ہندوستان پہنچنے کے بعد مختلف تحریرات وتقریرات کے ذریعہ سے کیا، اور وہ افکار وخیالات قرآن وسنت یا اہلِ سنت والجماعت کے مسلّمہ اصول وفکر کے خلاف تھے، ان اکابر

واہلِ علم اور اہلِ فکر حضرات کی رائے میں مولانا سندھی صاحب کے بیرون ملک قیام کے دوران اُن کے افکار وخیالات میں غیر معمولی تغیّر پیدا ہوگیا تھا۔

لیکن مولانا عبیداللہ سندھی صاحب سے وابستہ یا ان کے عقیدت مند یا پھر کسی بھی غرض سے اپنا مدعا ثابت کرنے والے بہت سے افراد ان افکار وخیالات کو غلط تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو امامِ انقلاب قرار دے کر اس طرح کے افکار کی تبلیغ وتشہیر کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

اور اسی کے ساتھ وہ ان افکار وخیالات کی نسبت برصغیر کی عظیم علمی شخصیت ''حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمہ اللہ'' کی طرف بھی کرتے ہیں، بلکہ اپنی تنظیم کا نام بھی ان ہی کی نسبت سے ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' تجویز کیا ہوا ہے۔

جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمہ اللہ کے علمی سلسلے سے ہندوستان وپاکستان اور برصغیر کے متعدد مسالک کی نسبت اور وابستگی ہے، جس کے نتیجے میں بالواسطہ کئی غلط وشاذ افکار کی نسبت ان مسالک کی طرف بھی لازم آتی ہے، اس طرح کی بے اعتدالیوں اور بطور خاص مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حوالے سے منسوب اور تنظیمِ مذکور کے شاذ افکار وخیالات کی تنقید وتردید سے متعلق متعدد اکابر اور اہلِ علم واہلِ قلم حضرات کی منتشر و نایاب تحریرات وآرا کو اس کتاب میں مرتب وجمع کیا گیا ہے۔

آج کل چونکہ اَنانیت وخودرائی کا دور دورہ ہے، اس لیے اس سلسلہ میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے پیش کریں، مناسب معلوم ہوا کہ اکابر اہلِ علم، اہلِ قلم اور حقیقت شناس حضرات کے افادات سے مستفید ہوا جائے۔ پھر اس کے باوجود بھی کوئی حقیقت کو تسلیم نہ کرے، اور تاویل درتاویل کرکے بات کو اِدھر سے اُدھر لے جانے کے درپے ہو، تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟

کتابِ مذکور کی اشاعت کے بعد اہلِ علم واہلِ فکر کے ایک بڑے طبقے نے اس مجموعے کو پسند

کیا، اور اس کی تحسین فرمائی ہے، جبکہ بعض افراد کو اس سے ناگواری بھی ہوئی، جو ایک فطری امر ہے۔

لیکن کتابِ مذکور کے اس اہم مقصد اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے سرکردہ افراد اور دیگر حضرات کی طرف سے تبلیغ وتشہیر کیے جانے والے غلط افکار کی تردید کو ملحوظ رکھنے کے بجائے، مولانا سندھی صاحب کی ذات کے دفاع اور اس سلسلے میں متعدد اکابر، مشائخ واہلِ علم حضرات کی تردید وتنقید اور غیر متعلقہ باتوں پر زورِ قلم خرچ کردیا گیا۔

ظاہر ہے جب کتابِ مذکور میں مذکور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے سرکردہ افراد اور دیگر حضرات کی طرف سے تبلیغ وتشہیر کیے جانے والے غلط افکار کی تردید کے بجائے اپنی تنقیدات کا محور دوسرے مخصوص امور کو بنالیا گیا، اور ان سب امور پر مشتمل کتاب کا انتساب مخصوص حضرات کی طرف کردیا گیا، تو اس انتساب شدہ کتاب کے جواب میں بھی اس کتاب میں مذکور مختلف اہم امور کے اعتبار سے کلام کرنے کی ضرورت ہوگی، اگرچہ پہلے ان امور پر کلام کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور اسی وجہ سے اس مضمون میں نہ چاہتے ہوئے بھی طوالت کا امکان ہے۔

## مولانا سندھی صاحب کے متعلق مختلف نظریات اور اعتدال

مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے متعلق ان کے متنازع افکار سامنے آنے کے بعد سے اہلِ علم کے مختلف موقف اور ردِ عمل بھی سامنے آئے، جو ابھی تک پائے جاتے ہیں، جن کو الگ الگ فریقوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں ایک فریق جو جمہور اہلِ علم وفضل اور برصغیر کے قریب قریب تمام قابلِ ذکر مسلمان مشاہیر پر مشتمل ہے، کے موقف کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب سے اہلُ السنۃ والجماعۃ یا حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر اکابر ومشائخِ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے خلاف متعدد متضاد وشاذ افکار وخیالات کے صادر ہونے کا ثبوت ان کی مختلف تقاریر، تحریرات اور کلام کے

ذریعے سے ہوا، جن کی لوگوں میں تشہیر وتبلیغ بھی ہوگئی، احقاقِ حق کے لیے ان باتوں کا رَد اور سندھی صاحب کے ان خیالات سے برائت کی گئی، اس سلسلے میں نمایاں مقام دارالعلوم دیوبند اور مسلکِ دیوبند کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے مولانا حسین احمد مدنی کا ہے، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے آخری دور میں، اور پھر ان کی وفات کے بعد پریس میں مختلف قسم کے مضامین شائع ہونے کے وقت باوجودیکہ آپ مولانا سندھی صاحب کے عظیم مداح اور دیرینہ رفیق ومحبّ تھے، مگر آپ نے بلاخوفِ لومۃ لائم (جو اہلِ حق کی شان ہوتی ہے) اپنے ایک بیان ومضمون میں احسن طریقے پر مولانا سندھی صاحب کی اعلیٰ صفات واوصاف اور خدمات وکمالات کا اعتراف واظہار فرمایا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں متضاد افکار وخیالات اور غیر معتدل حرکات وسکنات کے صادر ہونے اور ان کے اسباب وعوامل مثلاً مولانا سندھی صاحب کے حوادث ومصائب کے باعث دماغ پر کاری اثر پڑنے، دماغی توازن کھو بیٹھنے کے ساتھ ساتھ مولانا سندھی صاحب کے افکار کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی بھی بیان فرمائی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت مدنی کے اس بیان کا اصل مقصود مولانا سندھی صاحب کے دماغی و قلبی عارضے اور بیماری کو بیان کرنا نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک نجی و ذاتی معاملہ ہے، بلکہ اصل مقصود مولانا سندھی صاحب کے متنازع ومتضاد اور صحیح یا غلط افکار وخیالات کو پرکھنے پر متنبہ کرنا تھا، جس کا تعلق دین اور دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے تھا، اس کے ضمن میں مولانا سندھی صاحب کے دماغی وقلبی عارضے کا ذکر کردیا گیا، جو مولانا سندھی صاحب کا ذاتی وشخصی معاملہ ہے، تاکہ ایک مقتدا شخصیت سے اس قسم کے امور صادِر ہونے کا سبب معلوم ہو، اور ان کے متعلق ایک درجے میں حسنِ ظن قائم رہے، اور ان کی دیرینہ اور سابقہ خدمات کا بھی انکار لازم نہ آئے۔

ہمارے نزدیک مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ساتھ کامل انصاف یہی ہے، جس میں ایک

عظیم شخصیت سے ممکن حد تک حسنِ ظن کی رعایت بھی پائی جاتی ہے، اسی موقف کو حضرت مدنی اور ان کے بعد متعدد اہلِ علم و اہلِ فضل اور اہلِ فکر حضرات نے اختیار کیا ہے، جن کی طرف سے حضرت مدنی کی بیان کردہ کسوٹی پر مولانا سندھی صاحب کے افکار و خیالات کو جانچنے کا عمل جاری رہا، اور اس کے نتیجے میں مولانا سندھی صاحب کے بیان کردہ متعدد افکار وخیالات کا شاذ اور متنازع ومتضاد اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہونا معلوم ہوا۔

اسی کو کامل اور مکمل ''انصاف'' کہا جاتا ہے، جو عربی میں ''عـدل'' کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اور عربی میں ''قِسـط'' کا لفظ بھی ''عدل'' کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، جس کے مطابق فیصلہ کرنے کا قرآن مجید میں حکم آیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

''عـدل'' دراصل ''ظـلـم'' کی ضد ہے، عدل وانصاف میں ہر چیز کو اس کا مکمل حق دیا جاتا ہے، جو اس کی شایانِ شان ہوتا ہے، چاہے وہ ''منافع'' کی شکل میں ہو یا ''مضار'' کی شکل میں ہو، اور اس کے مقابلے میں ''ظلم'' میں حق تلفی کی جاتی ہے، چاہے وہ ان میں سے کسی بھی شکل میں ہو۔

''ظلم'' کے یہ معنیٰ تو اہلِ علم میں بہت مشہور ہیں، یعنی:

''وضع الشیئ فی غیر محلہٖ''

لہٰذا مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی خدمات واوصاف کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اُن کی طرف سے متنازع ومتضاد افکار اور خیالات کے صادِر ہونے کو تسلیم کرنا اور بوقتِ ضرورت ان کی تردید کرنا ہی شریعت کی رُو سے ان کے ساتھ اصل ''انصاف وعدل'' ہے، اور ان کی بعض چیزوں کو تسلیم کرنا اور بعض کا انکار کرنا، یہ ''انصاف وعدل'' کے منافی اور خلاف ہے۔ [1]

---

[1] الإنصاف :فی المعاملة العدل بأن لا يأخذ من صاحبه من المنافع إلا مثل ما يعطيه ولا ينيله من المضار إلا كما ينيله، وقيل هو استيفاء الحقوق لأربابها واستخراجها بالأيدى العادلة والسياسات

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

البتہ ان میں سے متعدد حضرات نے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں متنازع وشاذ افکار وخیالات کے صادر ہونے پر مطلع ہونے کے باوجود مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع وشاذ افکار وخیالات کے ذکر کی، سوائے ضروری مواقع کے جابجا ضرورت نہیں سمجھی، اور عام حالات میں مولانا سندھی صاحب کی قائدانہ ومجاہدانہ اعلیٰ صفات وخدمات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اور بعد میں ان کے قلبی ودماغی عارضے کی بنا پر یا ان متنازع وشاذ افکار کی عدمِ تشہیر کی بنا پر مولانا سندھی صاحب کے ان متنازع وشاذ افکار وخیالات سے جابجا تعرض نہیں کیا۔

کیونکہ کسی ایسی مقتدا شخصیت کے متعلق اس قسم کی باتوں کا بلاضرورت چرچا کرنا مناسب نہیں

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الفاضلة، وهو والعدل توء مان نتيجتهما علو الهمة وبراء ة الذمة باكتساب الفضائل واجتناب الرذائل(التوقيف على مهمات التعاريف،لعبد الرؤوف المناوى،ص٦٥، باب الالف، فصل النون)

العدل :بفتح فسكون مص عدل، الانصاف، ضد الظلم(معجم لغة الفقهاء ،ص٣٠٧، حرف العين)

الفرق بين الظلم والجوز:

أن الجور خلاف الاستقامة فى الحكم وفى السيرة السلطانية تقول جار الحاكم فى حكمه والسلطان فى سيرته إذا فارق الاستقامة فى ذلك والظلم ضرر لا يستحق ولا يعقب عوضا سواء كان من سلطان أو حاكم أو غيرهما ألا ترى أن خيانة الدانق والدرهم تسمى ظلما ولا تسمى جورا فان اخذ ذلك على وجه القهر أو الميل سمى جورا وهذا واضح وأصل الظلم نقصان الحق والجور العدول عن الحق من قولنا جار عن الطريق إذا عدل عنه وخولف بين النقيضين فقيل فى نقيض الظلم الانصاف وهو إعطاء الحق على التمام وفى نقيض الجور العدل وهو العدول بالفعل إلى الحق(الفروق اللغوية،للحسن بن عبد الله العسكرى، ج ا ،ص ٢٣١،الباب الثامن عشر:فى الفرق بين الدين والملة والطاعة والعبادة والفرض والوجوب والحلال والمباح وما يجرى مع ذلك)

(قسط) جار قسطا وقسوطا (ومنه) (وأما القاسطون فكانوا لجهنم حطبا)وقد غلب هذا الاسم على فرقة معاوية -رضى الله عنه -(ومنه) الحديث تقاتل الناكثين والقاسطين والمارقين (وأقسط) إقساطا عدل (ومنه) (وإن خفتم ألا تقسطوا)والاسم القسط وهو العدل والسوية (وبتصغيره) سمى جد يزيد بن عبد الله بن قسيط الليثى فى الدعوى (وفى التنزيل) (كونوا قوامين بالقسط(المغرب،للخوارزمى،ص٣٨٢، باب القاف،القاف مع السين المهملة ،مادة "ق س ط" )

(القسوط) الجور والعدول عن الحق وبابه جلس ومنه قوله تعالى :(وأما القاسطون فكانوا لجهنم حطبا) . و (القسط) بالكسر العدل تقول منه :(أقسط) الرجل فهو (مقسط) ومنه قوله تعالى :(إن الله يحب المقسطين(مختار الصحاح لزين الدين الرازى،ص٢٥٣، باب القاف،ماده،ق س ط)

www.idaraghufran.org

ہوا کرتا، جیسا کہ ان متعدد مشاہیر محدثین کا معاملہ ہے کہ جنہوں نے اپنے سنہرے دورِ حیات میں روایتِ حدیث کی اعلیٰ خدمات انجام دیں، اور ان کو اپنے اس دور میں ثقہ ومقتدا تسلیم کیا گیا، ان کی اعلیٰ صفات کا ذکر کیا گیا، لیکن آخری دور میں اگر ان کو اختلاط کا دماغی عارضہ لاحق ہوگیا، تو اس کا ضرورت کے موقع پر ذکر کیا گیا، اور اس دور کی مرویات اور شاگردوں کا بھی ذکر کیا گیا، اور اختلاط یا عقل میں خلل کی وجہ سے اس دور کی مرویات کو صرف سنہرے دور میں ثقہ اور اعلیٰ صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے علی الاطلاق قبول نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر، ردوقبول کرنے کا سلسلہ اختیار کیا گیا، اور اختلاط کے ثبوت کے بعد سابق دور کی ثقاہت وقیادت کو بنیاد بنا کر اس کا الزام ان کے تلامذہ اور روایت کنندہ حضرات پر عائد نہیں کیا گیا۔

اور اگر ان مذکورہ حضرات کی نظر میں مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار کی غیر معمولی تبلیغ وتشہیر ثابت ہوجاتی، جیسا کہ موجودہ دور میں کچھ طبقات کی طرف سے ان کی منظّم انداز میں تبلیغ وتشہیر جاری ہے، تو پھر یہ حضرات ان افکار کی تردید اور ان پر نکیر کی تبلیغ میں اس نوعیت کا بھی سکوت اختیار نہ کرتے، بلکہ اپنی تبلیغی ذمہ داری سمجھتے ہوئے، غلط افکار کی تردید کرتے، پس ہماری نظر میں مذکورہ حالات میں ان حضرات کے اس جابجا عدمِ تعرض یا سکوت اختیار کرنے کو مولانا سندھی صاحب سے متنازع وشاذ افکار وخیالات کے صادِر ہونے کی نفی یا مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار وخیالات سے متفق ہونے یا بے جا تعصّب و تحزّب میں مبتلا ہوکر مداہنت اختیار کرنے پر محمول کرنا درست نہیں ہوگا، جس کے اسلامی روایات میں بے شمار نظائر موجود ہیں۔ [1]

---

[1] عارم محمد بن الفضل السدوسی البصری: الحافظ، الثبت، الإمام، أبو النعمان السدوسی، البصری ..... اختلط عارم فی آخر عمره، وزال عقله، فمن سمع منه قبل الاختلاط، فسماعه صحیح (سیر اعلام النبلاء، ج ۱۰، ص ۲۶۷، تحت الترجمة: عارم محمد بن الفضل السدوسی البصری)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

ان جمہور اہلِ علم وفضل میں سے بہت سے حضرات ایسے بھی تھے کہ جن کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کے وہ متضاد اور متنازع وشاذ افکار وخیالات ایسے طریقے وذریعے سے تو ثابت ہوئے کہ ان کے نزدیک ان کے انکار کی گنجائش نہ تھی، لیکن یہ لوگ ان افکار

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

عطاء بن السائب الثقفی مولاهم الكوفی: الإمام، الحافظ، محدث الكوفة، أبو السائب.....وكان من كبار العلماء، لكنه ساء حفظه قليلا فی أواخر عمره .....قال أحمد بن حنبل: عطاء ثقة ثقة، رجل صالح.

وقال: من سمع منه قديما كان صحيحا، ومن سمع منه حديثا لم يكن بشیء.

سمع منه قديما: شعبة، وسفيان.

وسمع منه حديثا: جرير، وخالد بن عبد الله، وإسماعيل، وعلی بن عاصم.

وكان يرفع عن سعيد بن جبير أشياء لم يكن يرفعها.

قال: وقال وهيب: لما قدم عطاء البصرة، قال: كتبت عن عبيدة ثلاثين حديثا، ولم يسمع من عبيدة شيئا، وهذا اختلاط شديد.

أبو داود: عن أحمد قال: كان عطاء بن السائب من خيار عباد الله، كان يختم القرآن كل ليلة.

وقال شعبة: حدثنا عطاء – وكان نسيا .

وقال يحيى: لم يسمع عطاء بن السائب من يعلی بن مرة.

قال: واختلط عطاء، فما سمع منه قديما فهو صحيح، وقد سمع منه أبو عوانة فی الصحة وفی الاختلاط جميعا، ولا يحتج بحديثه.

ابن عدی: أنبأنا ابن أبی عصمة، حدثنا أحمد بن أبی يحيى، سمعت يحيى بن معين يقول: ليث بن أبی سليم ضعيف، مثل عطاء بن السائب.

وجميع من روى عن عطاء ففی الاختلاط، إلا شعبة وسفيان.

قال ابن عدی: عطاء اختلط فی آخر عمره، فمن سمع منه قديما مثل الثوری، وشعبة، فحديثه مستقيم، ومن سمع منه بعد الاختلاط، فأحاديثه فيها بعض النكرة.

وقال العجلی: كان شيخا، قديما، ثقة، روى عن ابن أبی أوفی، ومن سمع منه قديما فهو صحيح، منهم الثوری، فأما من سمع منه بأخرة فهو مضطرب الحديث، منهم هشيم، وخالد بن عبد الله، وكان عطاء بأخرة يتلقن إذا لقن، لأنه كان غير صالح الكتاب، وأبوه: تابعی، ثقة.

وقال أبو حاتم: كان محله الصدق قديما قبل أن يختلط، ثم تغير حفظه، فی حديثه تخاليط كثيرة، وما روى عنه ابن فضيل ففيه غلط واضطراب، رفع أشياء كان يرويها عن التابعين، فرفعها إلى الصحابة.

وقال النسائی: ثقة فی حديثه القديم، إلا أنه تغير، ورواية: حماد بن زيد، وشعبة، وسفيان عنه جيدة.

الحميدی: عن سفيان، قال: كنت سمعت من عطاء بن السائب قديما، ثم قدم علينا قدمة، فسمعته

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

وخیالات کے ایسے اسباب وعوامل پر مطلع نہ ہوئے، جو قلبی ودماغی عوارض یا معذور ومؤول قرار دیئے جانے کا سبب بنتے ہیں، یا ان کے نزدیک یہ عوارض اس درجہ کے معتبر ذریعے سے نہیں پہنچے، جس درجے کے معتبر ذریعے سے متنازع وشاذ افکار وخیالات پہنچے، کیونکہ مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار وخیالات تو ان کی تقاریر وتحریرات اور کلام کے ذریعہ متعدد حاضرین وغائبین کو پہلے اور بعد کے زمانہ میں پہنچے، لیکن اس کے اسباب وعوامل ان میں سے ہر ایک تک نہ پہنچے، اس لیے مولانا سندھی صاحب کے اس طرح کے شخصی وذاتی نوعیت کے عوارض واسباب پر حضرت مدنی جیسے خواص ہی مطلع ہو پائے، اس کو چاہیں تو دوسرا فریق کہیں، چاہیں تو پہلے فریق میں ہی شمار کریں، اصل موقف دونوں کا ایک ہی ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے یہ متنازع افکار از خود غلط ہیں، ان کی تردید وتغلیط کی جائے گی، تاکہ لوگوں کی امورِ دین میں اشتباہ والتباس سے حفاظت ہو۔

پس اس فریق نے مولانا سندھی صاحب کی اعلیٰ مجاہدانہ وقائدانہ صفات وخدمات کے

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ یحدث ببعض ما کنت سمعته، فخلط فیه، فاتقیته واعتزلته .(سیر اعلام النبلاء، ج٦، ص ١١٠ الی ١١٣، تحت الترجمة: عطاء بن السائب الثقفی مولاهم الکوفی)

قال بن حبان فی تاریخ الضعفاء کان المسعودی صدوقا إلا أنه اختلط فی آخر عمره اختلاطا شدیدا حتی ذهب عقله وکان یحدث بما یحب فحمل عنه ولم یتمیز فاستحق الترک والصحیح ما تقدم من التفصیل قبل الاختلاط فیقبل وبعده فلا انتهی وقال یحیی بن معین کان یغلط ویخطیء فیما یروی عن شیوخه الصغار کعاصم وسلمة والأعمش بخلاف ما یروی عن الکبار وعن یحیی أیضا أحادیثه عن الأعمش مقلوبة وأحادیثه عن القاسم وعن عون صحیحة. (الکواکب النیرات فی معرفة من الرواة الثقات، لابی البرکات زین الدین ابن الکیال، ص ٢٩٥ و ٢٩٦، باب العین)

محمد بن الفضل السدوسی، أبو النعمان، الملقب بعارم:أحد شیوخ البخاری الکبار.

قال أبو حاتم: اختلط فی آخر عمره، وزال عقله، فمن سمع منه قبل العشرین ومائتین فسماعه جید.

وقال أبو داود: استحکم به الاختلاط سنة ست وعشرین ومائتین.

وقال ابن حبان: اختلط فی آخر عمره، وتغیر حتی کان لا یدری ما الحدیث فوقع فی حدیثه المناکیر، وإذا لم یعلم هذا من هذا ترک الکل، ولم یحتج بشیء منه.

قلت: هذا غلو، وإسراف من ابن حبان، فقد روی عنه البخاری الکثیر فی الصحیح، وأحمد بن حنبل، وعبد بن حمید، والناس، واحتج به مسلم .وقال فیه الدارقطنی: تغیر بأخرة، وما ظهر له بعد اختلاطه حدیث منکر، وهو ثقة .فهذا معارض لقول ابن حبان، والله أعلم .(المختلطین، لابی سعید العلائی، ص ١١٦ و ١١٧، حرف المیم)

www.idaraghufran.org

اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے متنازع افکار وخیالات کی تردید کا اہتمام کیا، اور اس سلسلے میں مولانا سندھی صاحب کے معذور ومؤول ہونے کے پہلو سے تعرض نہیں کیا۔

ظاہر ہے مولانا سندھی صاحب کی تحریرات وتقاریر میں متنازع وشاذ افکار وخیالات ملاحظہ کرنے اور خاص ذہنی عارضے اور اس طرح کی تاویل وعذر سے بے خبر رہنے والا اپنے آپ کو اسی موقف کا مکلّف سمجھے گا، بلکہ جب اس طرح کے غلط افکار کی منظّم طریقہ پر تحریرات اور تقاریر کے ذریعہ تبلیغ وتشہیر ہوگی، تو ان کی حسبِ استطاعت وقدرت، تردید اور ان پر نکیر وتغییر کو ایک عالم ومقتدا اپنی دینی ذمہ داری تصور کرے گا، کیونکہ اس کا تعلق کسی شخص کی ذات سے نہیں، بلکہ دین سے ہے، جس کی وجہ سے عامۃُ المسلمین اور حقیقت سے بے خبر لوگوں کے دینی افکار میں بگاڑ وفساد لازم آتا ہے، اور آرہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد کے مصداق:

مَنْ رَّأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ (مسلم، ج ۱ ص ۶۹، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الإیمان الخ)

ترجمہ: تم میں سے جو شخص منکَر (یعنی گناہ وبُرائی) کو دیکھے، تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اُسے بدل دے، اور اگر اس کی طاقت وقدرت نہ ہو تو اپنی زبان سے بدل دے، اور اگر اس کی بھی طاقت وقدرت نہ ہو، تو اپنے دل سے بدل دے، اور یہ ایمان کا کم زور ترین درجہ ہے (مسلم)

مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے متعلق ایک تیسرا فریق وہ ہے کہ جو ان کی سنہری زندگی کی قائدانہ ومجاہدانہ اعلیٰ صفات وخدمات پر تو مطلع ہوا، لیکن مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع وشاذ افکار وخیالات اور ان کے معتبر ذریعے سے ثابت ہونے پر مطلع ہی نہ ہوا، اس لیے وہ مولانا سندھی صاحب کی اعلیٰ خدمات وصفات کا ہی معترف رہا، اور مولانا سندھی

صاحب سے متنازع افکار وخیالات کے صادِر ہونے پر یا تو ساکت رہا، یا ان کا انکار کیا، جیسا کہ متعدد محدثین کے متعلق بھی اس قسم کی آرا کے حامل متعدد حضرات پائے جاتے ہیں، جو آخری دور کی متنازع ومتضاد مرویات سے آگاہ نہ ہوئے۔

اس فریق میں ایسے افراد بھی شامل ہیں، جو مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں متنازع و شاذ افکار کے صادِر ہونے سے قبل یا اس قسم کے افکار پر مشتمل مواد کی اشاعت یا اس کے اپنے تک پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس فریق کو اگر معتبر ذریعے سے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع وشاذ افکار وخیالات اور اس سے بڑھ کر ان کی تبلیغ وتشہیر کا علم ہو جاتا، تو وہ بھی اپنے حسبِ علم واستطاعت پہلے یا دوسرے فریق کے مطابق موقف وطرزِ عمل اختیار کرتا۔

ہمارے نزدیک مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے متعلق پہلے فریق کا قول زیادتِ علم اور زیادہ عدل وانصاف کے اصولوں بلکہ مزید برآں حسنِ ظن پر بھی مبنی اور حقائق کے مطابق ہونے کی بنا پر زیادہ معتدل و راجح کہلائے جانے کا مستحق ہے، جس میں حضرت مدنی کی شخصیت سرفہرست ہے۔

تاہم دوسرے فریق کا قول بھی اصول وقواعد کی رُو سے کم زور نہیں، کیونکہ علماء اور دین کے مقتدا حضرات کے ذمہ اصل کام یہی ہے کہ وہ شرعی اعتبار سے حق وباطل اور صحیح وغلط کی تمیز کر دیں، کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے، جس سے سب کا تعلق ہے، اور طبی یا میڈیکل کی رُو سے کسی کے دماغی عوارض کی تشخیص یہ علماء کی اصل ذمہ داری نہیں، اور یہ اس شخص کا ذاتی یا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

البتہ اگر کوئی اس پر مطلع ہو جائے، تو الگ بات ہے، جس میں ایک زائد چیز کا علم ہے، اور اس میں حسنِ ظن کی رعایت بھی ملحوظ ہے، اور پہلا فریق اس کا علم اور رعایت رکھتا ہے۔

چنانچہ محدثین نے اپنے دور کے ثقہ راویوں کے متعلق آخری دور کے اختلاط کے عارضے کا حکم

لگا کر دراصل حسنِ ظن کا لحاظ کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان حضرات کے متعلق باہوش وحواس قصداً کذب وغلط بیانی کے ارتکاب سے ان کو متہم کرنے کا سدّ باب کیا۔

تاہم تیسرے فریق کے قول کو پہلے یا دوسرے فریق کا فی الواقع مخالف سمجھنا اور اسی موقف کو حتمی قرار دینا درست نہیں، کیونکہ جس فریق کو ایک امر کا علم ہو، اور دوسرے امر کا علم نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ دوسرے امر سے ساکت ہو، اس کے سکوت کو دوسرے کے بولنے کا مخالف قرار نہیں دیا جاتا، جیسا کہ اسماء الرجال پر نقد وجرح کرنے والے حضرات میں بھی ایسی آرا پائی جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا حضرات کے برعکس مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے متعلق ایک چوتھا فریق وہ بھی ہے کہ جو مولانا سندھی صاحب کے متخالف ومتضاد اور متنازع وشاذ افکار وخیالات پر مطلع ہونے اور ان کی تبلیغ وتشہیر ہونے کے باوجود اُن کو مشائخِ دیوبند میں غیر معمولی اونچا مقام دینے یا ان سے غیر معمولی عقیدت رکھنے یا ان کو غیر معمولی مقتدا سمجھنے کی بنیاد پر، اس سلسلے میں بے جا تعصّب وتحزّب کا شکار رہا، اور اس سلسلے میں بے جا تاویل کرتا رہا، مثلاً مولانا سندھی صاحب کو غلط افکار اور دماغی اختلال وغیرہ سے پاکیزہ ثابت کرنے اور مولانا سندھی صاحب کی ایک شخصیت کو ان امور سے بچانے کے لیے ان افکار کا اصل ذمہ دار دوسری کئی شخصیات کو قرار دیتا رہا، یا پھر ان افکارِ شاذہ کو صحیح سمجھ کر ان کی پیروی واتباع اور ان کی تبلیغ وتشہیر کرتا رہا، اور ساتھ ہی مولانا سندھی صاحب کی تحریرات وتقاریر میں پائے جانے والے غلط افکار کی نشان دہی اور ان کی تردید کرنے والوں کی مخالفت بھی کرتا رہا، اور ان کو بزرگوں اور مشائخ کا گستاخ اور بے ادب اور ظالم وغیر منصف وغیرہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔

ظاہر ہے کہ اس فریق کا مذکورہ دونوں صورتوں میں موقف قرآن وسنت کی رُو سے عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوگا، اور دین کے تحفظ پر کسی کے ذاتی وشخصی تحفظ کو ترجیح دینے کے مترادف ہوگا۔

www.idaraghufran.org

اس فریق کو اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشادات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر گہری نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

**يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوْا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا وَإِنْ تَلْوُوْا أَوْ تُعْرِضُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا** (سورة النساء، رقم الآية ١٣٥)

ترجمہ: اے ایمان والو! ہوجاؤ تم قائم کرنے والے انصاف کو، گواہ بنو اللہ کے لیے، اگرچہ تمہارے خلاف ہو، یا والدین کے، اور اقربا کے، اگر ہے، وہ غنی یا فقیر، تو اللہ ان دونوں کے مقابلہ میں اولیٰ (ومقدم) ہے، پس خواہش کی اتباع نہ کرو تم، عدل وانصاف کرنے میں، اور اگر تم زبان لپیٹو گے (یعنی غلط بیانی کرکے ناانصافی کرو گے) یا (عدل وانصاف سے) اعراض کرو گے، تو اللہ تمھارے اعمال سے خوب خبردار ہے (جس کا تم کو حساب دینا پڑے گا) (سورہ نساء)

مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کے اپنا قریبی وتعلق دار یا ہم مسلک وغیرہ ہونے کی بنیاد پر اس کی بے جا طرف داری اور حمایت جائز نہیں، بلکہ یہ عدل وانصاف کے بجائے، خواہش کی پیروی اور بے جا تعصّب وتحزّب میں داخل ہے، جو عنداللہ قابلِ مؤاخذہ ہے۔

اور سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

**يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ** .(سورة المائدة، رقم الآية ٨)

ترجمہ: اے ایمان والو! ہوجاؤ تم قائم کرنے والے اللہ کے لیے انصاف کے

ساتھ گواہی کو، اور ہرگز آمادہ نہ کرے تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو، تم عدل کرو، یہی زیادہ قریب ہے تقویٰ کے، اور ڈرو اللہ سے، بے شک اللہ خوب خبردار ہے، تمھارے اعمال سے (سورہ مائدہ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر عدل وانصاف کا تقاضا دوسری قوم یا اس کے موقف کو برحق تسلیم کرنے کا ہو، تو اس کو تسلیم کرنا چاہیے، اور اس سلسلہ میں تعصّب وتحزّب اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

اور سورہ مائدہ میں ہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ .

(سورة المائدة، رقم الآية ۴۲)

ترجمہ: اور اگر فیصلہ کریں آپ، تو فیصلہ کریں، ان کے درمیان عدل (وانصاف) کے ساتھ، بے شک اللہ محبت رکھتا ہے، عدل (وانصاف) کرنے والوں سے۔

(سورہ مائدہ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے بہرحال عدل وانصاف والا فیصلہ کرنے کا حکم ہے، اور یہی طرزِ عمل اللہ کو پسند ہے۔

اور سورہ انعام میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى. (سورة الانعام، رقم الآية ۱۵۲)

ترجمہ: اور جب کہو تم، تو انصاف کرو، اگرچہ ہو وہ رشتہ دار۔ (سورہ انعام)

مفسرینِ عظام نے ''بالقسط'' کی تفسیر ''بالعدل'' کے ساتھ کی ہے۔ [1]

---

[1] (يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين) قائمين (بالقسط) بالعدل (شهداء) بالحق (تفسير الجلالين، سورة النساء، تحت رقم الآية ۱۳۵)

يأمر تعالىٰ عباده المؤمنين أن يكونوا قوامين بالقسط أى بالعدل، فلا يعدلوا عنه يمينا ولا شمالا، ولا تأخذهم فى الله لومة لائم ولا يصرفهم عنه صارف. (تفسير ابنِ كثير، ج۲ ص۳۸۳، سورة النسآء)

www.idaraghufran.org

معلوم ہوا اللہ کی طرف سے عدل وانصاف کو قائم کرنے کا حکم ہر شخص کے لیے ہے، خواہ وہ اپنی جماعت ومسلک سے تعلق رکھتا ہو، یا غیر سے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ : لَا، وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ .(مسند أحمد، رقم الحديث ١٦٩٨٩) [1]

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آدمی کا اپنی قوم (یعنی اپنی برادری یا خاندان وقبیلے وغیرہ) سے محبت رکھنا بھی تعصّب میں داخل ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! بلکہ تعصّب تو یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کے ظلم (یعنی ناحق چیز) پر مدد کرے۔ (مسند احمد)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ

(سنن ابی داؤد، رقم الحديث ٥١٣٠، كتاب الادب، ابواب النوم، باب فی الهوى)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا کسی چیز سے محبت کرنا اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے (ابوداؤد)

اس حدیث کی سند کو بعض حضرات نے ضعیف قرار دیا ہے، البتہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2]

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے، خواہ وہ کوئی انسان ہو، یا غیر انسان،

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: حديث حسن (حاشية مسند احمد)

[2] قال شعيب الارنؤوط: صحيح موقوفاً، وهذا إسناد ضعيف لضعف أبي بكر بن عبد الله بن أبي مريم، وبقية –وهو ابن الوليد– وإن كان ضعيفاً قد توبع (حاشية سنن ابی داؤد، تحت رقم الحديث ٥١٣٠)

www.idaraghufran.org

تو عادتاً وہ اس چیز کے عیوب سے اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، اور حق و باطل کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

تعصب میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی چیز سے محبت بھی تعصب کا باعث بن جاتی ہے۔ [1]

ظلم کی حقیقت پہلے گزر چکی ہے، جو لوگ مولانا سندھی صاحب سے غلط اور شاذ افکار صادر ہونے کے باوجود ان کی یا ان کے غلط اور شاذ افکار کی بے جا حمایت اور اس سے بڑھ کر ان کا

---

[1] (وعن أبی الدرداء -رضی الله تعالی عنه -عن النبی -صلی الله علیه وسلم -قال :حبک) : من إضافة المصدر إلی فاعله ومفعوله (الشیء) : وهو مبتدأ خبره ( یعمی ویصم ) : بضم أولهما وکسر عینهما أی :یجعلک أعمی عن رؤیة معایب الشیء المحبوب بحیث لا تبصر فیه عیبا، ویجعلک أصم عن سماع قبائحه بحیث لا تسمع فیه کلاما قبیحا لاستیلاء سلطان المحبة علی فؤادک، کما قال:

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة ...ولکن عین السخط تبدی المساویا

وحاصله، أنک تری القبیح منه حسنا، وتسمع منه الخنا قولا جمیلا کما قیل:

ویقبح من سواک الفعل عندی ...فتفعله فیحسن منک ذاکا

وقال الأستاذ أبو علی :حبک الشیء یعمی عن الغیر غیرة وعن المحبوب هیبة .قال الطیبی : ومورد الحدیث فی الذم، وذکر العصبیة یستدعی أن یقال :إنه -صلی الله علیه وسلم -قال فیمن یتعصب لغیره ویحامیه بالباطل، وحبه إیاه یعمیه عن أن یبصر الحق فی قضیته، ویصمه عن أن یسمع الحق فی قصته، وإلا فالحدیث ذو وجهین(مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح، ج۷،ص ۷۷۳۰،کتاب الآداب،باب المفاخرة والعصبیة)

حبک الشیء یعمی ویصم."(حم تخ د) عن أبی الدرداء، والخرائطی فی اعتلال القلوب عن أبی برزة، وابن عساکر عن عبد الله بن أنیس.

(حبک الشیء) عام فی کل حیوان وجماد وعرض وجوهر .(یعمی) أی عن معائب ما یحبه أو عن کل شیء سواه إذا تمکن فی القلب(ویصم) عن سماع کل ما لیس فی معناه أی یصیره کالأعمی والأصم لا ینتفع بحاسیه والحدیث تحذیر عن الإیغال فی المحبة لأی محبوب سوی ما یحبه الله ورسوله فإن تخصیصه معلوم من قاعدة الشرع .(حم تخ د) عن أبی الدرداء) قال الحافظ العراقی: إسناده ضعیف وقال الزرکشی: روی من طرق فی کل منها مقال وقال المصنف فی الدرر: الوقف به أشبه، (والخرائطی فی اعتلال القلوب عن أبی برزة)، (وابن عساکر عن عبد الله بن أنیس) قد أشار المصنف بتعدد طرقه ومخرجیه إلی دفع زعم الصغانی وضعه وقوله فیه ابن أبی مریم کذوب أبطله الحافظ العراقی بأنه لم یتهمه أحد بکذب(التنویر شرح الجامع الصغیر، ج۵ص ۳۲۴، ۳۲۵، تحت رقم الحدیث ۳۶۵۸،باب الحاء الموحدة)

www.idaraghufran.org

دفاع کرتے ہیں، وہ اپنی اس روِش کا مذکورہ آیات وحدیث کی روشنی میں جائزہ لے کر **فیما بینھم و بین اللّٰہ** کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ [1]

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھنا چاہیے مثلاً کسی مسلمان یا صالح شخص نے کسی ایسے کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کا ارتکاب کیا، جو قرآن وسنت یا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اصولوں کے مطابق باعثِ کفر یا فعلِ معصیت ہے، اور لوگوں میں اس کے اس طرزِ عمل کی تشہیر وتبلیغ بھی ہوگئی۔

اب ایک فریق تو اس مسلمان یا صالح شخص کے اس کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کا ارتکاب کرنے پر بھی مطلع ہوا، اور اس پر بھی مطلع ہوا کہ اس مسلمان یا صالح شخص سے یہ کلمہ یا فعل کسی ایسی مخصوص حالت کے غلبے میں صادر ہوا، جس میں انسان شرعاً معذور ہوتا ہے، یا اس نے ایسی تاویل کی، جس کی وجہ سے بظاہر التزامِ کفر نہیں ہوتا، اس لیے اس فریق نے اس کلمے یا فعل کے فی نفسہٖ باعثِ کفر یا فعلِ معصیت ہونے کو تسلیم کیا اور بوقتِ ضرورت اس کی تبلیغ اور اس پر نکیر بھی کی، لیکن ساتھ ہی اس مخصوص مسلمان یا صالح شخص کے حق میں اس عذر یا تاویل کے پائے جانے کی وجہ سے دیانتاً کافر یا عاصی نہ ہونے کی تاویل بھی کی۔

دوسرا فریق اس مسلمان یا صالح شخص سے صرف اس کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کے صادِر ہونے پر ہی مطلع ہوا، لیکن ایسی مخصوص حالت کے غلبے میں صادر ہونے پر مطلع نہ ہوا، جس میں انسان شرعاً معذور ہوتا ہے، یا وہ اس کی مخصوص تاویل پر مطلع نہ ہوا، اس لیے اس فریق نے اس کلمے کے باعثِ کفر ہونے یا اس فعل کے باعثِ معصیت ہونے اور اس کی وجہ سے اس کے صادر ہونے والے شخص پر کافر یا عاصی ہونے کا حکم لگا دیا۔

---

[1] سألت رسول الله – صلى الله عليه وسلم – فقلت: يا رسول الله أمن العصبية أن يحب الرجل قومه؟ ) أى: حبا بليغا ( قال: لا، ولكن من العصبية أن ينصر الرجل قومه على الظلم ) أى: على ظلمهم أو مع ظلمهم أو على وجه الظلم. (مرقاة المفاتيح، ج۷، ص ۳۰۷۸، كتاب الآداب، باب المفاخرة والعصبية)

وذكر العصبية تستدعى أن يقال: إنه صلى الله عليه وسلم قال فيمن يتعصب لغيره ويحاميه بالباطل، وحبه إياه يعميه عن أن يبصر الحق فى قضية ويصمه عن أن يسمع الحق فيتبعه (شرح المشكاة للطيبى، ج۱۰، ص ۳۱۵۳، كتاب الآداب، باب المفاخرة)

www.idaraghufran.org

ایک تیسرا فریق اس مسلمان یا صالح شخص سے اس کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کے صادِر ہونے پر مطلع ہی نہ ہوا، بلکہ وہ اس کے صرف مسلمان یا صالح ہونے پر ہی مطلع ہوا، یا پھر وہ اس مسلمان یا صالح شخص سے اس کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کے صادر ہونے یا اس کی تشہیر ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگیا، اس لیے اس نے اپنے علم کے مطابق اس کے مسلمان یا صالح ہونے کا حکم لگانے پر اکتفا کیا۔

ان میں سے اگرچہ دوسرے فریق کا قول اصول وقواعد کے مطابق ہے، لیکن پہلے فریق کا قول مذکورہ مخصوص صورت میں زیادتی علم اور حسنِ ظن پر مبنی ہونے کی وجہ سے زیادہ راجح ومعتدل کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

تیسرے فریق کا قول ایک مخصوص حالت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ساکت ہے، اور اس کا یہ سکوت ایک امرِ زائد کا علم نہ ہونے پر مبنی ہے، جس کا پہلے اور دوسرے فریق کو علم ہے، اس لیے تیسرے فریق کو پہلے فریق کا اور دوسرے فریق کا، یا دوسرے فریق کو پہلے فریق کا حقیقی مخالف سمجھنا درست نہیں ہوگا۔

ایک فریق وہ ہے کہ جس کے سامنے کسی کا مسلمان یا صالح ہونا اور بعد میں اس سے کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کا صادر ہونا اور اس کی تبلیغ وتشہیر کا ہونا ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت ہوا، لیکن اس نے متاثرہ شخص سے محض کسی مخصوص تعلق وعقیدت کی وجہ سے، اس کو پاکیزہ ومقدس قرار دینے کے لیے تعصّب وتحزّب میں مبتلا ہوکر اس کلمہ یا فعل کے صادر ہونے سے ہی انکار کیا، اور بے جا طرف داری کا ارتکاب کیا، یا پھر فی نفسہٖ اس کلمۂ کفر یا فعلِ معصیت کے باعثِ کفر وباعثِ گناہ ہونے سے ہی انکار کیا، اور اس سے بڑھ کر ان چیزوں کو حق باور کرنے کے لیے منظّم انداز میں تبلیغ وتشہیر بھی شروع کردی۔

ہماری نظر میں اس فریق کا مذکورہ دونوں صورتوں میں موقف قرآن وسنت کی رُو سے عدل وانصاف پر مبنی کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

پھر یہ بات ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ طبی اعتبار سے دماغی توازن پر کاری اثر پڑنے اور دماغی انقلاب واختلال واقع ہونے اور دماغی توازن کھو بیٹھنے کی مختلف انواع ہوسکتی ہیں، اوران کی بعض انواع میں انسان جب اس کیفیت میں مبتلا ہو، اس وقت عنداللہ غیر مکلّف قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کو بالکل پاگل اور مجنونوں کی فہرست میں شمار کیا جائے، فقہائے کرام نے دماغی اختلال کی دائمی اور عارضی مختلف انواع واقسام کا ذکر فرمایا ہے، جن سے اہلِ علم واقف ہیں۔ [1]

---

[1] چنانچہ فقہائے اصولیین نے مجنون، معتوہ، مدہوش، مبرسم اور مغمیٰ علیہ اور صبی کو عوارضِ اہلیتِ سماوی میں شمار کیا ہے اوران عوارض میں مبتلا اشخاص کو فقہائے کرام نے مختل العقل ومغلوب العقل قرار دیا ہے، کیونکہ ان اشخاص کے اقوال وافعال میں اختلاط واختلال پایا جاتا ہے۔

بعض فقہائے کرام نے مجنون کو معدوم العقل اور معتوہ کو ناقص العقل اور صبی کی طرح قرار دیا ہے۔

معتوہ اور مجنون میں فرق یہ بیان فرمایا ہے کہ معتوہ مختلط الکلام، فاسد التدبیر وغیرہ ہوتا ہے، لیکن مارتا پیٹتا اور سب وشتم نہیں کرتا، جب کہ مجنون مارتا پیٹتا اور سب وشتم بھی کرتا ہے۔ پھر مدہوش کو مجنون کی قسم قرار دیا ہے۔ مبرسم (یعنی ہذیانی بیماری جس کی وجہ سے مریض کا دماغ متاثر ہوجاتا ہے، اوراس بیماری کی وجہ سے مریض بے معنیٰ گفتگو کرنے لگتا ہے) اور مغمیٰ علیہ (جس کے پاس عقل کا تو وجود ہوتا ہے، لیکن عقل مغلوب ہوجاتی ہے، اور حواسِ مدرکہ یا قوتِ مدرکہ متاثر ہوجاتی ہے) کو معتوہ کے تحت میں داخل کیا ہے۔

جب کہ بعض فقہا نے جنون کی تفسیر اختلالِ عقل سے کرتے ہوئے اس کو مختلف الاقسام قرار دیا ہے اور معتوہ، مبرسم، مغمیٰ علیہ اور مدہوش کو جنون کی ذیلی اقسام میں داخل کیا ہے، جس میں زوالِ عقل، ذہابِ عقل ونقصانِ عقل کی تمام صورتیں آجاتی ہیں۔

لیکن عوارضِ اہلیت ان مذکورہ اشخاص کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ جو بھی بیماریاں ان صفات کی حامل ہوں یعنی ان کی وجہ سے اقوال وافعال میں اختلاط واختلال پایا جاتا ہو، ان سب کا یہی حکم ہے۔

اس قسم کی بیماریوں کو آج کل کی زبان میں مالیخولیا سے تعبیر کیا جانا بھی ممکن ہے، جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''وساوس اوران کا علاج'' میں بیان کردی ہے۔

واختلفوا فی تفسیر المعتوه وأحسن ما قیل فیه هو من کان قلیل الفهم مختلط الکلام فاسد التدبیر إلا أنه لا یضرب ولا یشتم کما یفعل المجنون. (ردالمحتار ج ٦ ص ١٤٤، کتاب الحجر، دارالفکر، بیروت)

واحسن الاقوال فی الفرق بینهما ان المعتوه هو قلیل الفهم المختلط الکلام الفاسدالتدبیر لکن لایضرب ولایشتم بخلاف المجنون ویدخل المبرسم، والمغمیٰ علیه

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

ہم نے ایسے متعدد لوگوں کا اپنی زندگی میں مشاہدہ کیا ہے جو اپنے مخصوص کام کاج کے سلسلے میں بظاہر عام طور پر عاقل سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان کے دماغ پر جب کسی مخصوص کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے، تو وہ بہکی بہکی اور متضاد و بے سرو پا باتیں کرتے ہیں، جن کا عاقل شخص سے صادر ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے، اسی وجہ سے ایسے اشخاص کے عاقل یا غیر عاقل اور مکلّف یا مرفوعُ القلم ہونے میں مختلف حالات کے مشاہدۂ کار حضرات کا اختلاف ہوجاتا ہے، لیکن جو شخص حقیقت شناس اور مجموعی ومتواتر حالات سے واقف ہو، اس کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، جیسا کہ مولانا سندھی صاحب کے متعلق مختلف جہات سے حضرت مدنی کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

## مولانا سندھی صاحب کے متعلق ناانصافی کا الزام

اس کے برعکس فاضل ناقد، مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے ساتھ اصولِ شریعت کے مطابق موقف اختیار کرنے، اور صحیح عدل وانصاف کرنے والے فریق کے موقف کو عدل وانصاف پر مبنی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ ان کے نزدیک یہ موقف مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم وناانصافی پر مبنی ہے، اور ان کے نزدیک حضرت مدنی کی تحریر ہی یا تو اصل نہیں، بلکہ جھوٹی ہے، یا پھر اس سے مذکورہ موقف کا ثبوت نہیں ملتا، اسی وجہ سے فاضل ناقد نے اس موقف کے حاملین وقائلین کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کا ارتکاب کرنے والا قرار دیتے ہوئے اپنی مرتب کردہ ''یادگارِ اکابر'' نامی کتاب کے آغاز ہی

---

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

والمدهوش. (البحر الرائق جلد۳، صفحہ ۲۴۹، کتاب الطلاق)

قال فی النوازل المعتوہ من کان مختلط الکلام فاسد التدبیر لکنه لایضرب ولایشتم، کما یفعله المجنون. (الجوهرة النیرة ج۲ ص ۲۴۱، کتاب الحجر)

وأما المعتوه فاختلفوا فی تفسیره، وأحسن ما قیل فیه هو من کان قلیل الفهم مختلط الکلام فاسد التدبیر إلا أنه لا یضرب ولا یشتم کما یفعل المجنون. (درر الحکام شرح غرر الاحکام، ج۷، ص ۲۷۳، کتاب الحجر)

www.idaraghufran.org

میں نمایاں طور پر لکھا ہے:

''اس کا ''انتصاف'' موجودہ دور کے ان حضرات:

☆ شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہٗ (نایب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی)

☆ مولانا زرولی خان صاحب (جامعہ احسن العلوم کراچی)

☆ مفتی محمد رضوان صاحب

☆ جناب ابن الحسن عباسی

کے نام ہے، اس امید پر کہ اگر طبیعت میں انتشار نہ ہو، تو حضرت سندھی رحمہ اللہ کے ساتھ انصاف کر کے سعادت پائیں گے!'' (''یادگارِ اکابر'' کراچی، صفحہ ۷)

پہلی بات تو یہ ہے کہ فاضل ناقد نے ''انتساب'' کے بجائے ''انتصاف'' لکھا ہے، جو معلوم نہیں، کون سی اصطلاح ہے، کیونکہ ''انتصاف'' کے معنی، نصف کے آتے ہیں۔ [1]

---

[1] عن أبی هريرة، أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -قال" :إذا انتصف شعبان، فلا تصوموا(سنن أبی داود،رقم الحديث۲۳۳۷)

عن سالم بن عبد الله، عن أبيه، أنه أخبره أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول " :إنما بقاؤكم فيما سلف قبلكم من الأمم كما بين صلاة العصر إلى غروب الشمس، أوتى أهل التوراة التوراة، فعملوا حتى إذا انتصف النهار عجزوا(صحيح البخاری،رقم الحديث،۵۵۷)

عن كريب، أن ابن عباس أخبره :أنه بات عند ميمونة وهی خالته فاضطجعت فی عرض وسادة واضطجع رسول الله صلى الله عليه وسلم وأهله فی طولها، فنام حتى انتصف الليل -أو قريبا منه -فاستيقظ يمسح النوم عن وجهه(صحيح البخاری،رقم الحديث،۹۹۲)

حتى إذا انتصف (الليل أو قبله) أی قبل انتصافه (بقليل أو بعده) بعد انتصافه (بقليل استيقظ رسول الله -صلى الله عليه وسلم -) إن جعلت إذا ظرفية فقبله ظرف لاستيقظ أی استيقظ وقت الانتصاف أو قبله(إرشاد السارى لشرح صحيح البخارى، ج۱،ص۲۶۴،باب قراء ة القرآن بعد الحدث وغيره)

النصف، بالكسر :الانتصاف .وقد أنصفه من خصمه، ينصفه إنصافا(النهاية فی غريب الحديث والأثر،لابن الأثير، ج۵،ص۶۶،مادة " نصف ")

نسب:النسب :نسب القرابة، فلان نسيبی وهم أنسبائی .والنسابة ينسب وينسب .ورجل نسيب منسوب :ذو حسب ونسب .والنسبة :مصدر الانتساب، والنسبة :الاسم(المحيط فی اللغة، ج۲،ص۲۶۸،السين والنون والباء)

www.idaraghufran.org

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک حضرت مدنی کا بیان و مضمون سچا ہے، اور حضرت مدنی نے اس مضمون و بیان میں مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ہر قسم کے طبعی انتشار سے بچ کر، ظلم و ناانصافی یا افراط و تفریط کا ارتکاب کرنے کے بجائے، ان کے ساتھ حسنِ ظن کی بھی رعایت کر کے عقلی طور پر پورا پورا عدل و انصاف فرمایا ہے، جس کا قرآن و سنت میں حکم آیا ہے، بلکہ مولانا سندھی صاحب کے ساتھ عدل و انصاف اختیار کرنے اور افراط و تفریط سے بچنے کے لیے ہی حضرت مدنی نے یہ بیان تحریر کیا اور جاری فرمایا ہے، جس کی تصریح آگے آتی ہے۔

نیز فاضل ناقد نے جن حضرات و افراد کی طرف اپنی مذکورہ کتاب کا انتساب بعنوان ''انتصاف'' کر کے، مولانا سندھی صاحب کے ساتھ انصاف کرنے کی دعوت دی ہے، ان حضرات و افراد کا مولانا سندھی صاحب کے متعلق اصولی موقف بھی وہی ہے، جو حضرت مدنی اور دیگر اکابر کا ہے، جس کی کچھ توضیح و تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

## حضرت مدنی کا موقف

حضرت مدنی اپنے مضمون و بیان کے شروع میں فرماتے ہیں:

''ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہو رہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کر دیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط و تفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کی روشنی کے خلاف دیکھیں، اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات و نصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے (جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک در ملک پھراتا رہا تھا) رائے قائم فرمائیں''۔

www.idaraghufran.org

اس سے معلوم ہوا حضرت مدنی کے اس بیان و مضمون کا اصل مقصود، مولانا سندھی صاحب کے متعلق افراط وتفریط سے بچ کر عدل وانصاف کو قائم کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

حضرت مدنی اپنے اس مضمون و بیان میں مولانا سندھی صاحب کے دماغی انقلاب واختلال اور متضاد امور کے صادر ہونے اور اس کے اسباب وعوارض کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

''بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زریں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں''۔

حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کی تحریر اور کلام کو پرکھنے اور جانچنے کا معیار بھی بتایا، اور اس کے بغیر مولانا سندھی کے کلام کو اکابر وسلف کا ترجمان قرار دینے سے گریز کرنے کا مشورہ بھی عنایت فرمایا۔

حضرت مدنی کا یہ مکمل مضمون و بیان اور اس کا مستند ومعتبر ہونا، نیز اس کی تشریح وتوضیح آگے آئے گی، جس سے حضرت مدنی کا مولانا سندھی صاحب سے متعلق اصل موقف پوری طرح سامنے آئے گا، جس کی پیروی بعد کے متعدد حضرات کرتے رہے ہیں، تفصیل آگے آئے گی۔

# مولانا احمد علی لاہوری صاحب کا موقف

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے سب سے معتبر و مستند شاگرد، مولانا احمد علی لاہوری صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی، اور مسلکِ اسلاف سے نکلنا جرمِ عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انھیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں۔ بعد از ہجرت جو اُن کے خیالات میں مذہباً یا سیاستاً تبدیلی آ گئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لیے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے''.....فقط

احقر الانام احمد علی عفی عنہ ۲۳ جون ۱۹۴۶ء

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، جنوری 1965 عیسوی، رمضان المبارک 1384 ہجری، صفحہ ۶۸، ۶۹، جلد نمبر 95، بعنوان ''مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندوی'' درذیل ''آثارِ علمیہ وادبیہ'')

مولانا احمد علی لاہوری صاحب نے مولانا سندھی صاحب کے ساتھ اپنی تمام تر نسبتوں کے باوجود مولانا سندھی صاحب کے بعد از ہجرت کے ان مذہبی وسیاسی افکار وخیالات سے برملا اختلاف کا اظہار فرمایا، جو اِن کے نزدیک کتاب وسنت اور مسلکِ اسلاف کے مطابق نہیں تھے، اور اس سلسلے میں مولانا سندھی صاحب کی ناراضگی وخفگی کی بھی پروا نہیں کی، نہ ہی ان کے اصرار کا اثر لیا، دینی تصلّب اسی کو کہا جاتا ہے۔

کوئی منصف وحق پرست یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ مولانا لاہوری صاحب نے مذکورہ طرزِ عمل اختیار کرکے مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم وناانصافی کا ارتکاب کیا، یا جو شخص

مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے مذکورہ طرزِ عمل اور موقف کی پیروی کرے، وہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ساتھ ظلم وناانصافی کا ارتکاب کرنے والا شمار ہو۔

## مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا موقف

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی وفات کے موقع پر ماہنامہ ''معارف'' میں تحریر فرمایا:

افسوس ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے 22 اگست 1944 عیسوی کو اس عالمِ فانی کو الوداع کہا، مرحوم نے ساری عمر اپنے خیالات کی خاطر جن کو وہ حق سمجھتے تھے، تکالیف میں بسر کی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مدت کے بعد کوئی عالمِ دین ایسا پیدا ہوا تھا، جس نے اس طرح مجاہدانہ زندگی بسر کی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، اور مقامِ اعلیٰ نصیب فرمائے.....

اس نمبر میں ''مولانا عبیداللہ سندھی'' نام کی ایک کتاب پر تبصرہ شامل ہے، یہ مضمون کئی ماہ پہلے لکھا گیا، اور ''معارف'' میں چھپنے کو آیا، اگر اس کا تعلق مولانا کی ذات سے ہوتا، تو ہم اس کی اشاعت قطعاً روک دیتے، مگر چونکہ یہ ذات کے بجائے ان کے خیالات سے متعلق ہے، جو اِن کی وفات کے بعد بھی پھیلیں گے، اور پھیلائے جائیں گے، اس لیے اس کی اشاعت کی ضرورت بہرحال باقی ہے۔ (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، انڈیا، ستمبر 1944 عیسوی، رمضان المبارک 1363 ہجری، جلد 54، شمارہ 3، صفحہ 161، درذیل ''شذرات'')

اسی بات کی صراحت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں بھی بیان کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

''قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی،

مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں، بلکہ دین کا ہے۔

پھر گو وہ خود اس دنیائے دَنی سے رخصت ہو گئے، مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعے سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لیے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے، تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی، اور اس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے اندر بڑا جوش تھا..... افغانستان پہنچ کر ان کے مذہبی خیالات کے تغیّر کی خبر خواص کو برابر پہنچتی رہی، اور تردید کرنے والے تردید کرتے رہے، اور روس وٹرکی پہنچ کر تو ان کے خیالات کا انقلاب اوج کمال تک پہنچ گیا۔ ان کے قیامِ حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندوستان سے حجاز کو جاتے رہے، اور ان سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور بے گانہ خیالات کو سن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے۔ ان کی ہندوستان واپسی کا سیاسی ومذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا، لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے، اور نہ دوسرے گروہ میں۔

یہ خاکسار بھی ان لوگوں میں ہے جو اِن کی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اپنے بزرگوں کے اور ان کے تعلقات کے سبب سے ان کے ساتھ عقیدت رکھتا تھا، اور مولانا بھی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن جب سے ''معارف'' نے ان کے خیالات کی تردید میں حصہ لیا، وہ ارتباط باقی نہیں رہا۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۲۰، و ۲۲۵، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

ملاحظہ فرمایے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی خدمات وصفات کا اعتراف فرمایا، اور ان کی ذات سے اختلاف کے بجائے ان کے بعض افکار

وخیالات سے بھی اختلاف کا اظہار فرمایا، اور اس سلسلے میں متعدد حضرات کے مشاہدات اور واقعات کا بھی ذکر فرمایا، جو عدل وانصاف میں داخل ہے۔

## مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا موقف

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم، حضرت مدنی کا مضمون وبیان نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز کی یہ تحریر بالکل واضح ہے، جس میں حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں کو بھی واضح فرمادیا ہے، اور اس کے ساتھ ان کے افکارِ شاذہ سے اپنی اور اکابر علمائے دیوبند کی برأت کا بھی اظہار فرمادیا ہے، اور افکار کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کا عذر بھی بیان فرمادیا ہے کہ وہ مسلسل مصائب وشدائد سہنے کے نتیجے میں اختلالِ ذہنی کا شکار ہوگئے تھے، اس حالت میں ان سے جو نظریات وافکار صادِر ہوئے، ان میں وہ خود تو شاید اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ سے معذور ہوں گے، لیکن دوسرے لوگوں کو ان افکار میں ان کی اتباع کرنے کے بجائے جمہورِ امت کے مسلک ہی کو اختیار کرنا چاہیے، اور حضرت نے یہ بھی بیان فرمادیا کہ ان کے افکارِ شاذہ کو حضرت شاہ ولی اللہ یا حضرت نانوتوی یا حضرت شیخ الہند کی طرف منسوب کرنا بھی درست نہ ہوگا۔ حضرت مولانا سندھی کے بارے میں اس سے زیادہ معتدل، مستند اور قابلِ اعتماد رائے اور کیا ہوسکتی ہے؟
>
> مولانا سندھی مرحوم کی زندگی کا وہ دور جو حضرت مدنی قدس سرہٗ کے الفاظ میں اختلال یا زیادہ مؤدب محدثانہ اصطلاح میں ''اختلاط'' کا دور تھا، اس کے بارے میں حضرت مدنی قدس سرہٗ متنبہ فرمارہے ہیں کہ ان کے اس دور کے افکار قابلِ

اعتماد نہیں ہیں، لیکن اگر کوئی شخص ان کے اسی دور کے افکار کو لے کر بیٹھ جائے، انھیں کو قابلِ اتباع سمجھنے لگے، اور ان ہی افکار کی وجہ سے ان کو امامِ انقلاب یا فکرِ ولی اللّٰہی کا ترجمان قرار دے، تو یہ وہی مغالطہ انگیز طرزِ عمل ہوگا، جس سے برأت کا اظہار حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز نے مولانا سندھی سے انتہائی محبت کے باوجود اپنی دیانت وامانت کے تقاضے سے ضروری سمجھا تھا۔ (تبصرے، از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، صفحہ ۴۸۳، ۴۸۴، ترتیب: مولانا محمد حنیف خالد، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: ۱۴۲۶ھ اپریل 2005ء)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے مولانا سندھی صاحب سے متعلق جو موقف اپنایا، وہ حضرت مدنی کے موقف کے مطابق ہے، ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب نے حضرت مدنی کے موقف کی اعلیٰ طریقے پر تحسین بھی فرمائی، جو ہمارے نزدیک ظلم وناانصافی کے بجائے عدل و انصاف میں داخل ہے۔

## مولانا سید محمود میاں صاحب کا موقف

مولانا سید محمود میاں صاحب زید مجدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

میرے نزدیک حضرت اقدس مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی تحریر محاکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا حضرت رحمہ اللہ کے اخبارِ مدینہ بجنور کے مضمون پر بندہ کو اطمینان ہے۔

(ماہنامہ ''انوارِ مدینہ لاہور، پاکستان''، جنوری 1998 عیسوی، رمضان المبارک 1418 ہجری، ص ۵۱ تا ۵۸)

مولانا سید محمود میاں صاحب کے موقف کی تفصیل آگے آتی ہے، جس میں انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے ذہنی اختلال کی بنا پر صادر غلط وشاذ افکار کی تردید بھی فرمائی، مولانا سندھی صاحب کو ذہنی ودماغی طور پر معذور بھی قرار دیا، اور ان کی قائدانہ ومجاہدانہ صفات کا اعتراف بھی فرمایا۔

حضرت مدنی کے تفصیلی موقف کے یہی بنیادی اجزا ہیں، جیسا کہ آگے تفصیلاً آئے گا۔

www.idaraghufran.org

# مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کا موقف

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب زید مجدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اسلامیانِ ہند کی گزشتہ تاریخ کے ایک بے باک اور نڈر رہنما ہیں، وہ بعض مشہور تحریکوں کے رکن ہی نہیں، مرکزی کرداروں میں سے ہیں ''تحریک ریشمی رومال'' کی ساری داستان انھی کے گرد گھومتی ہے، یہ تحریک کامیاب ہوتی، تو اس کے تار سے اسلامی تاریخ کا ایک لازوال نغمہ پھوٹتا، جس کی مسحور کن صدائیں پورے برصغیر میں سنائی دیتیں، لیکن اے بسا آرزو! کہ خاک شد، انگریزوں کے خلاف اس عظیم مجاہد کی لازوال قربانیاں ہر قسم کی انگشت نمائی سے بالاتر ہیں، ان کی صعوبتوں اور مشقتوں کے قصے استعماری قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں، وہ انھیں پڑھ کر مایوسی کی تاریک رات میں چراغ روشن کر سکتے ہیں، امیدوں کی شمع جلا سکتے ہیں۔

لیکن دورۂ روس کے بعد جب ان کی بہارِ عمر رخصت ہو چکی تھی، ان سے بعض ایسے نظریات وتحقیقات، ایسے افکار وخیالات کا ظہور ہونا شروع ہوا، جو ان کی سابقہ تاریخ سے میل نہیں رکھتے تھے۔ یہ شدتِ جذبات کی لرزش کا بھی نتیجہ ہو سکتے ہیں، اور طویل ومسلسل صعوبتوں کا اثر بھی کہلا سکتے ہیں۔

بات یہاں تک ہوتی تو خیر کوئی حرج نہیں (تھا) اسے ان کی ذات کا معاملہ سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیے، لیکن کچھ لوگ مولانا کے اس دور کے انھی افکار ونظریات کو لے کر میدان میں اترے ہیں اور منظّم انداز میں ان افکار کی اشاعت وتبلیغ میں مصروف ہیں، پھر ظلم یہ کہ اپنے ذاتی افکار کو بھی ان کی طرف منسوب کر کے اور ان پر حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر کی مہر لگا کر عام کر رہے ہیں، ایسے میں ان افکار کی نشان دہی

کرنا اور ''ہوشیار باش'' کی تنبیہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے، تاکہ ان افکار کا مطالعہ کرنے والے کو خیال رہے کہ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''۔

امید یہی ہے کہ مولانا سندھی کے عقیدت منداس مضمون کو اسی جذبہ کے ساتھ پڑھیں گے۔ [1]

مولانا سندھی کے افکارِ شاذہ اور تفردات کو مستثنیٰ کرکے ان کے ساتھ ہماری عقیدت ان کے کسی عقیدت مند سے کم نہیں، لیکن دین کے مسلّمات بہ ہرحال مسلّمات ہیں، ان کے خلاف کسی کی پیروی یا رعایت کی گنجائش کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ [2]

تاریخِ اسلام کی ایک دو نہیں، بیسیوں شخصیات ایسی گزری ہیں، جو متنازع اور مختلف آرا کا سنگم بنی رہیں، ابن العربی کی مخالفت وموافقت میں اب تک لکھا جارہا ہے، ابنِ تیمیہ کے متعلق رائے رکھنے والے کچھ لوگوں کو ان کے اسلام تک میں بھی شبہ تھا، لیکن ایک دنیا انھیں اپنے زمانہ کا مجدد سمجھتی اور قرار دیتی ہے، منصور کی صدائے ''انا الحق'' نے انھیں تختۂ دار پر چڑھایا، لیکن ان کے اقوال کی تاویل وصفائی پر بھی لوگوں نے کتابیں لکھیں، جمال الدین افغانی کو یہودیوں کی عالم گیر خفیہ تنظیم ''فری میسن'' کا رکن ثابت کرنے پر کتابیں لکھی جارہی ہیں، تاہم ان لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں، جو انھیں امتِ مسلمہ کا عظیم رہبر ورہنما تسلیم کرتے ہیں، شیخ عبدالوہاب نجدی کے ساتھ بھی یہی ہوا اور ہورہا ہے۔

لیکن افراط وتفریط کے درمیان تاریخ کے پاس اعتدال کا قلم بھی ہے، جو ہر متنازع

---

[1] لیکن بعض حضرات نے اس جذبہ کے تحت پڑھنے کے بجائے، اس مضمون کو کسی دوسرے جذبہ سے پڑھا، جس کے نتیجے میں کئی شبہات واعتراضات لازم آئے۔ محمد رضوان۔

[2] بعض حضرات اس اصول کو نظر انداز کرکے، صرف عقیدت مندی کی بنیاد پر دین کے مسلمات کو نظر انداز کرنے پر عمل پیرا ہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

شخصیت کو اس کا صحیح درجہ اور حق دیتا ہے، اور ہمیشہ تاریخ کا وہ معتدل فیصلہ ہی معتبر رہا ہے۔ [1]

تاریخی متنازع شخصیات میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم بھی ہیں۔

(.....پھر چند صفحات تک مولانا سندھی صاحب کے چند حالات وواقعات تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:.....)

مولانا عبیداللہ سندھی کی دو شخصیتیں ہیں، ایک شخصیت ان کی کابل کی طرف ان کے تاریخی سفر سے پہلے کی ہے، کابل جانے سے پہلے کے مولانا عبیداللہ سندھی آزادیِ ہند میں حصہ لینے والے ان جاں باز مجاہد علماء کی صفِ اول کے ایک ایسے فرد ہیں، جن کی قربانیوں کی عظمت کو ہماری تاریخِ اسلام سلام کرتی ہے، وہ حضرت شیخ الہند کی زیرِ قیادت آزادیِ ہند کے لیے مجاہدانہ کارنامے انجام دیتے رہے، اس پرخار راہ کے ہر کانٹے سے ان کے پاؤں میں چھالے پھوٹ پھوٹ پڑے، لیکن زنجیرِ آزادی کی کوئی کڑی انھوں نے ٹوٹنے نہیں دی، وہ باہمت رجالِ اسلام کی طرح حالات کے ہر بدلتے تیور کے سامنے صبر واستقامت کے پیکر بنے رہے کہ ؎

مہر ومہ وانجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

ذہانت وذکاوت، اخلاص وللّٰہیت، غیر معمولی عزم وہمت، سخت جانی وتحمل، مشقت اور سب سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کے سینے کی تڑپ اور دل کے جذبۂ بے تاب نے بہت جلد مسلمانانِ ہند میں ان کا تعارف ایک سربکف وسرفروش مجاہد کی حیثیت سے کرایا، اس عرصے میں ان کو جو ملا، شیخ الہند سے ملا، جو پایا شیخ الہند سے پایا۔

---

[1] اسی معتدل ومعتبر فیصلہ کے حضرت مدنی، مولانا لاہوری اور ان کے متبعین قائل ہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

لیکن کابل، ماسکو اور ترکی میں ایک عرصۂ دراز گزارنے کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی آغوش تربیت میں تعمیر ہونے والی (مولانا سندھی) کی شخصیت کی عظیم عمارت دھڑام سے گرتی ہے اوران میں ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے۔

یہ بات ان کے خصوصی شاگرد پروفیسر سرور نے بڑے اچھے انداز میں (بیان کی ہے) وہ لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی کی سیاسی فکری عمارت جس کی پہلی اینٹ 1306 ہجری کے لگ بھگ دارالعلوم دیوبند میں رکھی گئی تھی، اس میں پہلی دراڑ تو اس وقت پڑی جب وہ کابل پہنچے، کابل میں سات سال تک جو کچھ دیکھا اور آخر میں جس طرح وہاں سے نکلنا پڑا، اس سے بھی اس فکری عمارت میں کافی شگاف آئے، لیکن سوویت یونین اور کمالی ترکی کے انقلابات نے تو تصور کے اس رنگین محل کو بالکل توڑ پھوڑ دیا اور اب وہ اس کھنڈر پر ایک نئی فکری سیاسی عمارت کی بنیاد رکھنے کا سوچنے لگے''۔

(افادات وملفوظاتِ مولانا سندھی ص ۵۹)

تصور کا وہ رنگین محل جو شیخ الہند جیسے ولی اللہ کی نگرانی اور دارالعلوم دیوبند کی مقدس فضاؤں میں تعمیر ہوا تھا وہ گر کر کھنڈر بنا، اس کے گرنے پر اس کے حامی وناقد سب کا اتفاق ہے۔ [1]

البتہ وہ کیوں گرا؟ اس میں مختلف آرا ہیں۔ پروفیسر سرور کے بقول سوویت یونین اور ترکی کے انقلابات نے اس کو گرایا، بعضوں کا خیال ہے کہ مسمریزم جیسی جنس کے حربے سے وہ گرایا گیا اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے نزدیک زمانہ کے مصائب وحوادثات نے اس کو گرایا''۔ (التجائے مسافر، صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۱، مطبوعہ: مکتبہ عمر فاروق، بالمقابل جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی، طباعتِ اول: رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ)

---

[1] چند حضرات اس سے اتفاق نہیں فرماتے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے چند تفردات اور افکار ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ سندھی کے کئی نظریات جمہور امت سے منفرد ہیں، جن میں چند کا اوپر ذکر کردیا گیا، ان تمام آراونظریات اوران کی شخصیت کے حوالہ سے کیے گئے تجزیہ کے نتیجہ میں عموماً تین مکتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔

(۱) ایک مکتبِ فکر ان حضرات کا ہے، جو حضرت سندھی کے پرجوش مداح و معتقدین ہیں، ان کی محبت وعقیدت کی آنچ ہلکی نہیں، وہ حضرت سندھی کے کسی تفرد کے سرے سے قائل ہی نہیں، وہ انھیں ایک مجاہد اور اعتراض وعیب سے بلند ایک انقلابی رہنما کا درجہ دیتے ہیں، اس مکتب فکر میں بھی دو طرح کے اصحاب ہیں۔

ایک تو وہ حضرات ہیں، جو مطالعے اور لکھنے پڑھنے کا خاص ذوق اور مزاج رکھتے ہیں، وہ اپنے مطالعے اور تجربات کی روشنی میں حضرت سندھی کے خاص اس فلسفے کو جوانھوں نے روس وترکی سے سفر کے بعد پیش کیا تھا، صحیح اور نظامِ حیات کا واحد حل سمجھتے ہیں۔

دوسرا فریق ان لوگوں کا ہے، جن کا نہ مطالعہ ہے، نہ ہی ان کے پاس کوئی ٹھوس سیاسی نظریہ ہے، وہ صرف ''امام انقلاب'' کے خوب صورت عنوان، حضرت سندھی کی مظلومانہ تصویر اور سنی سنائی باتوں کی بنا پر محبت وعقیدت سے کے جذبات سے لبریز ہیں۔

(۲) حضرت سندھی کے متعلق دوسرا مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے، جو سرے سے ان کے کسی کارنامے کے قائل ہی نہیں، بلکہ انھیں حضرت سندھی کے اسلام تک میں شبہ ہے، ان کا خیال ہے کہ مولانا سندھی نے اسلام کو جتنا نقصان مسلمان ہوکر

پہنچایا، شاید سکھ ہو کر اتنا نقصان نہ پہنچتا۔

چنانچہ مشہور ندوی عالم مولانا مسعود عالم ندوی کا حضرت سندھی کے متعلق یہی خیال تھا۔ [1]

---

[1] ہم اگرچہ درجِ بالا موقف کو اعتدال پر مبنی نہیں سمجھتے، لیکن ہم نے جہاں تک مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے اس سلسلے میں مضامین کا مطالعہ کیا، تو ہمیں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا یہ موقف ان کے مضامین میں دستیاب نہیں ہو سکا، بلکہ انھوں نے مولانا سندھی صاحب کی مجاہدانہ صفات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے افکار سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی وفات کے بعد بھی ان کا مقام بلند ہونے کی دعاء کی ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

دوسرا مضمون جون (44ء) میں لکھ کر معارف کو بھیجا جا چکا تھا، مگر اتفاق یہ کہ وہ جولائی یا اگست میں نہ چھپ سکا، اور اسی دوران میں مولانا سندھی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خبر سنتے ہی دل بیٹھ گیا، اور افکار و عقائد کے انتہائی اختلاف کے باوجود یہ صدمہ صبر آزما ثابت ہوا۔

اللہ ان کا مقام بلند کرے، اور ان کی خدمات کے عوض، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ایسے بالغ نظر، ان تھک کام کرنے والے اور وسیع القلب انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' پر استدراک، کے چھپتے ہی کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا تقاضا شروع ہو گیا تھا، مگر کاغذ کی کم یابی اور دوسری مشکلات کے باعث یہ تقاضا اب سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا، خیال تھا کہ اشاعت کے وقت بعض مضامین کا اضافہ ہو سکے گا، نیز ''برہان'' میں مولانا کی بعض جدید توضیحوں کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جا سکے گا، مگر اب کہ مولانا ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، دل و دماغ مزید کاوش کے لیے تیار نہیں، یہ مقالے بھی احساسِ فرض سے مجبور ہو کر شائع کیے جا رہے ہیں، اور حاشا و کلّا!! ان سے مولانا کی تردید نہیں، بلکہ ان کے افکار و خیالات کی تنقید و تنقیح مقصود ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہم مولانا کے ''نئے افکار'' سے متفق نہیں، اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ ان کے ''جدید نظریے'' کتاب و سنت کے صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، اس لیے ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں، خواہ اس میں جذباتِ محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو؟ کہ حق کی تائید، تعلقات و محبت کی پاس داری پر مقدم ہے۔

فالحق اولی من ولیک حرمة واحق منک بنصرة و کفاح (شرقی) ''

(مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر، صفحہ ۱۴ و ۱۵، مطبوعہ: دار الدعوۃ السلفیۃ، لاہور، تاریخِ اشاعت: صفر 1406 ہجری، نومبر 1985 عیسوی)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے موقف کی مزید تفصیل آگے فصل نمبر 6 میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں مکتبِ فکر غلط اور راہِ اعتدال سے دور افراط وتفریط کے کنارے پر ہیں۔

(۳) تیسرا مکتب فکر یہ ہے کہ حضرت سندھی نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے لازوال قربانیاں دی ہیں، سرفروشانہ کارنامے انجام دیے ہیں، اور راہِ جہاد کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔

البتہ ان کے بعض نظریات شاذ ہیں، خصوصاً کابل اور روس سے واپسی کے بعد پے در پے ناکامیوں، زندگی کے تلخ تجربوں اور صعوبتوں سے ان کی طبیعت اور سوچ میں درشتگی، بے چینی اور ایک جلال کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

جس کی وجہ سے وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھیں کوئی صحیح ترجمان میسر نہیں آیا۔

اور جو کچھ انھوں نے کہا، یا ان کی طرف سے لکھا گیا، اس کو علمائے دیوبند، حضرت شیخ الہند اور جمہور امت اور خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فلسفے کی اس وقت تک صحیح ترجمانی قرار نہیں دی جاسکتی، جب تک وہ جمہور امت کے نظریات کے موافق نہ ہو۔ [۱]

چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

''تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، اور ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زریں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

---

[۱] اسی پہلو سے متعدد علمی وقلمی شخصیات نے کام کیا، اور ہم نے بھی اس طرح کے مضامین کو اپنی کتاب میں جمع کیا۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔

(مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار، ص ۱۴۱)

ہمارے نزدیک حضرت سندھی کے متعلق یہ تیسرا مکتب فکر صحیح اور راہِ اعتدال پر ہے''۔ (التجائے مسافر، صفحہ ۱۷۲و۱۷۳، مطبوعہ: مکتبہ عمر فاروق، بالمقابل جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی، طباعتِ اول: رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ)

اصل بحث چونکہ ان افکار وخیالات سے ہے، جو مولانا سندھی صاحب کی طرف سے تصدیق وتائید شدہ اور ان کے معتمد تلامذہ اور مستند افراد کی طرف سے سامنے آئے، اور اس سے ہٹ کر جو تنظیمِ فکر ولی اللّٰہی والے افراد وغیرہ کی طرف سے پیش کردہ بے شمار، بے سند اور شاذ باتیں مولانا سندھی صاحب کی طرف منسوب سمجھی جاتی ہیں، ہمیں ان سے اگرچہ اختلاف ہے، لیکن ان کی مولانا سندھی صاحب کی طرف نسبت سے اتفاق نہیں۔

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مزید فرماتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ سندھی کے حوالہ سے کرنے کا کام اب یہ ہے کہ ان کے افکارِ شاذہ اور مرجوح قسم کے خیالات کو الگ کیا جائے، جو باتیں ان کی طرف غلط منسوب ہیں، دلائل سے ان کی تعیین کی جائے، ان کی شخصیت کا جائزہ عقیدت ومخالفت کے جذبات سے خالی ہو کر منصفانہ ذہنی فضا میں کیا جائے، تاکہ کوئی ان کی شخصیت کے گلستان کے کسی کانٹے کو پھول سمجھ کر توڑ نہ دے، اور اگر کسی کو اس گلشن کا کوئی پھول پسند ہو، تو اسے کانٹا سمجھ کر چھوڑ نہ دے کہ اُس میں دامنِ نظریہ وعقیدہ کے تار تار ہونے کا خطرہ ہے، اور اِس میں محرومی ہے۔

اس طرح اس فتنے کا سدّ باب ہو سکے گا، جو مولانا عبیداللہ سندھی کے حوالہ سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کو کمیونزم کا جامہ پہنانے کی سعی کر رہا ہے''۔

www.idaraghufran.org

**ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا**
**من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب**

(التجائے مسافر، صفحہ ۱۷۵، مطبوعہ: مکتبہ عمر فاروق، بالمقابل جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی، طباعتِ اول: رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ)

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب نے مولانا سندھی صاحب کے حوالہ سے جس کام کے کرنے کی دعوت دی ہے، متعدد اصحابِ علم وفکر اور اصحابِ قلم حضرات نے اس کام کو اپنی اپنی بساط کی حد تک انجام دیا ہے، اور ہم نے مولانا ابن الحسن عباسی صاحب اور دیگر پہلے اور بعد کے متعدد حضرات کے مضامین کو اپنی کتاب میں جمع کیا، اور ترتیب دیا ہے، جن میں کئی مضامین اگرچہ پہلے دور کے ہیں، لیکن نایاب ہونے کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ تھے، اس لیے ان کی افادیت بھی موجودہ زمانہ میں نئی محسوس ہوتی ہے۔

بہرحال مولانا ابن الحسن عباسی صاحب نے بھی مولانا سندھی صاحب کی قائدانہ ومجاہدانہ صفات وخدمات کا اعتراف فرمایا، اور ساتھ ہی آخری دور کے شاذ افکار سے اختلاف بھی کیا، اور آخر میں اس کے سبب وعارضے کی طرف بھی اشارہ کردیا، اور اس سلسلے میں پائی جانے والی افراط وتفریط کے مابین معتدل فیصلہ کی بھی وضاحت کردی۔

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کے مذکورہ بنیادی موقف کا محور بھی حضرت مدنی اور دیگر سابق اکابر واصحابِ علم وفکر کے موقف کے مطابق اور اعتدال پر مبنی ہے، اور چند جزوی چیزوں میں اختلاف ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

## بندے کا موقف

بندہ محمد رضوان نے اس سے پہلے ضمیمہ میں اپنا درج ذیل موقف واضح کردیا ہے:

”مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلامذہ اور ان کی طرف منسوب آرا کا عنداللہ کیا مقام ودرجہ یا حقیقت ہے؟ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بندہ، دلائل اور

ظاہری حالات وقرائن کی بنیاد پر یہ سمجھتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کی جو باتیں معتبر روایات سے پہنچی ہوں، ان کا بلاوجہ انکار نہ کیا جائے، اوران کے کسی شاگرد کو ان باتوں کا اصل ذمہ دار قرار نہ دیا جائے، کسی دوسرے کو بلا دلیل متّہم نہ کیا جائے، اورظاہری عبارات میں جو باتیں خلافِ شریعت معلوم ہوں، ان کی تردید کی جائے، اور مولانا کی طرف سے اس قسم کی لغزشوں کو کم ازکم درجہ میں ان کے ذہنی اختلال واختلاط پر محمول کیا جائے، جیسا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ فرما چکے ہیں۔ یہ حسنِ ظن کا کم ازکم درجہ ہے، جس کی بے شمار نظیریں محدثین واصحابِ علم میں پائی جاتی ہیں، اوراہلِ علم حضرات میں معروف ومشہور ہیں۔

جب کہ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ مسمریزم وغیرہ کے اثر سے مولانا سندھی کے افکار میں تبدیلی پیدا ہوئی، اور بعض حضرات، مثلاً پروفیسر سرور صاحب سوویت یونین اور ترکی کے انقلاب اور ماحول سے متاثر ہوکر مولانا سندھی کے افکار میں تبدیلی پیدا ہونے کے مدعی ہیں۔

**" وکل حزب بما لدیھم فرحون "**

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک، صفحہ ۵۶، ۵۷)

مزید تفصیل بندے کے اصل مضمون میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

## مولانا زرولی خان صاحب کا موقف

جن شخصیات کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرنے والوں کی فہرست میں شمار کرکے انصاف کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان میں ایک شخصیت، شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب (مہتمم: الجامعۃ العربیۃ احسن العلوم، گلشن اقبال، کراچی) کی ہے۔

شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب کا ایک مضمون ماہنامہ ''نورعلیٰ نور'' کراچی کی اشاعت صفر المظفر 1426 ہجری، مارچ 2005 عیسوی میں ''امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت اوران کے تفردات'' کے عنوان سے شائع ہوا (جو ہمیں تلاشِ بسیار کے بعد مولانا مفتی حنیف خالد صاحب زید مجدہٗ کے توسط سے جامعہ دارالعلوم کراچی کی لائبریری سے دستیاب ہوا، فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء ) شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب کا وہ مضمون ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں:

موقر جریدہ ماہنامہ ''نورعلیٰ نور'' کے شمار 12 جلد 6، بابت ماہِ محرم الحرام 1426 ہجری میں ایک گراں قدر مضمون امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کے بھائی فاضلِ دیوبند حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی، اشاعت پذیر ہوا ہے۔

اپنی اس عاجزانہ تحریر میں مجھے حضرت صوفی صاحب کی جانب سے حضرت سندھی کے بیان کردہ سوانحی نقوش میں کوئی کمی بیشی نہیں کرنا۔

بلکہ اس امرِ واقعہ کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جو حضرت سندھی کے آخر عمر کے فکری رجحانات کے بارے میں نہ صرف اکابر علماء کے محسوسات ہیں۔

بلکہ خود حضرت سندھی بھی اس کا اعتراف فرماتے ہیں کہ ان کے بعض افکار وخیالات کو علماء نہیں مانتے۔ [1]

---

[1] حضرت مدنی نے اور بعض دوسرے اہلِ علم واہلِ قلم حضرات نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلمیذ وترجمانِ خاص پروفیسر سرور صاحب نے تو یہاں تک لکھا:

اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اوران کا پوری طرح شخصی احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اوراذیتیں اٹھا اٹھا کران کا دماغ چل گیا ہے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعات میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

www.idaraghufran.org

چنانچہ آپ کے تلمیذِ خاص، جامعہ ملیہ: دہلی کے استاد پروفیسر محمد سرور الازہری، جو حضرت سے کسبِ فیض کے لیے خاص طور مکہ مکرمہ بھیجے گئے تھے، رقم طراز ہیں:

''ایک دن مولانا (سندھی) بڑے مغموم تھے، فرمانے لگے کہ میں مسلمانوں کے کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں، لیکن وہ نہیں سنتے، بلکہ الٹا مجھے مطعون کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں سولہ برس کا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر نکل آیا تھا، مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا، اور نہ ہمارے ہاں دولت کی فراوانی تھی، لیکن آخر میری ماں تھی، میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزیں تھیں، لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا، خدا ہی جانتا ہے کہ (قبولِ اسلام کی راہ میں) ماں کو چھوڑنے سے مجھے کس قدر ذہنی کوفت ہوئی (یہ کہتے ہوئے مولانا آبدیدہ ہوگئے)

آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا اسلام سے میری اس شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو بھی مجھے اسلام کی بات سمجھاتا، اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی، تو میں اس کا دل وجان سے گرویدہ ہوجاتا، حضرت شیخ الہند نے مجھے اسلام سکھایا، اور ان کے واسطے سے میں نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا، مجھ پر قرآن حکیم کے حقائق منکشف ہوئے، اور میں دینِ اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا، اب اگر میں موجودہ مذہبی طبقوں کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں، تو اسے یہ سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں، کس قدر غلط ہے۔

میں نے دنیا کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی والدہ کی محبت پر مذہب کو مقدم جانا، اور آج عمر بھر کے مصائب اور تکالیف کے باوجود بھی مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آج جب کہ مجھے اپنی زندگی کا آخری کنارا نظر آرہا ہے، کوئی بات ایسی کہوں، جس سے خدا نہ کرے، اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔''

www.idaraghufran.org

مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت سندھی کا یہ ارشاد کہ۔

''اب اگر میں موجودہ مذہبی طبقوں کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں، تو اسے یہ سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں، کس قدر غلط ہے''۔

سے واضح ہے کہ بعض امور میں حضرت سندھی کے افکار وخیالات جمہور علماء کے موقف ومسلک سے تفرد وتمیز کا پہلو لیے ہوا کرتے تھے۔ [1]

خصوصاً پچیس سالہ جلاوطنی کے اختتام پر 7/ مارچ/ 1939 عیسوی سے آخر زیست 22/ اگست/ 1944 عیسوی تک ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں حضرت مولانا سندھی کے خیالات پر حوادثات ومصائب، جو اِن کو جہادِ آزادی میں جھیلنا پڑے، کا گہرا اثر تھا۔ [2]

---

[1] اس بات کا اعتراف متعدد ومستند اصحابِ علم واصحابِ قلم حضرات نے کیا ہے، جن میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں، جنھوں نے مولانا سندھی صاحب کے بعض متنازع وشاذ افکار وخیالات کو خود اپنے کانوں سے سنا۔

[2] ملحوظ رہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب وسطِ اکتوبر 1915 عیسوی (1333 ہجری) میں ہندوستان سے افغانستان پہنچے، جہاں سات برس قیام کیا، وہاں سے 23 اکتوبر 1922 عیسوی میں روس تشریف لے گئے، یہاں سات ماہ قیام کے بعد جولائی کے وسط میں 1923 عیسوی میں ترکی چلے گئے، جہاں چار سال قیام کیا، وہاں سے 1926 عیسوی (صفر 1345 ہجری) میں حجاز گئے، جہاں تقریباً بارہ برس قیام کیا، پھر حجاز سے ہوتے ہوئے 7 مارچ 1939 عیسوی، محرم 1358 ہجری میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح مولانا سندھی کے بیرون ملک قیام کا یہ زمانہ تقریباً 24 سال کے عرصے پر محیط ہے، اور ہندوستان واپسی کے تقریباً پانچ سال بعد 22 اگست 1944 عیسوی رمضان 1363 ہجری میں مولانا سندھی صاحب کی وفات ہوئی۔

حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کے حجاز میں پہنچنے کے بعد ان سے ملاقات کرنے پر اپنا مشاہدہ درجِ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

جیسا کہ حضرت صوفی عبدالحمید صاحب سواتی زید مجدہم نے خود تحریر فرمایا ہے۔

''حوادثات جھیل جھیل کر مولانا کے دماغ میں تپش پیدا ہوگئی تھی، اپنے خلاف چھوٹی سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔'' [1]

حضرت صوفی صاحب نے اپنے مضمون میں حضرت سندھی کا ایک تفرد اور جمہور علماء سے ایک قومی مسئلے میں الگ موقف کی جانب خود بھی اشارہ فرمایا ہے کہ:

''چنانچہ 1939 عیسوی میں دوسری جنگِ عظیم ہوئی، تو انگریز مخالف سب آزاد خیال جماعتیں جنگ میں انگریز کے مخالف تھیں، ان کا خیال تھا کہ انگریز کو فوجی بھرتی کے ذریعے مدد نہیں دینی چاہیے۔''

یہاں حضرت صوفی صاحب نے حضرت سندھی کے موقف کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اس موقع پر حضرت سندھی فرماتے تھے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوجانا چاہیے، کیونکہ اس جنگ کے بعد برطانوی استعمار کا برِّصغیر پر قبضہ جاری رکھنا ممکن نہ رہے گا، انگریزی اقتدار کا سورج یہاں سے غروب ہوجائے گا، اس لیے ضروری ہے کہ انگریز کے جانے کے بعد ہندوستانی فوج میں

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بناء پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے۔''

(مکمل مضمون آگے آئے گا)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے دماغی توازن پر اثر واقع ہونے اور متضاد و متخالف امور فرمانے کی کیفیت کا مشاہدہ مولانا سندھی صاحب کے 1926 عیسوی کے بعد حجاز پہنچنے پر ہو چکا تھا، اور ہندوستان تشریف لانے کے بعد اس میں اضافہ محسوس کیا گیا۔

مولانا سندھی صاحب نے کئی مضامین حجاز میں قیام کے دوران املا کرائے، جن میں متنازع و متضاد افکار پائے جاتے ہیں۔

[1] حضرت مدنی نے اس مضمون میں اس کیفیت کا ذکر اپنے الفاظ میں دماغ پر کاری اثر پڑنے اور دماغی توازن کھو بیٹھنے اور ایک ہی مجلس میں متضاد و متخالف باتیں کرنے اور بات بات پر غصہ کرنے اور تحمل و بردباری رخصت ہونے سے فرمایا ہے، تعبیرات کے فرق سے حقیقت نہیں بدلا کرتی۔

www.idaraghufran.org

مسلمانوں کا غیر مسلموں سے توازن قائم ہو چکا ہو۔ [1]

اسی طرح بعض فقہی امور میں بھی مولانا اپنی آرا پیش کیا کرتے تھے، جن کے احصا یا تذکرہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت سندھی فقہ حنفی کے داعی ہونے، اپنے بلند علمی مرتبہ، آزادی کے سپہ سالار اور حضرت شیخ الہند کے معتمدِ خاص ہونے کے باوصف کسی قومی جماعت کے ساتھ رفاقت اختیار نہ کر سکے، اور نہ ہی کوئی جماعت حضرت سندھی کی قیادت وسیادت کا بارگراں اٹھا سکی۔ [2]

---

[1] اگرچہ بہت سے اہلِ علم حضرات کو مولانا سندھی صاحب کے اس موقف سے اختلاف تھا، لیکن بعض حضرات نے مولانا سندھی صاحب کے اس موقف کو درست قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے موقف کے مطابق عمل درآمد ہونے سے آرمی میں مسلمانوں کی تعداد قابلِ ذکر ہونے سے بعد کے کئی نقصانات سے حفاظت رہتی، مسلمانوں کی تباہی میں ہندو آرمی کی انتہا پسندی اور سکھوں کی اعانت نے اہم کردار ادا کیا۔ محمد رضوان۔

[2] ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ہندوستان میں آمد اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات'' کے ضمن میں مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی ڈائری کے حوالے سے مذکور ہے:

الغرض یہ تمنائیں لے کر وہ (یعنی مولانا عبیداللہ سندھی) مارچ 1939 عیسوی میں ہندوستان کے ساحل پر اترے، کراچی، لاہور، دیوبند اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا، قوم کو ان سے اور ان کو قوم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مولانا کے عقیدت مندوں میں وہ لوگ بھی تھے، جو مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحمید صاحب کے واسطے سے ان کی تفسیر قرآن سے متاثر ہوئے تھے، اور وہ بھی تھے جن کو ان کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے ان سے عقیدت تھی، چنانچہ مولانا کی آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، اور دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبا ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے، مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعے اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن وفکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی تھی، اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار وخیالات کا اظہار کرنے لگے، عقیدت مندوں کا یہ جمگھٹا ہٹتا گیا، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیۃ العلما میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا، جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیۃ العلمائے صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس، اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی اور عام شاہ راہوں سے الگ ہو گئے۔

مولانا جو شیلے مجسمۂ انقلاب تو تھے ہی ''چراغِ سحری'' کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

حتّٰی کہ یہی اثر حضرت سندھی کے اکثر تلامذہ میں بھی اجاگر ہوا، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی حیدرآباد، پروفیسر محمد سرور لاہور، مولانا مقبول عالم بی-اے لاہور، علامہ محمد صدیق ولی اللّٰہی بہاول پور اور مولانا بشیر احمد لدھیانوی، جیسے رجالِ علم وفضل یکتائے روزگار تھے، مگر اپنے منفرد مزاج کے باعث معاشرے میں کوئی تحریک پیدا نہ کرسکے، نہ کسی تحریک کا حصہ بن سکے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے مقام ومرتبہ میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے، یا حضرت کے معاصرین اور بعدھم اکابرین میں ان کا اکرام روبہ تنزل ہوگیا تھا، ہرگز نہیں۔

اس سلسلے میں مجلسِ احرارِ اسلام کے ناظمِ دفتر مرحوم غازی خان کابلی جو حضرت سندھی کے حالات وافکار کو دوسروں کی نسبت بہت زیادہ جاننے والے تھے، کی تصنیف ''حیاتِ بخاری'' سے بطورِ استشہاد ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا عبیداللہ سندھی اور مجلسِ احرارِ اسلام

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی طویل جلاوطنی کے بعد 1939 عیسوی میں مراجعت فرمائے وطن ہونے کی خبر جب ہندوستان پہنچی، تو بزرگانِ احرار باہر کے

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ کردی تھی، اور ہر اس نظام کو فوراً توڑ دینے کے حق میں تھے، جو ان کے خیال اور ان کے مطالعے کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لیے مفید نہ تھا، وہ کانگریس کی ''مذہبی'' قیادت اور دیگر اسلامی جماعتوں کی ''قدامت پسندی'' سے نالاں تو تھے ہی، خاکسار تنظیم کی حمایت، سرسکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشتراکی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا۔

اور مولانا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولانا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی، اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابلِ قبول ہیں، جب اصولِ دین سے ان کی مطابقت مسلّم ہوجائے''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۱۷ و ۱۸، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

www.idaraghufran.org

دوروں پر تھے، دفتر میں صرف راقم (خان غازی کابلی) موجود تھے، اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ''صدر: احرارِ اسلام، ہند'' نے دہلی سے مجھے ایک خط لکھا، چونکہ اس خط سے احرار اور مولانا عبیداللہ سندھی کے مخلصانہ تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے درج کیا جاتا ہے، خط ملاحظہ ہو:

''دہلی 2\3\39، کنگ ناگرہ شو کمپنی۔

محترم بھائی خان کابلی صاحب، سلام مسنون!

مولانا عبیداللہ سندھی وطن واپس تشریف لا رہے ہیں، آپ ''خدّام الدین'' میں جا کر حضرت مولانا احمد علی سے مفصل معلومات حاصل کر کے میری طرف سے اخبارات میں اعلان کر دیں کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کراچی سے براستہ لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچیں، تو ہر اسٹیشن پر مجالسِ احرار اِن کا باقاعدہ طور پر شاندار استقبال کریں، بالخصوص ملتان، خانیوال، میاں چنوں، منٹگمری (ساہیوال) لاہور، امرتسر اور جالندھر ولدھیانہ۔

حضرت مولانا 5\3\39 کو ''المدینہ'' جہاز سے کراچی پہنچیں گے، اور اسی شام کو کراچی میل سے روانہ ہوں گے، 6\3\39 کی شام کو لاہور پہنچیں گے، اور اسی وقت فرنٹیئر میل سے دہلی روانہ ہو جائیں گے، میں نے مولانا محمد صادق صاحب کو کراچی خط لکھ دیا ہے کہ وہ بذریعہ تار مولانا کی روانگی کے متعلق آپ کو اور چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر کو لاہور مطلع کر دیں، یہ اعلان تمام انگریزی اور اُردو اخبارات میں شائع کرا دیں، تار پہنچنے پر پھر دوبارہ اعلان کرائیں، کیونکہ شاید مولانا بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچیں۔ والسلام۔ آپ کا بھائی حبیب الرحمٰن'' [1]

---

[1] مذکور الصدر واقعے کے ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل کے حوالے سے مذکور ہے کہ مولانا سندھی صاحب کی ہندوستان آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، اور دارالعلوم دیوبند اور

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

بزرگانِ احرار اور مولانا عبیداللہ سندھی کے تعلقات خصوصی طور پر صدرِ احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا مذکورہ خط روشن اور بیّن دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور راقم (خان غازی کابلی) دفتر مجلسِ احرارِ اسلام، ہند، واقع شاہ محمد غوث، بیرون دہلی دروازہ، لاہور، مستقل طور پر موجود رہا کرتے تھے، اور مخالفین کے خیال میں چودھری افضل حق احرار کے دماغ اور پالیسیاں بنانے والے تصور کیے جاتے تھے، اور مولانا حبیب الرحمٰن اور حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین کو مجلسِ احرارِ اسلام کے ''لاؤڈ سپیکروں'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا احمد علی کا بزرگانِ احرار کتنا لحاظ اور احترام کرتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

## ایک ناخوش گوار واقعہ اور میری معذرت

طویل جلاوطنی اور بڑھاپے نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے مزاج میں تیزی اور شدت پیدا کردی تھی، اس لیے اکثر وہ کرخت لہجے میں بے باکی کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے، کبھی کھلے سر رہتے، اور کبھی سر پر کھدر کا ٹوپ رکھ کر اور (کبھی) ننگے سر نماز پڑھنے کی باتیں کرنے لگتے تھے''۔ (ماہنامہ ''نورعلیٰ نور'' کراچی صفحہ نمبر ۱۷، ۱۸، صفر المظفر 1426 ہجری، مارچ، اپریل 2005 عیسوی، جلد نمبر 7، شمارہ 1,2، رئیس التحریر: مولانا عبدالرشید انصاری، مسجد عائشہ صدیقہ، نارتھ، کراچی)

---

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبا ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے، مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعے اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن وفکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کردی تھی، اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار وخیالات کا اظہار کرنے لگے، عقیدت مندوں کا یہ جمگھٹا ہٹتا گیا، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیۃ العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

www.idaraghufran.org

ملاحظہ فرمایے کہ شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب نے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے ان افکار وخیالات سے اختلاف کا اظہار کیا، جو اہلِ علم حضرات نے محسوس کیے، اور مولانا سندھی صاحب کے ان خیالات وافکار کا سبب حوادثات ومصائب ہونے، اور طویل جلاوطنی اور بڑھاپے کے سبب مزاج میں تیزی اور شدت پیدا ہونے اور اس کے بعض آثار کا بھی ذکر کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا:

''اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے مقام ومرتبہ میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے، یا حضرت کے معاصرین اور بعدھم، اکابرین میں ان کا اکرام روبہ تنزل ہوگیا تھا، ہرگز نہیں۔''

یہ بات حضرت مدنی کے مضمون وبیان کے مطابق ہے، کیونکہ اس میں بھی بنیادی طور پر ان ہی چیزوں کا دوسرے انداز میں ذکر ہے، اور چند جزوی چیزوں میں اختلاف سے اصل اور بنیادی موقف مختلف نہیں ہوجایا کرتا، جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں۔

لیکن فاضل ناقد صاحب کی مرتب کردہ کتاب میں مذکورہ ماہنامہ ''نورعلیٰ نور'' کے صفحہ نمبر 17 سے شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب کی عبارت کا درجِ ذیل جملہ:

''بعض امور میں حضرت سندھی کے افکار وخیالات جمہور علماء کے موقف ومسلک سے تفرد وتمیز کا پہلو لیے ہوا کرتے تھے''۔

نقل کرنے کے بعد مذکور ہے:

''حضرت سندھی کے تفردات سے نہ کسی نے انکار کیا، اور نہ انکار کی گنجائش ہے، البتہ ان تفردات کی تعیین اور نوعیت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر مذکورہ محققین سے قطعی مختلف ہے''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۶۷۹)

مولانا سندھی صاحب کے تفردات کے تعین اور نوعیت کے متعلق نقطۂ نظر مذکورہ محققین سے مختلف ہونے کا مطلب اگر یہ ہو کہ مولانا سندھی صاحب کی تحریرات اور تقاریر وکلام میں جو

باتیں سیاسی یا اجتہادی نوعیت کے اختلاف پر مبنی ہوں، ان کا تو مولانا سندھی صاحب کی طرف صحیح منسوب ہونا تسلیم کیا جائے، اور جو باتیں مذہبی، دینی نظریاتی وفکری یا غیر اجتہادی نوعیت کی ہوں، اور ان کو اجتہادی اعتبار سے صواب قرار دینا مشکل ہو، ان کو مولانا سندھی کے بجائے، ان کے ناقلین اور املا کرنے والوں کی فکر قرار دیا جائے۔

تو مستند و معتبر ذرائع اور متعدد مشاہدات وتحریرات سے اس کی طرف ہمارا رجحان نہ ہوسکا۔

چنانچہ حضرت مدنی نے اپنے بیان ومضمون میں صاف فرمایا ہے:

''ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہوجانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا''۔

نیز حضرت مدنی نے فرمایا:

''بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔

حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کے دماغی انقلاب واختلال کو سیاسیات سے علمی و مذہبی تقاریر وتحریرات تک بھی متجاوز ہونا بیان فرمایا ہے۔

نیز مولانا سندھی صاحب کی تحریر اور کلام کو اصول اور مسلّماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور

عقائد واعمالِ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے زرّیں قواعد پر پرکھ لینے، اوراسی کسوٹی پر کس لینے سے پہلے مولانا سندھی صاحب کے کسی کلام کو، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھنے کی درخواست کی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا احمد علی لاہوری صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی، اور مسلکِ اسلاف سے نکلنا جرمِ عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انھیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں۔ بعد از ہجرت جو اُن کے خیالات میں مذہباً یا سیاستاً تبدیلی آ گئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لیے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اوراسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے''.....فقط

احقر الانام احمد علی عفی عنہ

۲۳ جون ۱۹۴۶ء

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، جنوری 1965 عیسوی، رمضان المبارک 1384 ہجری، صفحہ ۶۸، ۶۹، جلد نمبر 95، بعنوان ''مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندوی'' درذیل ''آثارِ علمیہ وادبیہ'')

مولانا لاہوری نے بھی، مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات میں بعد از ہجرت مذہبی یا سیاسی اعتبار سے تبدیلی آنے اوران سے متفق نہ ہونے اوراس زمانے سے پہلے کتاب وسنت اور مسلکِ اسلاف پر مبنی ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ متفق ہونے کی صراحت فرمائی۔

جو اہلِ علم حضرات، بعض محدثین کے آخری دور کے اختلاطِ عقل پر مطلع ہوئے، انھوں نے بھی

www.idaraghufran.org

یہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے بعد کے زمانہ کی ایسی مرویات کو قبول نہیں کیا، جو شاذ و متنازع نوعیت کی یا اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

اس کے علاوہ مولانا احمد علی لاہوری کے متعلق آگے آتا ہے کہ وہ اجتہادی و فقہی امور میں کافی توسّع رکھتے تھے، اگر ان کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے افکار و خیالات اسی اجتہادی و اختلافی نوعیت کے ہوتے، تو وہ اپنے استاذ و مربی کے ساتھ اتنا سخت اختلاف کیوں فرماتے، جس کی وجہ سے ان کے استاذ و مربی ان سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

اس قسم کی صراحتوں سے مذکورہ نقطۂ نظر کے بجائے ان محققین حضرات کا موقف عدل و انصاف پر مبنی ہونا معلوم ہوتا ہے، جن کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کے بجائے، ناانصافی اور ظلم کا ارتکاب کرنے کا الزام دیا جاتا ہے۔

پس ہماری نظر میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق مذکورہ محققین حضرات کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ اصولِ شریعت کی اتباع اور عدل و انصاف کر کے سعادت حاصل کرنے والا ہی شمار کیا جائے گا، نہ کہ ظلم کرنے والا، اگرچہ دوسرے حضرات کی نظر میں یہ محققین حضرات ناانصافی اور ظلم کرنے والے کیوں نہ شمار ہوتے ہوں، اپنے موقف کے وہ دوسرے حضرات خود ذمہ دار ہیں، جیسا کہ ماسبق سے معلوم ہوا، اور آگے بھی مفصل و مدلّل طریقے پر آتا ہے۔

آنے والے صفحات میں اس سلسلے میں ذکر کیے جانے والے شبہات و اعتراضات اور تنقیدات و الزامات کا الگ الگ فصلوں میں تحقیقی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ افراط و تفریط اور ظلم و ناانصافی اور تعدی کے پہلوؤں اور تعصّب و تحزّب سے بچ کر اعتدال و انصاف اختیار کرنے اور اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

www.idaraghufran.org

## (فصل نمبر 1)

# حضرت مدنی کے بیان کے جھوٹا ہونے کا الزام

**فاضل ناقد، ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے حوالے سے حضرت مدنی کا بیان ومضمون نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:**

راقم الحروف کی رائے ابھی تک یہی ہے کہ یہ مضمون حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا نہیں ہے، کیونکہ اس کے بعد ''نقشِ حیات'' تصنیف ہوئی، جس میں حضرت سندھی رحمہ اللہ پر قلم توڑ دیے گئے۔ (''یادگارِ اکابر'' کراچی، صفحہ ۹۲۹)

**فاضل ناقد اپنے ایک دوسرے مضمون میں جو ماہنامہ ''الجمعیۃ'' راولپنڈی کے جولائی اور اگست 2017 عیسوی کے شماروں میں ''جماعتِ دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' کے عنوان سے شائع ہوا، لکھتے ہیں:**

''حضرت سندھی اور حضرت شیخ الاسلام کے تعلقات میں غلط فہمی پیدا کرائی گئی ہے، تھی نہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ یہ غلط فہمی پیدا کرانے میں بعض بزرگوں کا عظیم کردار ہے۔

ایک مضمون جو حضرت شیخ الاسلام کی طرف منسوب ہے، اس میں حضرت سندھی کی تعریف میں قلم رواں ہے۔

اور اسی مضمون کے آخر میں یہ کہ حضرت سندھی کی باتوں کا اعتبار نہیں، اس لیے اسے اپنے بزرگوں کی باتوں سے پرکھ لیا جائے۔

اور ایک جگہ یہ بھی آ گیا کہ حضرت سندھی کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ (العیاذ باللہ)

یہ مضمون "البلاغ" "انوار مدینہ "اور دیگر رسائل میں چھپا تھا۔ (حضرت شیخ الاسلام سے منسوب یہ مضمون ۲ ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء ''مدینہ'' بجنور میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا، البلاغ اور انوار مدینہ میں اسے نقش ثانی کے طور پر شائع کیا گیا تھا) "البلاغ "کے مدیر

محترم نے اپنے رسالے میں اس مضمون کو پورے آب وتاب کے ساتھ چھاپا، پھر یہی مضمون حضرت شیخ الاسلام کے متوسلین نے ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور میں چھاپا۔ اس وقت راقم الحروف نے اس عمل اشاعت پر سخت ردعمل اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا جو کہ ''انوار مدینہ'' کے مدیر محترم کی مہربانی سے ''انوار مدینہ'' میں شائع ہو گیا تھا، ساتھ ہی مدیر محترم کا جواب بھی شائع ہوا تھا جو میرے ردعمل سے مطمئن نہیں تھے اور شاید آج بھی نہ ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں اس ردعمل سے اب تک مطمئن ہوں۔ اس میں میں نے لکھا تھا کہ:

"حضرت شیخ الاسلام کی یہ تحریر اگر تسلیم کر لی جائے تو نقش حیات جو حضرت نے ۱۹۵۰ء کے بعد تحریر فرمائی ہے، اس میں حضرت سندھی کی عظمت پر قلم توڑ دیے ان کی عظمت وخدمات کو خوب خوب تحریر فرمایا ہے جو ستر صفحات سے زائد پر مشتمل ہے۔ تو پہلی تحریر کا اعتبار نہیں رہا، وہ منسوخ سمجھی جائے۔ "

لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تحریر جس کو بنیاد بنا کر حضرت سندھی پر کیچڑ اچھالا جا رہا ہے، یہ تحریر حضرت شیخ الاسلام کی تھی ہی نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کے تلمیذ اور مسترشد حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اس کے راوی ہیں کہ جب حضرت شیخ الاسلام کی طرف منسوب مضمون ''مدینہ اخبار بجنور'' میں چھپا، تو میں دہلی گیا اور حضرت مرشد شیخ الاسلام سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اور عرض کیا کہ حضرت آپ نے یہ مضمون حضرت سندھی کے خلاف کیسے لکھ دیا؟ تو حضرت شیخ الاسلام نے نہایت تعجب سے فرمایا: میں نے اور مخالفت میں مضمون لکھا؟ میں نے تو ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا۔ وہاں پنجاب کے کچھ علماء آئے تھے، انھوں نے کچھ کاغذات دکھا کر دستخط لیے تھے اور بس، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہی یہ مضمون میری طرف منسوب کیا ہو۔ (یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے کسی جگہ تحریر میں اب تک نہیں تھی، اب تحریر میں آ گئی)''۔

فاضل ناقد کا ہمیں جو درج بالا مضمون موصول ہوا، اس میں پروف ریڈنگ کی متعدد اغلاط ہیں۔

یہ فیصلہ تو فرما دیا گیا کہ حضرت سندھی اور حضرت شیخ الاسلام کے تعلقات میں غلط فہمی پیدا

کرادی گئی تھی، اصل میں یہ غلط فہمی نہیں تھی، جس میں بعض بزرگوں کا عظیم کردار تھا۔

لیکن جن بزرگوں کی طرف غلط فہمی پیدا کرنے میں عظیم کردار ہونے کی نسبت کی گئی، ان کا نام ذکر نہیں کیا گیا، اور نہ ہی اس کا کوئی معتبر حوالہ پیش کیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مدنی نے اپنے مضمون و بیان میں مولانا سندھی صاحب سے متعلق اخبارات میں مختلف مضامین شائع ہونے اور بحث ومباحثہ کی گرم بازاری کی صورت میں قولِ فیصل کے طور پر اپنا مشاہدہ بیان فرمایا ہے، جس میں انھوں نے کسی بزرگ کا حوالہ نہیں دیا، مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں اور حجاز کے قیام اور ہندوستان واپسی کے بعد کے زمانہ کی جو قلبی ودماغی حالت کا حضرت مدنی نے ذکر فرمایا، وہ بھی حضرت مدنی کا اپنا مشاہدہ و فیصلہ ہے، حضرت مدنی کے علاوہ متعدد مشاہدہ کار حضرات بھی اس کی تائید کرتے ہیں، البتہ اس سلسلے میں حضرت مدنی کو اخبار ورسائل وغیرہ میں بیان دینے کی طرف کسی نے متوجہ کیا ہو، تو الگ بات ہے، لیکن اس کے باوجود اس بیان ومضمون میں رائے حضرت مدنی کی اپنی ہی مذکور ہے، اور حضرت مدنی کا یہ بیان ومضمون مبنی بر حقیقت ہے، جس پر مولانا سندھی صاحب کے معتقدین ومحبّین اور دیگر معتمد ومستند حضرات کی بڑی جماعت کا اتفاق ہے، جیسا کہ تفصیلاً آگے آتا ہے۔ اور حضرت مدنی کا اصل بیان اور اس کی تفصیل وتوضیح بھی آگے آتی ہے۔

فاضل ناقد اپنے مذکورہ مضمون ہی میں مزید لکھتے ہیں:

> اس (مولانا مدنی کے) مضمون کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ یہ مضمون جو حضرت سندھی کی وفات کے بعد لکھا گیا، اس میں بعض جگہ صیغے ماضی کے بجائے حال کے لکھے گئے۔
>
> ایک مثال ملاحظہ فرمایے:
>
> "مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت جس کو ہم پہلے

مشاہدہ کرتے تھے سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں، بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور فرماتے رہتے ہیں۔" (مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار کی شرعی حیثیت، مشمولہ مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار الخ۔ص ۹۷)

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے، سب حال کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

یہ مضمون ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا، اور حضرت سندھی کا وصال ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو ہو چکا۔ سات مہینے بعد یہ مضمون لکھا اور چھاپا گیا۔ کیا اس وقت حضرت سندھی کی روح ان کے سامنے تھی جنھوں نے حضرت شیخ الاسلام کے کندھے پر رکھ کر یہ حرکت انجام دی؟

دوسری بات یہ کہ حضرت سندھی جلاوطنی کے زمانے میں صفر المظفر ۱۳۴۵ھ، اگست ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ پہنچے اور ۸ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ، ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء تک حجاز میں رہے جو تقریباً تیرہ سال کا عرصہ ہے۔

حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقائے کرام حضرت شیخ الاسلام وغیرہ کو گرفتار کر کے ۱۳۳۵ھ دسمبر ۱۹۱۶ء میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ تین سال سات مہینے کے بعد انھیں بمبئی پہنچا کر ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ، ۸ جون ۱۹۲۰ء کو رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کی وفات ہوگئی، حضرت شیخ الاسلام باوجود خواہش کے مدینۂ منورہ واپس نہ جا سکے۔ اس میں حضرت شیخ الہند کا حکم آڑے آیا، حضرت شیخ الاسلام ہندوستان ہی کے ہو کر رہ گئے اور حضرت شیخ الہند کے جانشین کی حیثیت سے مشن شیخ الہند کو تکمیل تک پہنچایا۔

حضرت شیخ الاسلام نے مالٹا سے رہائی کے بعد ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء میں حج کا ارادہ فرمایا۔ یقیناً اس سفر میں حضرت سندھی اور حضرت شیخ الاسلام کی ملاقات ہوئی ہوگی، لیکن حضرت شیخ الاسلام اور ان کے سیرت نگار اس سلسلے میں خاموش ہیں، لیکن مذکورہ اور متنازع بیان میں آپ دیکھ چکے کہ یہ فرمایا جا رہا ہے "مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز پہنچتے ہیں اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے تو.....الخ "

قابل تعجب ہے، اس لیے کہ نقش حیات میں حضرت شیخ الاسلام ایسی کوئی بات نہیں لکھتے۔

حضرت شیخ الاسلام کو یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ ضروری باتوں کو چھپا لیتے ہوں گے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ فاضل ناقد کے نزدیک حضرت مدنی کی طرف منسوب یہ مضمون جھوٹا ہے، بلکہ یہ حضرت مدنی کا سرے سے ہے ہی نہیں۔

ہم نے اس شبہ کا اپنی کتاب ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے دوسرے ایڈیشن کے ضمیمہ میں جواب تحریر کر دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت مدنی کا یہ مضمون و بیان دارالعلوم دیوبند کے صدر اور جماعتِ دیوبند کے زعیم ہونے کی حیثیت سے حضرت مدنی کی حیات میں سب سے پہلے سہ روزہ ''مدینہ بجنور'' میں 17 مارچ 1945ء کو شائع ہوا۔ [1]

جس کے بعد حضرت مدنی کا یہ مضمون اسی زمانہ میں اگلے ماہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے شمارہ اپریل 1945 عیسوی کو بھی شائع ہوا تھا، اور یہ ماہنامہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا، اور اہلِ علم حضرات کو یہ بات معلوم ہے کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا سندھی صاحب کے معتقد اور ان کا دفاع کرنے والے تھے، بلکہ بقول پروفیسر سرور

---

[1] ملحوظ رہے کہ ''مدینہ'' اخبار کے بانی مولوی مجید حسن ہیں، جنھوں نے یکم مئی 1912ء کو اسے ہفتہ وار اخبار کی شکل میں ''بجنور، انڈیا'' سے جاری کیا، تقریباً پانچ سال بعد یکم جنوری 1917ء سے یہ اخبار ہفتہ وار کے بجائے سہ روزہ ہو گیا۔

''مدینہ'' اخبار کے ایڈیٹروں کی فہرست میں علی الترتیب، حافظ نورالحسن ذہین، آغا رفیق بلند شہری، مولانا مظہرالدین شیر کوٹی، مولوی نصیرالحق دہلوی، مولوی احقاد حسین بریلوی، حافظ علی بہادر خاں مرادآبادی، شاہ خلیل الرحمٰن بہاری، قاضی محمد عباس، قاضی بدرالحسن جلالی، مولوی امین احمد اصلاحی، مولانا مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری، مولوی شبیر احمد چاندپوری، مولوی نورالرحمٰن بچھرانوی، ابوسعید بزمی، حمید حسن فکر، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی، قدوس صہبائی، مولانا حامد اللہ انصاری غازی، ضیاء الحسن فاروقی اور سعید اختر، جیسے مشہور اہل قلم اور صحافی ہوئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: مضمون: جنگ آزادی اور مدینہ اخبار بجنور۔ مضمون نگار: عابدالرحمٰن بجنوری، ''ویب سائٹ: فیضانِ دین'')

(http://faizanedeen.blogspot.com/2013/02/blog-post_24.html)

www.idaraghufran.org

صاحب کے وہ اس سلسلے میں علماء کی جماعت میں تنہا شخص تھے۔ [1]

نیز مولانا عبد الماجد دریابادی نے ''صِدق'' 12/ اپریل 1945ء، میں بھی حضرت مدنی کے اس مضمون کا ایک حصہ شائع کیا تھا۔

اس کے تقریباً بارہ سال بعد تک حضرت مدنی حیات رہے، اس کے بعد بھی حضرت مدنی کی یہ تحریر متعدد اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئی، یہاں تک کہ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ اور حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبد القدوس قاسمی صاحب نے بھی ''مولانا عبید اللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' کے اندر 1946 عیسوی میں اس کو شائع کیا تھا، یہ ڈائری ''ادبستان''، لاہور سے شائع ہوئی تھی، اس وقت بھی حضرت مدنی بقیدِ حیات تھے، اور انھوں نے خود بھی اس ڈائری کو ملاحظہ کیا تھا، اور اس کے حوالہ جات ''نقشِ حیات'' میں نقل فرمائے تھے۔

حضرت مدنی کا وصال 1957 عیسوی میں ہوا۔

اگر حضرت مدنی نے اس تحریر کی اشاعت کے بارے میں لاعلمی بلکہ اس سے بڑھ کر اپنا مضمون نہ ہونے کا اظہار فرمایا تھا، تو سوال یہ ہے کہ جب حضرت مدنی کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے نام سے مولانا سندھی صاحب کے بارے میں ایک جعلی اور جھوٹا مضمون ''مدینہ اخبار'' میں چھپا ہے، تو انھوں نے تحریری طور پر اس کی تردید کیوں نہیں کی، وہ اپنی تردید جمعیت

---

[1] چنانچہ پروفیسر سرور صاحب لکھتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اور ان کا پوری طرح شخصی احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اور اذیتیں اٹھا اٹھا کر ان کا دماغ چل گیا ہے۔ اس میں البتہ صرف ایک ذات مستثنیٰ ہے، اور وہ ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کی۔ انھوں نے مولانا سندھی کے پیام کو سمجھا، اس کی نشر و اشاعت کی اور مولانا کا زبردست دفاع کیا۔ ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے نہایت جارحانہ تبصرے کا مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بڑا مفصل جواب دیا، جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ گیا ہے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعات میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

www.idaraghufran.org

علمائے ہند کے ترجمان ''الجمعیۃ'' دہلی یا کسی اور مستند اخبار یا رسالہ مثلاً ''برہان'' میں شائع کرا سکتے تھے۔

پھر اس کے بعد اس تحریر کو متعدد مستند اکابر و اہلِ علم اور اہلِ قلم و اہلِ فکر حضرات کی طرف سے باحوالہ نقل کیا جاتا رہا، اور اس کی تصدیق و توثیق کی جاتی رہی۔

مولانا عبدالحمید سواتی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم و افکار'' میں حضرت مدنی کی اس تحریر کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تردید نہیں کی۔

پھر ماہنامہ ''الولی'' حیدرآباد کا ایک شمارہ 1994ء میں ''مولانا عبیداللہ سندھی نمبر'' کے طور پر شائع ہوا تھا، جس کے مرتب معروف محقق اور مولانا سندھی صاحب کے مداح ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب ہیں، اس نمبر میں مولانا منظور نعمانی صاحب نے بھی حضرت مدنی کی اس تحریر کا ذکر فرمایا ہے۔

اس کے علاوہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مدیران اور اس مضمون کو نقل اور ارسال کرنے والے حضرات نے خود اس مضمون کی تصدیق اور اس کے اصل ماخذ کا بھی ذکر فرمایا ہے جو کہ مستند و معتبر حضرات ہیں۔

اہلِ علم حضرات نے مولانا سندھی صاحب کی خدمات کا جن مواقع پر تذکرہ کیا ہے، اور ان متنازع افکار پر سکوت اختیار کیا ہے، وہ بھی اپنی جگہ درست ہے، اور جن مواقع پر مولانا سندھی صاحب کے بعض افکار کی تغلیط و تردید کی ہے، وہ بھی اپنی جگہ درست ہے، اور کسی جگہ کے کلام کو اس سکوت پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، جو کسی مصلحت پر مبنی ہو۔

چنانچہ حضرت مدنی نے اپنی کتاب ''نقشِ حیات'' میں تاریخی مضمون کی حیثیت سے مولانا سندھی صاحب کے سوانحی حالات کے ذکر کی ضرورت سمجھی، تو ان کا ذکر فرمادیا، اور تاریخی ضرورت کے پیشِ نظر مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری سے حالات و واقعات کو بھی نقل فرمادیا۔

www.idaraghufran.org

اگر اس موقع پر مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے اس ذاتی و شخصی، قلبی و دماغی انقلاب کے عارضے اور دماغی توازن کھو بیٹھنے، صبر و تحمل، حلم و بردباری وغیرہ کے جواب دے دینے، فکر وغور اور جودتِ طبع کے کافور اور رخصت ہونے، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہونے، چیخنے چلانے، غصہ آنے، باتیں بہت زیادہ کرنے، ایک ہی مجلس میں متضاد باتیں و متخالف امور فرمانے، اور دماغی توازن پر کاری اثر پڑنے، اور علمی و مذہبی تقاریر اور تحریرات میں بھی اختلال پیدا ہونے اور اس کے مولانا سندھی صاحب کے اعتراف کرنے اور مولانا سندھی صاحب کے افکار کو شریعت کے اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے وغیرہ کا ذکر کیا جاتا، جس کا سبب مولانا مدنی کے نزدیک خاص حالات وعوارض ہیں، تو یہ بے محل ہوتا، اور حضرت مدنی کا ''نقشِ حیات'' میں مولانا سندھی صاحب کے قیمتی سرمایۂ زندگی کا نقشہ کھینچنا اور ان کی اعلیٰ خدمات واوصاف کا ذکر کرنا اور اس تاریخ کو بیان کرنا مقصود تھا، وہ فوت ہو جاتا، جیسا کہ ظاہر ہے۔

البتہ حضرت مدنی نے جہاں اس دماغی انقلاب کی بنیاد پر سرزَد ہونے والی غیر معتدل اور غیر متوازن باتوں سے بعض لوگوں کے بے راہ روی میں مبتلا ہونے اور اس کا چرچا ہونے کا خدشہ محسوس کیا، وہاں اخبار وغیرہ کے ذریعے اپنا بیان دے کر اس کا سدِ باب بھی فرما دیا۔

ایک بڑی شخصیت سے کسی خاص حالت میں بعض متنازع افکار کے صدور کے بعد عام حالات میں عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ اس سے سکوت اختیار کیا جائے، اور بلاضرورت اس کا جابجا چرچا اور اس کی تشہیر نہ کی جائے۔

پھر اگر مولانا سندھی صاحب کے حوالے سے متنازع افکار کا سلسلہ آگے نہ چلتا، تو شاید ان متنازع افکار کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، جیسا کہ حضرت مدنی نے اپنے بیان کے شروع میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

حضرت مدنی اپنے بیان میں فرماتے ہیں:

''ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہورہے ہیں، جس کی بناء پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کردیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کی روشنی کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں''۔

نیز مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:

''قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے، پھر گو وہ خود اس دنیائے دَنی سے رخصت ہوگئے، مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لیے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے، تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی، اوراس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے اندر بڑا جوش تھا'' (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۱۹ و ۲۲۰، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

اعتدال اور موقع ومحل کے اعتبار سے حکمت اسی کو کہا جاتا ہے، جس کی ایک مبلغ اور دین کے داعی کو سخت ضرورت ہوتی ہے، لقولہٖ تعالیٰ:

''اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ''

موجودہ زمانے میں جب کہ کچھ طبقات کی طرف سے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متضاد وشاذ افکار وخیالات کی تبلیغ وتشہیر اور مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار پر مبنی تحریرات کی اشاعت کا سلسلہ تیزی کے ساتھ شروع ہوا، اوراس کے لیے باقاعدہ ایک

تحریک وتنظیم کی شکل اختیار کرلی گئی، تو اس کی حقیقت کو واضح کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت پیش آئی، جس کے لیے مختلف اہلِ علم واہلِ قلم حضرات نے فریضہ سرانجام دینے کا اہتمام کیا، اور ہم نے اسی مقصد کے لیے اپنی کتاب میں مختلف مضامین کو جمع کرکے شائع کیا۔

اس موقع پر بڑا اشکال یہ ہے کہ حضرت مدنی کی یہ تحریر سرے سے جھوٹی ہے، جس کے لیے حضرت مدنی کے نام کو گویا کہ استعمال کیا گیا ہے۔

اس لیے آگے حضرت مدنی کی تحریر کے ثبوت کے سلسلے میں چند توضیحات وتصریحات پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت مدنی کی اصل تحریر باحوالہ ان شاء اللہ تعالیٰ آگے دوسری فصل میں ذکر کی جائے گی۔

## مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی تصریح

پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ اور حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب (زیارت کاکا صاحب، ضلع پشاور) نے ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' کو حضرت مدنی کی حیات میں 1946 عیسوی میں ''ادبستان، لاہور'' سے شائع کرایا تھا۔

اس کا ایک نسخہ الحمدللہ تعالیٰ ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ڈائری کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

### ذاتی ڈائری

### مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبیداللہ سندھی کی مختصر سوانح حیات، جو انھوں نے ہندوستان روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پیش تر مکہ معظّمہ میں خود قلم بند کی۔

www.idaraghufran.org

مولانا حسین احمد مدنی کا ایک بیان، جو مولانا سندھی کی سیرت پر ایک دوست اور رفیق کی بلند پایہ تنقید ہے۔

رولٹ کمیشن کی رپورٹ کا وہ حصہ جو حضرت شیخ الہند کی تحریک اور مولانا سندھی کی جدوجہد سے متعلق ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا خودنوشت سفرنامۂ کابل

---

اس ڈائری کی سرورق کی عبارت سے حضرت مدنی کے بیان کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔

پھر اس ڈائری کے ''دیباچے'' میں خود اس ڈائری کے مرتب اور حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

سفرنامہ کے ساتھ مقدمہ کے طور پر تین اور چیزیں شامل کی گئی ہیں، پہلی چیز مولانا سندھی کی مختصر سوانح ہے، جو انھوں نے ہندوستان روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے مکہ معظّمہ میں قلم بند کی، اور ان کے ہندوستان پہنچنے پر اخبارات میں شائع ہوئی، ہندوستان پہنچنے کے بعد کے کچھ مختصر حالات بطور تتمہ مرتب نے بڑھائے ہیں۔

دوسری چیز مولانا حسین احمد مدنی صاحب کا ایک بیان ہے، جو مولانا سندھی کی وفات کے بعد ان کے بعض امالی سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے انھوں نے شائع فرمایا تھا، یہ بیان مولانا سندھی کی سیرت پر ایک دوست اور رفیق کی بلند پایہ تنقید ہے، اور اس سے سفرِ کابل کے متعلق چند گوشوں کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

تیسری چیز رولٹ کمیشن کی رپورٹ کا وہ حصہ ہے، جو حضرت شیخ الہند کی تحریک اور مولانا سندھی کی جدوجہد سے متعلق ہے، کئی مواقع پر غلط ہونے اور صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے باوجود اس بیان سے مولانا سندھی کے سفرِ کابل کے متعلق کافی معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔ (ذاتی ڈائری، صفحہ ۶، ۷، ناشر: ادبستان، بیرون

www.idaraghufran.org

موچی دروازہ، لاہور، بارِاول: اکتوبر 1946 عیسوی)

اس عبارت سے بھی حضرت مدنی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے، جس میں ذاتی ڈائری کو پہلی مرتبہ ترتیب دے کر شائع کرنے والی شخصیت نے واضح کر دیا ہے کہ حضرت مدنی کا یہ بیان مولانا سندھی کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا۔

اس کی وجہ مولانا سندھی کے امالی سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ تھا، جو بلند پایہ تنقید ہے۔

اس بیان سے مولانا سندھی صاحب کے ہندوستان سے کابل اور اس کے بعد کے اسفار کے ایسے گوشوں کی مزید وضاحت ہوتی ہے، جو خود مولانا سندھی کے اپنے بیان سے نہیں ہوتی۔

اس ڈائری میں ہی مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

> الغرض یہ تمنائیں لے کر وہ (یعنی مولانا عبیداللہ سندھی) مارچ 1939 عیسوی میں ہندوستان کے ساحل پر اترے، کراچی، لاہور، دیوبند اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا، قوم کو ان سے اور ان کو قوم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مولانا کے عقیدت مندوں میں وہ لوگ بھی تھے، جو مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحمید صاحب کے واسطے سے ان کی تفسیر قرآن سے متاثر ہوئے تھے، اور وہ بھی تھے جن کو ان کے سیاسی رجحانات اور ماضی کے رجحانات کی وجہ سے ان سے عقیدت تھی، چنانچہ مولانا کی آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، اور دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبہ ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے، مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعے اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن وفکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی تھی، اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار وخیالات کا اظہار کرنے لگے، عقیدت مندوں کا یہ جمگھٹا ہٹتا گیا، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیت العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب

سمجھا، جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیت العلمائے صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس، اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی اور عام شاہ راہوں سے الگ ہو گئے۔

مولانا جوشیلے مجسمۂ انقلاب تو تھے ہی ''چراغِ سحری'' ہونے کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا کر دی تھی، اور ہر اس نظام کو فوراً توڑنے کے حق میں تھے، جو ان کے خیال اور ان کے مطالعے کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لیے مفید نہ تھا، وہ کانگریس کی ''مذہبی'' قیادت اور دیگر اسلامی جماعتوں کی ''قدامت پسندی'' سے نالاں تو تھے ہی، خاکسار تنظیم کی حمایت، سرسکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشترا کی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا۔

مولانا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولانا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابلِ قبول ہیں، جب اصولِ دین سے ان کی مطابقت مسلّم ہو جائے''۔ (ذاتی ڈائری، صفحہ ۳۲ تا ۳۴، ناشر: ادبستان، بیرون موچی دروازہ، لاہور، بارِ اول: اکتوبر 1946 عیسوی)

اس عبارت سے بھی حضرت مدنی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے، نیز اسی ڈائری میں حضرت مدنی کا وہ مکمل بیان بھی شائع ہوا ہے، جو تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

ملحوظ رہے کہ یہ ''ذاتی ڈائری'' وہی کتاب ہے، جس کے حوالے سے حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' میں مولانا سندھی صاحب کے حالات نقل فرمائے ہیں۔

ان تمام امور سے فاضل ناقد کی اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ یہ بیان حضرت مدنی کی طرف

www.idaraghufran.org

جھوٹا منسوب ہے۔

## مولانا لغاری، اور غلام مصطفیٰ خان صاحبان کی تصریح

جناب مولانا عبداللہ لغاری صاحب اور جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے صفحہ 15 پر لکھتے ہیں:

''اس کے بعد کے حالات مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے شامل کیے ہیں''۔

پھر انہوں نے ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ہندوستان میں آمد اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات'' کے ضمن میں مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی ڈائری کے حوالے سے مذکورہ عبارت ہی نقل کی ہے۔

تصدیق وتائید کے طور اس کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمایئے، جن میں ذاتی ڈائری کے الفاظ سے ایک آدھ لفظ کی پروف ریڈنگ والی غلطی کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں:

الغرض یہ تمنائیں لے کر وہ (یعنی مولانا عبیداللہ سندھی) مارچ 1939 عیسوی میں ہندوستان کے ساحل پر اترے، کراچی، لاہور، دیوبند اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا، قوم کو ان سے اور ان کو قوم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مولانا کے عقیدت مندوں میں وہ لوگ بھی تھے، جو مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحمید صاحب کے واسطے سے ان کی تفسیر قرآن سے متاثر ہوئے تھے، اور وہ بھی تھے جن کو ان کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے ان سے عقیدت تھی، چنانچہ مولانا کی آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، اور دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبہ ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے، مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعے اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن وفکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی تھی، اور جوں جوں مولانا اپنے

مخصوص افکار وخیالات کا اظہار کرنے لگے، عقیدت مندوں کا یہ جمگھٹا ہٹتا گیا، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیت العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا، جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیۃ العلمائے صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس، اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی اور عام شاہ راہوں سے الگ ہو گئے۔

مولانا جوشیلے مجسمۂ انقلاب تو تھے ہی ''چراغِ سحری'' کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا کر دی تھی، اور ہر اس نظام کو فوراً توڑ دینے کے حق میں تھے، جو ان کے خیال اور ان کے مطالعے کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لیے مفید نہ تھا، وہ کانگریس کی ''مذہبی'' قیادت اور دیگر اسلامی جماعتوں کی ''قدامت پسندی'' سے نالاں تو تھے ہی، خاکسار تنظیم کی حمایت، سر سکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشترا کی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا۔

اور مولانا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولانا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابلِ قبول ہیں، جب اصولِ دین سے ان کی مطابقت مسلّم ہو جائے''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۱۷ و ۱۸، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

آگے مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کے حوالے سے آتا ہے کہ انھوں نے خود بھی مولانا

www.idaraghufran.org

سندھی صاحب کے فلسفے کی تفصیلات سے اختلاف کیا ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص اور معتمدِ خاص کی نقل کردہ مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے ہجرت سے وطن واپسی کے بعد ان کا مختلف مذہبی وسیاسی جماعتوں اور افراد نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا، لیکن جوں جوں مولانا سندھی صاحب کے اپنے وطن اور اہلِ وطن سے دور، پچیس سالہ مطالعے وتدبر کے مخصوص افکار وخیالات سامنے آتے گئے، اسی کے ساتھ ساتھ عقیدت مند افراد پیچھے ہٹتے گئے، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیت العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے اپنی خدمات کو ان سے الگ کرلیا، اور حضرت مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد یہ اظہار کرنا پڑا کہ ان کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی، اور ان کی طرف منسوب افکار اصولِ دین سے مطابقت ہونے کی صورت میں ہی قابلِ قبول ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مدنی کا مولانا سندھی صاحب سے متعلق یہ اعلان وبیان مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد ہی شائع ہوا تھا، لہٰذا اس پر اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں۔

مذکورہ تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب، کانگریس اور دیگر اسلامی جماعتوں کی مذہبی قیادت سے تو نالاں تھے ہی، اس کے ساتھ ان کی طرف سے ''خاکسار'' تنظیم کی حمایت، اشتراکی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ، نیکر اور رومن رسم الخط کی تبلیغ وپرچار نے بھی ان کے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا تھا۔

اور مولانا سندھی صاحب کے دیرینہ وابستگان میں مولانا لاہوری وغیرہ کا بھی شمار ہوتا ہے، وہ بھی اس میں شامل ہیں، جیسا کہ ان ہی کے حوالہ سے آگے آتا ہے، نیز مولانا سندھی صاحب کے ان افکار واغلاط کی دیگر متعدد اہلِ علم حضرات نے بھی نشان دہی کی ہے۔

لہٰذا ان تاریخی حقائق کے انکار کو حقیقت وانصاف پسندی میں داخل سمجھا جانا مشکل ہے۔

یہ بھی ملحوظ رکھتے چلیے کہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے اصل مصنف بلکہ ذاتی

ڈائری کی املا لکھنے والے بھی مولانا عبداللہ لغاری صاحب ہیں، جو مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے معتمدِ خاص اور تلمیذِ خاص ہیں۔

''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' کو سب سے پہلے 1946ء کو پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ اور مولانا مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے شائع کیا تھا، اس وقت حضرت مدنی حیات تھے، اور بعد میں اس ڈائری کے حوالے مستند متعدد اہلِ علم واہلِ قلم حضرات نقل کرتے آئے ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی یہ ڈائری مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی حیات میں شائع نہیں ہوسکی تھی، اور اس کو سب سے پہلے مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے شائع کیا تھا۔

چنانچہ جناب مولانا عبداللہ لغاری صاحب اور جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب لکھتے ہیں:

''اب اس سے آگے ہم مولانا سندھی کی ڈائری لکھتے ہیں، جو چھپ چکی ہے، اس ڈائری کا قصہ یوں ہے کہ مولانا عبداللہ لغاری نے 1353 ہجری میں ایک روز مولانا (سندھی) سے مکہ مکرمہ میں عرض کیا کہ مہربانی فرما کر آپ نے کابل میں جو انقلابی کام کیا، اس کا مختصر حال مجھے املا کرادیں، اگرچہ مجھے اکثر واقعات یاد ہیں، لیکن میں خود لکھوں تو شاید غلطی کر جاؤں، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ لکھاتے جائیں اور میں لکھتا جاؤں، حضرت مولانا نے منظور فرمالیا، اور ڈائری کا مضمون املا کرایا۔

اس میں اکثر واقعات وہی ہیں، جو بعض لوگوں کو خصوصاً حکومتِ ہند کو معلوم تھے، لیکن بعض باتیں اشارۃً بھی لکھی ہیں، پھر وہ کتاب یا ڈائری میں نے ایک حاجانی عورت کو جو حج اکبری میں آئی تھی حوالے کردی، اور ان کو کہا کہ یہ ڈائری میرے گھر میں پہنچادینا اور میرے گھر والوں کو کہنا کہ اس کو نہایت احتیاط سے چھپا کر رکھیں (اس طرح وہ ڈائری میرے گھر پہنچ گئی، ناقل) پھر جب مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ

اللہ مارچ 1939ء میں واپس ہندوستان آئے، کئی دن کراچی میں رہ کر پھر دہلی، دیوبند اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے واپس سندھ میں تشریف لائے، تو ایک دن میرے پاس میرپور میں آ کر فرمایا کہ وہ ڈائری مجھ کو دے دو، ایک صوبہ سرحد کا آدمی جو یاغستان میں رہتا ہے، اس نے وعدہ کیا ہے کہ اس کو طبع کرا کر شائع کروں گا، میں نے عرض کیا مجھے نقل کر لینے دیں، آپ نے فرمایا کہ میں اب دہلی جانے والا ہوں، اور وقت تنگ ہے، اس وقت ریل تیار ہے، مجھے ڈائری دے دو، آخر میں نے وہ ڈائری ان کے حوالے کر دی، آپ لے کر چلے گئے، شاید آپ نے مولانا تسلیم الحق فاضل دیوبند زیارت کا کا صاحب کو دی تھی، انھوں نے اس وقت نہیں چھاپی، مولانا کی زندگی میں یہ شائع نہیں ہوئی، جب 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور پاکستان بن گیا، اس وقت انھوں نے مولانا عبدالقدوس قاسمی زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کو یہ ڈائری دی، اور انھوں نے اس کو شائع کیا۔

اس (مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی شائع شدہ ڈائری) میں بہت سی باتیں چھوڑ دی گئی ہیں، اور ترتیب کو بھی آگے پیچھے کر دیا ہے، اس وقت جس ترتیب سے یہ ڈائری چھپی ہے، اسی ترتیب سے ہم ناچار ہو کر لکھتے ہیں، اور جو اشارات ہیں، انھیں کھول کر بیان کریں گے، میرا حافظہ کم ہے، اس وقت میری عمر 90 سال کے قریب ہے، اور مولانا امام عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی وفات حسرت و یاس سے دل شکستہ ہے، اس لیے جو کچھ یاد ہے، اپنی یاد کے مطابق لکھتے ہیں"۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۴۰، ۴۱، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

نیز لکھتے ہیں:

www.idaraghufran.org

''اب ہم اس کے آگے ڈائری لکھتے ہیں، اس کی ترتیب وہی رکھیں گے جو کہ چھپی ہوئی ہے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آسانی ہو، اور اس میں جو بڑے بڑے رازوں پر اشارہ ہے، وہ کھول کر لکھیں گے۔

جس وقت یہ ڈائری لکھی گئی تھی، اس وقت ہندوستان غلام تھا، اور اس راز کو افشا کرنا مناسب نہ تھا، لیکن اگر ہم اب بھی اس کو ظاہر نہ کریں، تو یہ بڑی غلطی ہوگی''۔

(مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۴۲، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری کو ابتداً مولانا عبداللہ لغاری صاحب نے لکھا تھا، اور مولانا سندھی صاحب نے املاء کرایا تھا، اور یہ ڈائری پہلی مرتبہ مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد مولانا عبدالقدوس قاسمی نے شائع کی تھی، جس میں بعض چیزوں کا ذکر اشارتاً تھا، بعد میں مولانا عبداللہ لغاری صاحب نے اپنے حافظے کے مطابق ان کو ظاہر کیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ بات اصل ڈائری کے مضمون کے متعلق نہیں فرمائی، بلکہ اس کی شرح سے متعلق فرمائی، اور شرح میں بھی زیادہ سے زیادہ مسئلہ کو کھول کر بیان کیا۔

لہٰذا بعض حضرات کا یہ پہلو پکڑ کر بیٹھ جانا، اور اس کی بنیاد پر جو بات ان کی منشا و مدعا کے خلاف اس کتاب میں ہو، اس کا انکار کر دینا، اور جو بات ان کی منشاء و مدّعا کے موافق ہو، اس کو تسلیم کر لینا، یہ ''میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو'' والی بات ہی ہوگی۔

اور حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' میں مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی ذاتی ڈائری سے ہی مولانا سندھی صاحب کے اکثر حالات نقل فرمائے ہیں، جیسا کہ آگے آئے گا۔

پھر آگے مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کے حوالے سے اسی مذکورہ کتاب میں مذکور ہے کہ:

مولانا عبیداللہ کے فلسفے کی تفصیلات سے ہمیں بھی اختلاف ہے، مگر علم و حکمت کی

طرف دعوت میں وہ حق بجانب تھے۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۲۰، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

یہی عبارت مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی ''ذاتی ڈائری'' میں بھی صفحہ نمبر 38 پر موجود ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے فلسفے کی تفصیلات سے مولانا سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری کو ابتداً شائع و مرتب کرنے والے مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب وغیرہ کو بھی اختلاف تھا، اور ہمارے نزدیک یہ اختلاف ان ہی امور سے ہوگا، جن سے دیگر جمہور اہلِ علم حضرات کو تھا، اور اب بھی ہے، سوائے چند لوگوں کے۔

پھر اسی کتاب کے صفحہ 20 کے آخر میں ہے:

مولانا کے ابتدائی زمانے کے رسالے اور تصانیف اب ناپید ہیں، ہندوستان کے اس آخری قیام میں انھوں نے ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' اور ''شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ'' دو کتابیں لکھ کر شائع کیں، ایک اور کتاب ''محمودیہ'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، ایک اور اہم کتاب ''کتاب التمہید'' عربی ابھی قلمی ہے، اس کے علاوہ ان کے خطبات چھپے ہیں، اور ان کے افکار پر ایک بسیط کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی'' کے نام سے پروفیسر محمد سرور صاحب نے لکھی ہے، جو ان کے خیالات کو ایک مرتب شکل میں دکھانے کے لیے ایک کامیاب کوشش ہے (ان کی ایک تصنیف قرآن کی ضخیم تفسیر بھی ہے، جو مولانا لغاری کے قلم سے لکھی ہوئی ہے، محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ کے پاس محفوظ ہے)''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۲۰، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

www.idaraghufran.org

اس سے معلوم ہوا کہ پروفیسر سرور صاحب اور مولانا عبداللہ لغاری صاحب کی مذکورہ تصنیفات کو مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری اور ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے مصنفین ومرتبین نے بھی تسلیم کیا ہے، جب کہ مذکورہ کتابوں میں متنازع وشاذ افکار وخیالات کا ذکر پایا جاتا ہے، اوران پر اہلِ علم حضرات نے نقد وتبصرہ کیا ہے۔

''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' نامی مذکورہ کتاب ہی میں مولانا سندھی صاحب کے مولانا مدنی سے خفگی اور ناراضگی کا بھی ذکر ہے، اوراسی کتاب کے حوالے سے پہلے بھی گزر چکا ہے کہ مولانا سندھی صاحب، کانگریس اوراور دیگر مذہبی جماعتوں کے قائدین سے نالاں تھے، اوران کو قدامت پسند سمجھتے تھے، پروفیسر محمد سرور صاحب اور دیگر حضرات نے بھی ان امور کو تسلیم کیا ہے۔

چنانچہ مولانا عبداللہ لغاری صاحب اور غلام مصطفیٰ خان صاحب ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' میں لکھتے ہیں:

> جب مولانا سندھی مکہ مکرمہ میں آئے، تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج پر آئے، تو ان کو بہت ڈانٹا، اور کہا کہ آپ کو کیا حق حاصل تھا کہ جو کام مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب نے کیا تھا، اور مولانا محمد علی جوہر کو پریزیڈنٹ بنایا تھا، ان کو علاحدہ کیا، اور آپ خود پریزیڈنٹ بن گئے، آپ مولوی لوگ سیاست سے بے بہرہ ہیں، جب مولانا سندھی نے بہت ڈانٹا، تو مولانا حسین احمد مدنی رونے لگے۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۲۰۵، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا سندھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان بالعموم کانگریس سے آج کل سخت بے زار ہیں، اوران کی یہ بیزاری اتنی بڑھ چکی ہے کہ مولانا ابوالکلام،

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا کفایت اللہ اوران جیسے اور بزرگ جن کی زندگیاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اوران کے لیے ہر طرح کی قربانیوں سے بھرپور ہیں، عوام کی بدگمانیوں اور مخالفتوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مولانا مسلمان عوام کی اس بے زاری کو بہت حد تک حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جیسے حق پرست محبِ وطن رہنما کانگرسی لیڈروں سے تنگ آ کر گزشتہ سالوں میں کانگرس سے بددل ہو گئے، تو مسلمان عوام کا کانگریس کو مسلمان قوم کا دشمن سمجھنا کچھ بعید نہ تھا''۔ (مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۳۶۵۔ بعنوان: انڈین نیشنل کانگریس۔ مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

پروفیسر سرور صاحب مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا (سندھی) کو جب بھی موقع ملتا اور سننے والے سننے کو تیار ہوتے تو وہ نجی مجلسوں میں جمعیت العلمائے ہند اور احرار کے رہنماؤں پر خوب برستے اور انھیں سخت جلی کٹی سناتے۔ یہاں تک کہ مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی نہ بچتے''۔ (افادات وملفوظات ص ۱۱۸، بعنوان: علمی وفکری مراکز۔ سیاسی اجتماعات میں شرکت، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

معلوم ہوا کہ حضرت مدنی نے اپنے مضمون میں جو مولانا سندھی صاحب کے غصہ کرنے اور دماغی انقلاب اور متضاد باتیں کرنے کا مشاہدہ فرمایا ہے، اس کی تائید مولانا سندھی صاحب کے مختلف واقعات سے ہوتی ہے، جن میں سے بعض واقعات حضرت مدنی کے ساتھ بھی پیش آئے، اوران کو مولانا سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری کو املا کرنے اور ترتیب دینے والوں نے بھی تسلیم کیا، بعض واقعات کا ذکر مولانا سید محمود میاں صاحب نے بھی اپنے بیان میں کیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

مولانا عبداللہ لغاری صاحب اور غلام مصطفیٰ صاحب ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' میں مولانا سندھی کے حضرت مدنی سے خفگی کے مذکورہ واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دہلی میں جمعیت العلماء کا جلسہ کرا کے مولویوں سے ووٹ لیے گئے کہ پریزیڈنٹ کس کو کیا جائے۔

مولوی بے چارے جو عموماً سادے ہوتے ہیں، اور پولیٹکل کاموں اور سیاست سے بالکل نابلد ہوتے ہیں، انھوں نے مولانا اشرف علی صاحب کے حسبِ منشا، مولانا محمد علی مرحوم کو معزول کر کے مولانا حسین احمد مدنی کو جو اور بھی سیاست اور پولیٹکل کاموں سے ناواقف تھے، اور پھر گریجویٹوں کے ویسے ہی مخالف تھے، جیسے مولانا اشرف علی، ان کو جمعیت العلماء کا پریزیڈنٹ مقرر کیا، اب پرانے تعلیم یافتہ علماء علاحدہ ہوگئے، اور گریجویٹس نے اپنا رُخ پھیر لیا، مولانا محمد علی مرحوم نے جا کر مسلم لیگ کو زندہ کیا، اور مسلمانوں کو مسلم لیگ میں جمع کر کے ہندوؤں سے اپنے حقوق منوانے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔

جب مولانا سندھی مکہ معظّمہ میں آئے، تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے، مولانا سندھی نے پہلے آہستگی سے ان کو سمجھایا، اور کہا کہ آپ مولانا شیخ الہند کی جگہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ بنے ہیں، آپ کو حق نہ تھا کہ مولانا محمد علی کو جنھیں مولانا شیخ الہند نے جمعیت العلماء کا پریزیڈنٹ بنایا تھا، ان کو معزول کر کے آپ پریزیڈنٹ بنتے، مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا کہ آخر یہ جمعیت العلماء تھی، اس کا پریزیڈنٹ بھی عالم ہونا چاہیے، اس پر مولانا سندھی کو بڑا غصہ آیا، اور کہا کہ تم کو کیا اختیار تھا، تم میں کیا علم تھا، کیا تم میں فضیلت تھی کہ تم ایک پولیٹکل جماعت کے سردار بنتے، تم نے کہاں سے سیاست سیکھی، مدینے میں تو

سیاست ہے بھی نہیں، دو چار مہینے تم شیخ الہند کے ساتھ قید میں رہے، بس اس سے تم سیاست سیکھ گئے، آپ کا نظریہ اور مولانا شیخ الہند کا نظریہ متضاد چیزیں ہیں، تم مولوی اشرف علی کے تابع دار ہو، مولوی اشرف علی نہیں چاہتے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، میں تم کو کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جا کر اپنی غلطی کی تلافی کرو، اور پھر مولانا محمد علی کو بلوا کر اس کا پریزیڈنٹ بناؤ، ورنہ میں تمھارا سر پھوڑ دوں گا، تم کیا چیز ہو کہ تم میرے استاد اور شاہ ولی اللہ کی ساری کی ساری تحریک کو برباد کرتے ہو، پھر تو مولانا حسین احمد رونے بیٹھ گئے، اس لیے جب مولانا سندھی ہندوستان میں آئے، تو ہمیشہ مولانا حسین احمد ان کی مخالفت کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا یہ کہ مسلم لیگ کے نوجوانوں نے ایک ٹکڑا ہندوستان کا، پاکستان کے نام پر آزاد کرالیا۔

مولانا شیخ الہند کی تحریک کو مولانا حسین احمد نے یوں بے کار کر دیا''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۱۴۲ و ۱۴۳، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

مولانا عبداللہ لغاری صاحب نے حضرت تھانوی اور حضرت مدنی کے متعلق جو خیالات مذکورہ عبارت میں نقل کیے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے ہی خیالات ہیں، اسی بنا پر وہ حضرت مدنی سے ناراض وخفا ہوئے، اور پیچھے بھی اصولی انداز میں گزر چکا ہے کہ مولانا سندھی صاحب، کانگریس اور دیگر مذہبی جماعتوں کی قیادت سے نالاں تھے، مذکورہ عبارت میں اسی نالاں ہونے کی ایک خاص صورت کا ذکر ہے۔

مگر اس تحریر میں بعض باتیں باہم متعارض یا خلافِ واقعہ بھی ہیں، جس کی وجہ آگے حضرت مدنی کے مضمون و بیان میں مذکور ہے کہ ایک ہی مجلس میں باہم متضاد و متخالف باتیں فرمانا، مولانا سندھی صاحب کے ذہنی اختلال وانقلاب کا نتیجہ تھا۔

www.idaraghufran.org

لیکن افسوس کہ بعض لوگ نہ تو مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں دماغی وذہنی اختلال و انقلاب کو تسلیم کرتے، اور نہ ہی مولانا سندھی صاحب سے اس قسم کی باتوں کے صدور کو سچا تسلیم کرتے، بلکہ ان باتوں کو مولانا عبداللہ لغاری وغیرہ کا ذہنی اختراع قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ مولانا لغاری وغیرہ کا اس سلسلے میں اپنا مشاہدہ و معائنہ ہے، جس کا درجہ ان خبر نگار حضرات کے فیصلوں سے زیادہ ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

البتہ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کی مذکورہ عبارت کو مولانا سید محمود میاں صاحب نے بھی ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے شمارے میں نقل کیا ہے، جس کا ذکر آگے فصل نمبر 3 میں آتا ہے، اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کی مذکورہ عبارت میں:

''ہمیشہ مولانا حسین احمد ان کی مخالفت کرتے رہے''۔

اس جملہ کے بعد یہ بھی اضافہ ہے:

(اور مسلم لیگ کے نوجوانوں کو کافر کہتے رہے۔)

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا کتاب یعنی ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کی اصل عبارت میں یہ آخر والا جملہ موجود نہیں، جس کی وضاحت ہم نے آگے فصل نمبر 3 میں متعلقہ مقام پر بھی ذکر کردی ہے، وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' میں ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے متعلق نقل کرتے ہیں:

> مولانا عبداللہ لغاری کی کتاب ''سرگزشتِ کابل'' میں جو باتیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، جو کہ لیگی سیاست سے بہت متاثر تھے، انھوں نے اپنی طرف سے داخل کردی تھیں، جس کا انھوں نے خود اپنی ایک تحریر میں اقرار بھی کیا ہے، کیا وہ بھی مولانا سندھی کے نظریات ہی شمار ہوں گے؟ قطعاً نہیں، اس لیے اس کتاب کے حوالوں کو کون تسلیم کرے گا؟ (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۲۸)

www.idaraghufran.org

حالانکہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کا اصل اور بنیادی متن ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' ہے، جس کا مضمون خود مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے مولانا عبداللہ لغاری صاحب کو املا کرایا تھا، اور ابتدا میں اس کو پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ اور حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے 1946ء کو، ادبستان''، لاہور سے حضرت مدنی کی حیات میں اور مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد، بعض وجوہات کی بنا پر نامکمل شائع کیا تھا، بعد میں اس کی تکمیل وتشریح خود مولانا عبداللہ لغاری صاحب نے کی، جس کی لفظی اصلاح اور عبارت کی روانی وغیرہ کے لیے انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب سے اعانت حاصل کی، اور اس کو ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے نام سے شائع کیا گیا، جس کا لیگی سیاست سے متاثر ہونے نہ ہونے کی حاشیہ نگاری سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا عبداللہ لغاری صاحب، مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے سفر وحضر کے تلمیذ اور خاص شاگرد اور ان کی معتمد شخصیت ہیں، ان کو ابتدا میں حضرت شیخ الہند سے بھی استفادہ کا موقع حاصل ہوا، اور اس کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ساتھ رفیقِ کار اور معتمدِ خاص بن کر رہنے کا موقع حاصل ہوا، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعدد نظریات و تقریرات کے قلم بند اور ان کی نشر واشاعت کرنے والوں میں ان کو بہت اہم شمار کیا جاتا ہے، یہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ساتھ آخری دم تک رہے۔ (ملاحظہ ہو: مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۲۶۳، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

جہاں تک ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے مرتب ومعاون جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب (Dr. Ghulam Mustafa Khan) کا تعلق ہے، تو آپ کی پیدائش یکم جولائی 1912 عیسوی اور وفات 25 ستمبر 2005 عیسوی ہے۔

ان کو ممتاز روحانی شخصیت، محقق، ماہر لسانیات، فاضل، مترجم اور ماہر تعلیم شمار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے ابتدائی تعلیم جبل پور، غیر منقسم ہندوستان سے حاصل کی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے، اور ایل ایل بی، ایم اے (اردو)، ایم اے (فارسی) کی، اور 1947ء کو بارہویں صدی کے مشہور فارسی شاعر ''سید حسن غزنوی-حیات وادبی کارنامے'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1959ء کو ناگ پور یونیورسٹی، ہندوستان سے ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت کی ابتدا کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی، ہندوستان سے بحیثیت لکچرار کی۔

1936ء سے 1948ء تک وہ ناگ پور یونیورسٹی ہندوستان کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے پہلے کراچی میں سکونت اختیار کی اور 1950ء کو بابائے اردو کی خواہش پر اردو کالج کراچی کے صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر قائم ہوئے۔ بعد ازاں وہ علامہ آئی آئی قاضی اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خواہش پر سندھ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے، جہاں انھیں صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں، وہ اس عہدے پر 1976ء تک قائم رہے۔ 1988ء کو سندھ یونیورسٹی میں ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے طور پر پروفیسر ایمریطس کے درجے پر مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی تحقیقی نثر کو تحریر کی روانی اور نرم روی میں منفرد اور ممتاز شمار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان میں 100 کے قریب کتب تصنیف وتالیف کیں۔ ان کی کتاب ''اقبال اور قرآن'' پر اقبال ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ادبی جائزے، فارسی پر اردو کا اثر-علمی نقوش، اردو-سندھی لغت، سندھی-اردو

www.idaraghufran.org

لغت- حالی کا ذہنی ارتقا- تحریر و تقریر- حضرت مجدد الف ثانی- گلشن وحدت- خزینۃ المعارف- مکتوباتِ مظہریہ- مکتوباتِ معصومیہ- معارفِ اقبال- اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات- فکر ونظر- اور ہمہ قرآن درشان محمد کے نام بھی ان کی تصانیف میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ایک معروف ومشہور شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی طرف اس علمی خیانت کی نسبت کرنا کہ انھوں نے ''سرگزشتِ کابل'' میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعلق اپنی طرف سے کچھ باتیں داخل کردی تھیں، اور پھر اوپر سے ان کی ایک تحریر میں بغیر حوالے کے اس کے اقرار کا بھی ذکر کرنا محلِ نظر ہے، کیونکہ یہ بات معلوم ہوچکی کہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے اصل مصنف مولانا عبداللہ لغاری صاحب ہیں، البتہ انھوں نے تحریر کی روانی وتسہیل کے لیے جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب سے اعانت حاصل کی تھی، جس پر اتنا بڑا الزام قائم نہیں کیا جاسکتا۔

جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب خود ہی ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی ''ذاتی ڈائری'' لاہور سے مولانا عبدالقدوس قاسمی (حال صدر شعبۂ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی) نے 1946ء میں شائع کی تھی، لیکن بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر وہ نامکمل شائع ہوئی تھی، مولانا سندھی رحمہ اللہ کے رفیق مولانا عبداللہ لغاری رحمہ اللہ، جو سفر وحضر میں ان کے ساتھ تھے، اور اپنے آخری ایام میں محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب (صدر شعبۂ ثقافتِ اسلامیہ وتقابلِ ادیان، سندھ یونیورسٹی) کے یہاں مقیم تھے، اس ڈائری کی شرح لکھتے اور لکھواتے رہے، محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب (ناظمِ تعلیمات، سندھ یونیورسٹی) نے اس کے بعض حصے لکھے، اور مواد کو یک جا کرکے اس کا ابتدائی

www.idaraghufran.org

مسودہ تیار کروایا۔

مولانا لغاری رحمہ اللہ مرحوم کی راقم الحروف پر بھی شفقت تھی، وہ برابر اپنی شرح کی زبان اور ربطِ مطالب کے سلسلے میں مجھے یاد فرماتے تھے، اور بار بار حک واصلاح فرماتے تھے، چنانچہ اس نقل در نقل کے بکثرت مقامات ان کے اور راقم الحروف کے قلم سے درست ہوتے رہے، بالخصوص مولانا لغاری رحمہ اللہ کی ترمیم واصلاح سے کئی واقعات کی نہ صرف تکرار ہوگئی، بلکہ اس تکرار کے ذیل میں ہر بار کچھ نئی معلومات کا اضافہ بھی ہوتا گیا، جو من وعن قائم رکھا گیا ہے۔

موجودہ نسخے میں مولانا سندھی رحمہ اللہ کی عبارتوں کو جلی قلم سے لکھوایا گیا ہے، اور مولانا لغاری کی شرح کو خفی حروف میں رکھا گیا ہے، اس احتیاط کے باوجود دونوں کی عبارتیں کہیں کہیں خلط ملط بھی ہوگئی ہیں، لیکن چند جملوں کے بعد ایک قاری بڑی آسانی سے متن اور شرح میں فرق قائم کرسکتا ہے، بہ ہر حال اس کی ترتیب میں اگر کوئی خامی ہے، تو اس کی ذمہ داری راقم الحروف پر ہے، جس کے لیے سوائے معذرت خواہی کے، کوئی چارہ نہیں۔

شروع کے صفحات میں مولانا سندھی رحمہ اللہ کے خودنوشت حالات، پھر بعد کے حالات کا اضافہ بھی اسی ''ذاتی ڈائری'' سے ماخوذ ہے، کتاب کے آخر میں ڈائری کے شارح کے حالات بھی اجمالاً شامل کردیے گئے ہیں۔ **وما توفیقی الا باللہ**''

فقط۔ احقر

غلام مصطفیٰ خان

(مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۳ و ۴، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

مذکورہ عبارت میں جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب نے خود صراحت کردی ہے کہ ''مولانا

عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل'' نامی کتاب کے سلسلہ میں انھوں نے مولانا عبداللہ لغاری صاحب (جو کہ اصل مصنف و مُملی تھے) ان کی کس طرح اعانت کی، اور یہ بھی کہ شروع اور بعد کے حالات کا اضافہ ذاتی ڈائری سے ماخوذ ہے، اور مولانا سندھی صاحب اور مولانا لغاری کی شرح کو جلی وخفی قلم کا امتیاز کر کے تحریر کیا گیا ہے۔

پس مذکورہ کتاب کے اصل مصنف مولانا عبداللہ لغاری صاحب ہوئے، جس طرح ذاتی ڈائری کو بھی املا کرنے والے مولانا عبداللہ لغاری صاحب ہی ہوئے۔

ملحوظ رہے کہ مذکورہ تعارف تو ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کے مرتب ومعاون جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا تھا۔

جب کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ایک شاگردِ خاص کا نام ڈاکٹر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب ہے، اوران دونوں میں التباس واشتباہ ہونے سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے شاگردِ خاص ڈاکٹر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی پیدائش 24 جون 1924 عیسوی اور وفات 9 دسمبر 2003 عیسوی ہے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم فتح محمد سیرانی اور خوشی محمد میروخانی سے حاصل کی، بعد میں وہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے سندھ مسلم کالج، کراچی، سندھ یونیورسٹی اور مدرسہ مظہر العلوم، کراچی میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آپ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد کے ڈائریکٹر اور سندھی ادبی بورڈ جامشورو کے چیئرمین رہے۔

فلسفے میں وہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے پیروکار تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے کوشاں رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی، جس کے زیر اہتمام کئی مذہبی کتابیں شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن شریف کی تفسیر سندھی زبان میں لکھی۔

www.idaraghufran.org

جناب مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب، مولانا سندھی کی حجاز سے واپسی کے بعد مولانا سندھی صاحب سے مستفید ہوئے، اور وہ مولانا سندھی صاحب کی طرف سے کراچی میں قائم کردہ بیت الحکمت کے جوائنٹ سیکرٹری اور بعد میں سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ (ملاحظہ ہو: ''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۵۹، وصفحہ ۴۷۶، ۴۷۷، مؤلف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء) [1]

ہمیں حیرت وافسوس ہے کہ ایک طبقہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو ان امور سے معصوم اور پاکیزہ قرار دینے کے لیے جو امور حضرت مدنی اور دیگر ثقہ حضرات سے ثابت ہیں، مولانا سندھی صاحب کے متعدد معتبر ومستند تلامذہ اور تعلیم وتربیت یافتہ افراد کی طرف علمی خیانت کے جرم کی نسبت کرتا ہے۔

حضرت مدنی نے، مولانا عبیداللہ سندھی کے جو حالات ''نقشِ حیات'' میں ذکر فرمائے ہیں، وہ خود ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ یہ ڈائری سب سے پہلے 1946 عیسوی میں شائع ہوئی تھی، اور حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' میں یہ حالات فاضل ناقد کی تصریح کے مطابق اس ڈائری کی اشاعت کے کئی سال بعد 1950 عیسوی کے بھی بعد تحریر فرمائے ہیں۔

''نقشِ حیات'' کی ابتدائی تاریخِ طباعت 1953 عیسوی ہے۔ (ملاحظہ ہو: نقشِ حیات، جلد اول، صفحہ ۱۲، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

---

[1] ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب لکھتے ہیں:
بیت الحکمت کی ایک شاخ مدرسہ دارالسعادت گوروپھوڑ میں قائم ہوئی تھی۔ گوروپھوڑ، تحصیل شکارپور (ضلع سکھر) کا ایک موضع ہے۔ یہ مدرسہ مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگردوں اور ان کے عقیدت مندوں نے قائم کیا تھا، اور مولانا سندھی مرحوم نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اس کے صدر مدرس اور مولوی عبیداللہ ولی اللٰہی لاڑکانوی اور مولوی عزیز اللہ جروار شہدادکوٹی اس کے طلبا کے لیڈر تھے۔ (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۶۰، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

www.idaraghufran.org

حضرت مدنی اپنی خودنوشت ''نقشِ حیات'' کے حاشیے میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

وہ (یعنی مولانا عبیداللہ سندھی) اپنی ڈائری کے صفحہ 9 میں لکھتے ہیں، میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا، الخ (نقشِ حیات، جلددوم، حاشیہ صفحہ ۵۵۳، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

حضرت مدنی کا یہ حوالہ مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی اسی مطبوعہ ڈائری کا ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

ایک مقام پر حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کی ڈائری کا ترتیب دینے والا دیباچہ صفحہ 3 پر لکھتا ہے، مولانا عبیداللہ سندھی کا سفر نامۂ کابل ایک تاریخی دستاویز ہے، الخ (نقشِ حیات، جلددوم، صفحہ ۵۵۷، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

حضرت مدنی کا ذکر کردہ مذکورہ حوالہ بھی مولانا عبدالقدوس قاسمی کے تحریر کردہ دیباچے ہی کا ہے، اور اسی صفحہ نمبر کے عین مطابق ہے، جس کے دیباچہ کا حضرت مدنی نے حوالہ دیا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت مدنی نے اپنی تالیف ''نقشِ حیات'' کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر 597 پر ذاتی ڈائری کے صفحہ نمبر 133 سے آخر تک کا حوالہ ذکر فرمایا ہے، جو اس مطبوعہ ڈائری کے عین مطابق ہے۔

اور اسی ''نقشِ حیات'' کتاب کے صفحہ نمبر 600 پر حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس کہ مولانا عبیداللہ صاحب قبل از خروج انگریز 21 اگست 1944 عیسوی بمقام دین پور وفات پاگئے''۔ (نقشِ حیات، جلددوم، صفحہ ۶۰۰، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ ''نقشِ حیات'' میں ذاتی ڈائری وغیرہ سے جو حالات حضرت مدنی نے تحریر فرمائے، وہ مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد کی بات ہے۔

www.idaraghufran.org

''نقشِ حیات'' ہی میں صفحہ نمبر 605 پر حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ڈائری صفحہ 125 پر لکھتے ہیں، انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا، الخ (نقشِ حیات، جلد دوم، صفحہ ۶۰۵، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

یہ حوالہ بھی مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب کی مرتبہ مذکورہ ڈائری ہی کا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' جلد ج ۲، صفحہ ۶۵۸ سے صفحہ ۶۶۵ تک، اسی ذاتی ڈائری کے صفحہ ۵۳ سے صفحہ ۶۰ تک ''رولٹ کمیٹی کی رپورٹ'' بھی درج کی ہے۔

مذکورہ تفصیلی حوالہ جات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مدنی نے نقشِ حیات میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق اور ان کی ذاتی ڈائری کے حوالہ سے جو کچھ تحریر فرمایا، وہ مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے، بلکہ حضرت مدنی کے اخباری بیان کے بھی بعد کا واقعہ ہے۔

پس اگر حضرت مدنی نے اپنی کتاب ''نقشِ حیات'' میں کچھ باتیں ایسی کتاب سے نقل کی ہوں، جس میں حضرت مدنی کی اپنی اس تحریر و بیان کا بھی ذکر ہو، تو اس سے حضرت مدنی کی اس تحریر و بیان کی تکذیب کے بجائے تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ وہ تحریر اگر جھوٹی ہوتی، تو حضرت مدنی کے لیے ''نقشِ حیات'' میں اس کی تردید کرنا ضروری ہو جاتا۔

اس لیے فاضل ناقد کا یہ فرمانا:

''یہ مضمون ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا، اور حضرت سندھی کا وصال ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو ہو چکا۔ سات مہینے بعد یہ مضمون لکھا اور چھاپا گیا۔ کیا اس وقت حضرت سندھی کی روح ان کے سامنے تھی جنھوں نے حضرت شیخ الاسلام کے کندھے پر رکھ کر یہ حرکت انجام دی؟''

یہ بات ہماری نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ کسی کے متعلق کوئی مضمون شائع کرنے کے لیے کسی فوت شدہ شخص کی روح کا سامنے ہونا، ہمارے نزدیک تو شرعاً ضروری نہیں، بلکہ

ایسا عقیدہ رکھنا بھی درست نہیں، کسی اور صاحب کے نزدیک اگر ایسا ہونا ضروری ہو، تو الگ بات ہے، اور اس کا شرعی ثبوت بھی ان ہی کے ذمہ ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' میں مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے اس دماغی وفکری انقلاب والی حالت کو کیوں نقل نہیں فرمایا، تو اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔

فاضل ناقد نے اپنے مضمون میں جو یہ تحریر کیا ہے:

> ''حضرت شیخ الاسلام کے تلمیذ اور مسترشد حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اس کے راوی ہیں کہ جب حضرت شیخ الاسلام کی طرف منسوب مضمون ''مدینہ'' اخبار بجنور میں چھپا، تو میں دہلی گیا اور حضرت مرشد شیخ الاسلام سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اور عرض کیا کہ حضرت آپ نے یہ مضمون حضرت سندھی کے خلاف کیسے لکھ دیا؟ تو حضرت شیخ الاسلام نے نہایت تعجب سے فرمایا: میں نے اور مخالفت میں مضمون لکھا؟ میں نے تو ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا۔ وہاں پنجاب کے کچھ علماء آئے تھے، انھوں نے کچھ کاغذات دکھا کر دستخط لیے تھے اور بس، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہی یہ مضمون میری طرف منسوب کیا ہو (یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کسی جگہ تحریر میں اب تک نہیں تھی، اب تحریر میں آ گئی)''۔

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ اس سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایت کے برعکس حضرت مدنی کا جو مضمون و بیان مستند اخبارات، تحریرات اور تقریرات اور تالیفات وتصنیفات کے ذریعہ سے اس تمام عرصے میں نقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہو، اس کے مقابلہ میں سینہ بہ سینہ روایت کی کوئی بات کی جائے، اور اوپر سے اپنے لکھنے ہی کو تحریر میں آنے کی وجہ سے حجت بھی قرار دیا جائے، جس کا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی کسی مطبوعہ تحریر میں بھی ذکر نہ ہو، تو اس کو حضرت مدنی کے سابق بیان ومضمون کے مقابلہ میں کیا مقام حاصل ہوگا؟

بے شک کوئی صاحب ''اپنے سینہ معرفت خزینہ'' میں چھپے ہوئے اس رازِ خاص کو حجت سمجھتے

رہیں، لیکن دوسروں پر تو حجت وہی چیز ہوگی، جو قابلِ حجت اصولی طریقہ وذریعہ سے ثابت ہے، اور وہ اس سینہ بہ سینہ روایت کی تردید کرتی ہے۔

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے تلمیذ اور مسترشد مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی ایک غیر مستند اور زبانی روایت کا تو اتنا بڑا مقام ہے کہ اس کی وجہ سے شائع شدہ بیانات اور مستند حضرات کی تحریرات، تصدیقات وتوثیقات کو بھی رَد کیا جاسکتا ہے، لیکن دوسری طرف تفسیر الہامُ الرحمٰن کی تحقیق وتہذیب کی خدمت میں بھی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب شریک ہوئے ہیں۔

کیا مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی تہذیب شدہ اس تفسیر اور اس میں مذکور شاذ ومتنازع افکار وخیالات کو بھی تسلیم کیا جائے گا، جس کا ایک حوالہ آگے ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مضمون میں مولانا سید محمود میاں صاحب کے حوالے سے فصل نمبر 3 میں آئے گا۔

اس کے علاوہ بھی مذکورہ تفسیر میں قابلِ اعتراض بلکہ قابلِ نکیر افکار وخیالات پائے جاتے ہیں، اور وہ بھی مولانا سندھی صاحب کے حوالے سے ہیں، جس طرح سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایت کا تعلق بھی مولانا سندھی صاحب کے متعلق ایک بیان سے ہے۔

اس موقع پر جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات ''تفسیر الہام الرحمٰن'' کی نسبت کو مولانا سندھی کی طرف مشکوک بلکہ ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس تفسیر کو مولانا سندھی صاحب نے نہیں دیکھا، اور اگر دیکھا ہے، تو شاید سرسری نظر سے دیکھا ہو، اس لیے اس تفسیر میں مذکور وموجود متنازع وشاذ افکار کی ذمہ داری مولانا سندھی صاحب پر ڈالنے کے بجائے، اس کے مرتب ومعاون پر ڈالی جائے گی، اور خطرناک قسم کے افکارِ شاذہ وفاسدہ کے حامل وقائل ہونے کی نسبت ان تلامذہ کی طرف ہی کی جائے گی۔

حالانکہ اس تفسیر کے املا کرنے والے علامہ موسیٰ جارُ اللہ نے مقدمہ میں خود صراحت کی ہے

کہ مولانا سندھی نے اپنے ان امالی کو پوری طرح دیکھ لیا تھا، اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں نے ضبط و نظم میں پوری توجہ دی ہے، اور یہ مولانا سندھی صاحب کے متوسلین میں ان کے نزدیک معتبر شخصیت ہیں، جس کا اعتراف خود مولانا سندھی صاحب نے بھی کیا ہے، اور اس کا باحوالہ ذکر ہم نے اس سے پہلے ضمیمہ میں کر دیا ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''علامہ موسیٰ جارُ اللہ روسی، اسلامی دنیا کے زبردست عالم اور وسیع النظر فاضل ہیں، ان کی علمی شخصیت عالم گیر شہرت کی مالک ہے، 1930ء و 1931ء میں علامہ موسیٰ دیوبند تشریف لائے تھے''۔ (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، حصہ اول، ص ۲۲۹، مکتبہ رشیدیہ، قاری منزل کراچی، اشاعت اول، نومبر 1992ء) [1]

---

[1] مولانا سندھی صاحب کے شاگردِ خاص پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

''مجھے معلوم ہوا کہ مولانا مکہ میں ہمیشہ اس تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی پڑھنے والا مل جائے، جسے وہ پڑھا سکیں، اگر کوئی تعلیم یافتہ ہندوستانی آ جاتا، تو اس کا آنا وہ ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے، اور اسے دن رات پڑھاتے رہتے، مشہور روسی ترک عالم شیخ موسیٰ جار اللہ جنھیں سٹالن نے جلاوطن کر دیا تھا، پھرتے پھراتے مکہ پہنچے، وہاں ان کی مولانا سندھی سے ملاقات ہوئی، اس سے پہلے جب مولانا روس گئے تھے، تو وہ شیخ موسیٰ جار اللہ سے ملے تھے، بلکہ وہاں ان کے گھر پر بھی قیام فرمایا تھا، اب جو یہ دونوں بزرگ مکہ میں ملے، تو شیخ جار اللہ نے مولانا سے قرآن پڑھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے سارا قرآن شیخ کو پڑھایا، موصوف نے مولانا کی یہ ساری تفسیر عربی زبان میں قلم بند کر لی، جب شیخ جار اللہ ہندوستان آئے، تو ان کی تفسیر کی بہت سی نقلیں کی گئیں، جو کئی کتب خانوں میں اب موجود ہیں۔

شیخ موسیٰ جار اللہ عالم اسلام کی ایک مشہور شخصیت تھے، ان کی تصنیفات عربی، فارسی اور ترکی میں ہیں، مصر کے علمی و دینی حلقوں میں وہ آج سے نصف صدی سے بھی قبل بڑے معروف تھے، ان کی آخر عمر ہندوستان میں گزری، دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کے ایما پر انھیں نظر بند کر دیا گیا، نظر بندی کے زمانے میں بھی انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، شیخ جار اللہ مولانا سے پہلے ہندوستان آ گئے تھے، اور سب سے پہلے انھوں نے ہی یہاں آ کر بتایا کہ مکہ میں جو شیخ عبید اللہ سندھی جلاوطن ہیں، وہ بہت بڑے عالم، محقق اور مجدد ہیں۔

مولانا سندھی بعض دفعہ شیخ موصوف کا ذکر کرتے، اور مسکرا کر کہتے کہ ان کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے خود میرے اہلِ وطن سے متعارف کرایا، اور ان کے یہ بتانے سے کہ میں ایک بڑا عالم ہوں، میرے اہل وطن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

اگر بالفرض مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے معتمد تلامذہ، خطرناک قسم کے شاذ افکار وخیالات کے حامل تھے، اور مولانا سندھی صاحب ان افکار سے متفق نہیں تھے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے غلط اور خطرناک قسم کے افکار کے حامل حضرات پر مولانا سندھی صاحب نے کیوں کر اعتماد کیا، اور ان کو عرصۂ دراز تک اپنا ہم نوالہ وہم پیالہ کیوں بنائے رکھا، کیا مولانا سندھی صاحب کو اپنے ساتھ شب وروز ہم نوالہ وہم پیالہ رہنے والے حضرات کے افکارِ شاذہ وفاسدہ کا بھی پتہ نہ چلا، اور انھوں نے آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد کا اظہار فرمایا۔

یہ راز بعد میں آنے والے ان حضرات پر ظاہر ہوا، جنھوں نے نہ تو مولانا سندھی صاحب کی صحبت اٹھائی، اور نہ ہی ان کے تلامذہ کی۔

اگر اس کے باوجود بالفرض کوئی شخص کسی غیر معتبر نمایندہ کو اپنا وکیل ونمایندہ یا ترجمان قرار دے، تو اس کے نمائندہ اور وکیل یا ترجمان ہونے سے کسی دوسرے کو لاکھ اختلاف ہو، اس

---

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

نے مجھے جانا اور پہچانا، غرض مجھے اپنے وطن میں زندہ کرنے والے شیخ موسیٰ جاراللہ ہیں، اس پر ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہے'' (افادات وملفوظات ص ۴۱، بعنوان: مکہ معظمہ علمی وسیاسی دلچسپیاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، کل نو مہینے ماسکو میں رہے۔ اس مختصر قیام میں ایک تو انھوں نے روس میں اشتراکی انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھا۔ وہ دریائے آمو کو عبور کر کے بخارا اور تاشقند کو دیکھتے ماسکو پہنچے۔ ماسکو سے وہ لینن گراڈ تشریف لے گئے، اور وہاں ''روسی مہمان خانہ کے بجائے روسی مسلمانوں کے مذہبی لیڈر موسیٰ جاراللہ صاحب کے ہاں مہمان رہے۔ وہ ایک بڑے جید عالم اور خدا پرست سیاسی لیڈر تھے، جن کی قدر ومنزلت روسی مسلمانوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھی، بلکہ سارا عالم اسلام انھیں جانتا تھا''۔ (افادات وملفوظات ص ۱۹۸، بعنوان: سوشلزم اور مذہب، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

علامہ موسیٰ جاراللہ روسی مرحوم، اپنے تبحر علمی کے باوجود وہ مولانا سندھی کو اپنا شیخ مانتے تھے، اور بعض جدت پسندانہ افکار میں ان کے ہم نوا تھے۔ (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، حاشیۃ، صفحہ 168، در ذیل مکتوب نمبر: 102، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

www.idaraghufran.org

سے فرق نہیں پڑا کرتا۔

لہٰذا ان حقائق کے برخلاف دعویٰ کرنا ''مدعی سست، گواہ چست'' والا معاملہ ہی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ [1]

## پروفیسر محمد سرور اور مولانا سندھی صاحبان کی تصریح

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص، پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اور ان کا پوری طرح شخصی

---

[1] رہا یہ شبہ کہ مولانا سندھی صاحب نے جناب شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے ایک رسالہ کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''ہماری تقریریں بہت سے دوستوں نے ضبط کرلی ہیں، مگر آج تک ہم نے کسی کی تصحیح اپنے ذمہ نہیں لی''۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب نے تفسیر ''الہام الرحمٰن'' یا کسی اور املا کی تصحیح نہیں فرمائی، اس لیے اس کے علاوہ دیگر امالی و تقاریر کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف درست نہیں ہوگی، تو اس سے اتفاق مشکل ہے، کیونکہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی صاحب کو مولانا سندھی صاحب نے اپنی تقریر اس طرح املا نہیں کرائی تھی، جس طرح تفسیر ''الہام الرحمٰن'' وغیرہ کو املاء کرایا تھا۔

لہٰذا دوسری املائی تقریریں یا وہ تحریریں جو مولانا سندھی صاحب کے اپنے معتمد تلامذہ نے املا کیں، اور ان پر مولانا سندھی صاحب نے اعتماد کا اظہار کیا، وہ اس سے خارج ہیں۔ جس کی مزید تفصیل فصل نمبر 4 میں ذکر کردی گئی ہے۔

رہا مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کی ان تقاریر اور تحریرات میں تضاد پائے جانے کا معاملہ، تو اس کو حضرت مدنی رحمہ اللہ کے فیصلہ کی روشنی میں دماغی اختلال پر محمول کیا جائے گا، جس کا اثر نسیان کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ جب حضرت مدنی کے بقول مولانا سندھی صاحب ایک ہی مجلس میں متضاد و متخالف باتیں فرماتے تھے، تو ایک سے زیادہ مجالس کی باتوں میں تضاد و تخالف کے ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اسی سے ان لوگوں کے شبہ کا بھی جواب ہوجاتا ہے کہ جو مولانا سندھی صاحب کی طرف منسوب آخری دور کے مضامین سے متضاد امور پیش کرکے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف درست نہیں، حالانکہ حضرت مدنی اپنے مشاہدہ کی روشنی میں متضاد امور کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف فرما چکے ہیں، ساتھ ہی اس کا سبب دماغی اختلال کو بھی قرار دے چکے ہیں، اور مشاہدہ و معائنہ کار کا درجہ احادیث کی روشنی میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر باحوالہ ذکر کردیا گیا ہے، پھر اس طرح کے شبہات کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

محمد رضوان

www.idaraghufran.org

احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اور اذیتیں اٹھا اٹھا کر ان کا دماغ چل گیا ہے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعات میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

پروفیسر محمد سرور صاحب نے مذکورہ عبارت کے آخر میں ''دماغ چل گیا ہے'' لکھ کر دراصل حضرت مدنی کی طرف سے بیان کردہ دماغی انقلاب اور دماغی توازن پر کاری اثر پڑنے اور دماغی توازن کھو بیٹھنے وغیرہ کی اپنے الفاظ میں تعبیر وتصدیق اور توثیق کی ہے، کیونکہ دماغ چلنے کا مطلب یہ ہے کہ تکالیف اور اذیتوں کے اثر سے دماغ میں بعض باتیں خود سے چلنے لگی ہیں، جن پر ان کا اختیار نہیں، یعنی یہ ایک عذر اور بیماری ہے، جس کی تفصیل آگے فصل نمبر 3 میں آئے گی۔

اس سے بھی حضرت مدنی کے بیان کے سچا ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

خود مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے بھی آخری عمر میں اس چیز کا اعتراف کیا کہ ان کی بعض باتوں کی وجہ سے، وہ حضرات بھی جو ان سے عقیدت رکھتے تھے، اب یہ کہتے ہیں کہ ''مولوی عبیداللہ کا دماغ چل گیا ہے، وہ پاگل ہو گیا ہے، وہ واہی تباہی بکتا ہے، وہ مرفوع القلم ہے''۔

چنانچہ پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی اپنے ان ہم مسلک علماء پر نجی جلسوں میں خوب برستے۔ ان کو جی بھر کر جلی کٹی سناتے، یہاں تک کہ وہ مولانا حسین احمد مدنی کو بھی جن کا وہ بہت احترام کرتے تھے، معاف نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح یہ حضرات بھی مولانا کی ان ''خیالی'' اور مجذوبانہ باتوں اور ان کی جھلاہٹوں کو دماغ کی کمزوری قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جانبین ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے نجی جلسوں میں ایک دوسرے پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور یہ باتیں باہر بھی جاتیں۔

کبھی کبھی مولانا سندھی اچھے موڈ میں ہوتے اور خود اپنے اوپر ہنسنے کو ان کا جی چاہتا تو مسکراتے ہوئے فرماتے کہ ہجرت سے پہلے جب میں یہاں تھا اور پڑھتا پڑھاتا، لکھتا لکھاتا اور اپنی باتیں لوگوں سے کہتا تھا تو مجھے بہت بڑا عالم سمجھا جاتا تھا، اور بعض خوش عقیدہ لوگ یہاں تک کہہ دیتے کہ یہ ابنِ تیمیہ ہوگا، لیکن اب جو میں ملک سے باہر گیا ہوں، دنیا دیکھی ہے، بہت کچھ حاصل کیا ہے، پرانی سلطنتوں کو ٹوٹتے اور نئی سلطنتوں کو بنتے دیکھ آیا ہوں، دیکھا ہے کہ پرانے دستور جا رہے ہیں اور ان کی جگہ نئے دستور آ رہے ہیں، اور یہ کہ کل جو کچھ روس اور ترکی میں ہوا، آج یہی عمل دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے، اور آیندہ کل کو ہماری باری ہوگی، اب جو اہلِ وطن کو میں اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر کچھ کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ عبید اللہ کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا ہے، وہ واہی تباہی بکتا ہے، وہ مرفوع القلم ہے''۔ (افادات وملفوظات ص ۹۹، بعنوان: علمی وفکری مراکز۔ سیاسی اجتماعات میں شرکت، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے درج بالا بیان سے بھی، حضرت مدنی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ دماغی و ذہنی عوارض کی بعض اقسام و انواع ایسی ہوتی ہیں کہ مریض خود اپنے آپ کو مریض سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔

مالی خولیا کی متعدد صورتیں اطباء نے ایسی ذکر کی ہیں۔

جناب ظفر حسن ایبک صاحب ''مولانا عبید اللہ سندھی صاحب'' کے قیامِ مکہ اور اپنے حج کے زمانہ میں وہاں حاضر ہونے کے ایک واقعے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

قبلہ مولانا (سندھی) صاحب نے مجھے مولوی عبد القادر قصوری (مرحوم) سے ملایا، ان کے خیالات کو میں نے چنداں انقلابی نہ پایا، قبلہ مولانا بھی، مولوی عبد القادر

قصوری اور حج پر آنے والے دوسرے ہندوستانی لیڈروں کے رویہ سے چنداں امید نہ رکھتے تھے کہ وہ ان کے پروگرام کے چلانے میں کچھ مدد دیں گے۔

(خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ، ۳۲۱، باب سترہواں، مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

جناب ظفر حسن صاحب کے درج بالا بیان سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے قیامِ مکہ کے زمانہ کے انقلابی افکار و خیالات سے ہندوستان کے اکثر علماء و قائدین اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اسی بات کی تصریح اور بھی کئی حضرات نے کی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا انقلابی پروگرام وہی تھا، جس کو انھوں نے ہندوستان آنے سے پہلے شائع بھی کیا تھا، اور پھر ہندوستان آنے کے بعد اس کا اپنی مختلف تقاریر و تحریرات میں اظہار بھی کیا تھا، جس سے اہلِ علم و مقتدا حضرات کو اتفاق تو کیا ہوتا، بدعقیدگی پیدا ہوگئی تھی، جس کا کچھ ذکر پہلے گزر چکا ہے اور کچھ آگے آتا ہے۔

## مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی تصریح

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا کہ حضرت مدنی کا یہ مضمون اخبار ''مدینہ، بجنور، انڈیا'' میں شائع ہونے کے ایک ماہ بعد حضرت مدنی کی حیات میں ہی ماہنامہ ''برہان'' دہلی میں بھی شائع ہوا تھا۔

اور ماہنامہ ''برہان'' دہلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا، جس کی کچھ عرصہ ادارت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے حصہ میں بھی آئی، اور ''برہان'' کے جس شمارے میں حضرت مدنی کا یہ مضمون شائع ہوا، اس کے اداریے میں خود مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے ''نظرات'' کے عنوان سے اس کی توضیح کی ہے، جس میں انھوں نے یہ بھی تحریر و تسلیم کیا:

''اس اشاعت میں مولانا سندھی کے متعلق حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب

مدنی کا ایک بیان قارئینِ کرام کی نظر سے گزرے گا، جو بعض اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے''

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا یہ مفصل مضمون باحوالہ آگے فصل نمبر 3 میں آ رہا ہے۔ اگر حضرت مدنی کی نسبت سے یہ مضمون درست نہ ہوتا، بلکہ جھوٹا ہوتا، تو مفتی صاحب موصوف کی طرف سے، اپنے زیرِ ادارت ماہنامے میں، اس پر بعض اخبارات میں شائع ہونے کا حکم کیسے لگایا جاتا، اور اس کو مذکورہ ماہنامے میں کیوں کر شائع کیا جاتا؟ جب کہ اس کی اشاعت کے دور میں حضرت مدنی حیات تھے، اس کی اشاعت کے تقریباً بارہ سال بعد تک حضرت مدنی حیات رہے، اس کے بعد بھی یہ تحریر متعدد اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئی، اور حضرت مدنی کا وصال 1957 عیسوی میں ہوا، اور خود حضرت مدنی کے اس مضمون کا اس ڈائری میں بھی ذکر ہے، جس کے متعدد حوالہ جات حضرت مدنی نے خودنوشت ''نقشِ حیات'' میں ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

سینہ بسینہ چلی آ رہی روایت سے مذکورہ اور آنے والے تمام حضرات بے خبر رہے، صرف فاضل ناقد ہی اس سے باخبر ہوئے۔

## مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی تصریح

حضرت مدنی کے مبحوث فیہ مضمون و بیان کے متعلق 1994 عیسوی میں ماہنامہ ''الولی'' حیدرآباد میں ''مولانا عبیداللہ سندھی نمبر'' میں مولانا منظور نعمانی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں مولانا منظور نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

''1937ء میں جب انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ملک کے تمام صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہوئیں، تو (مولانا سندھی کو) ہندوستان آنے کی اجازت ملی، اور وہ غالباً 1939ء میں تشریف لائے، آتے ہی انھوں نے چند بیانات اخبارات

میں دیے، جو ہم جیسوں کو ہضم نہیں ہو سکے، اور ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ مولانا بہت آگے بڑھ گئے ہیں، اسی زمانہ میں صدر کی حیثیت سے جو خطبہ انھوں نے دیا، اور اس میں جو رہنمائی کی، خود جمعیت العلماء نے اس کے قبول کرنے سے اپنے کو مجبور سمجھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے بعد جمعیت کے کسی اجلاس میں مولانا نے صدارت نہیں فرمائی، ممدوح کی ان باتوں کی وجہ سے ان کی وہ علمی و دینی عظمت دل سے بالکل نکل گئی، جو بیسیوں برس سے قائم تھی، بلکہ ایک طرح کا بُعد اور توحّش سا پیدا ہو گیا، اور یہ حال تنہا میرا نہیں تھا، جہاں تک یاد ہے، ہمارے عام دینی حلقے کا یہی حال تھا، یہاں تک کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو دارالعلوم دیوبند کے صدر اور جماعتِ دیوبند کے زعیم کی حیثیت سے ایک مفصل بیان شائع کرنا پڑا، جس میں مولانا سندھی کے مقام اور ان قربانیوں کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی اِن باتوں سے اپنا عدمِ توافق ظاہر کیا گیا تھا، اور بتایا گیا تھا کہ مولانا کی یہ ذہنی کیفیت اور یہ عدمِ توازن فلاں فلاں اسباب کی وجہ سے ہے''۔ (ماہنامہ ''الولی'' حیدرآباد، بابت ماہ اگست/ستمبر 1994ء، جلد 17، نمبر 11,12، صفحہ 81,82، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان سندھی شاہجہاں پوری، شعبہ نشر و اشاعت: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ)

درج بالا مضمون میں مولانا منظور نعمانی صاحب نے حضرت مدنی کے مفصل بیان کے شائع ہونے کی تصدیق کی ہے، جس میں ساتھ ہی مولانا منظور نعمانی صاحب نے خود بھی مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے چند بیانات کی وجہ سے مولانا سندھی صاحب کی بیسیوں برس سے قائم علمی و دینی عظمت دل سے بالکل نکلنے اور ان سے بُعد و توحّش محسوس ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' کی

www.idaraghufran.org

''نگاہِ اولیں'' سے متعلق ایک عبارت درج کرنے کے بعد تحریر ہے:

مولانا محمد منظور نعمانی نے یہ تحریر مولانا سندھی کے آخری دور میں لکھی ہے۔(''یادگارِ اکابر'' کراچی، صفحہ ۳۱)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ماہنامہ ''الفرقان'' کا ''شاہ ولی اللہ نمبر'' 1359 ہجری بمطابق 1940 عیسوی میں شائع ہوا۔

حضرت مدنی کا مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعلق یہ بیان اُن کی حیات میں، اور مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد سب سے پہلے سہ روزہ ''مدینہ بجنور'' میں 17 مارچ 1945ء کو شائع ہوا تھا، جس کے بعد حضرت مدنی کا یہ مضمون اسی زمانہ میں اگلے ماہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے شمارہ اپریل 1945ء میں بھی شائع ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے ماہنامہ ''الولی'' کی مذکورہ تحریر میں جو حضرت مدنی کے 1945 عیسوی کے زمانے کے بیان کا حوالہ دیا ہے، وہ ماہنامہ ''الفرقان'' کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' مطبوعہ 1940 عیسوی کے زمانہ اور مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد کی بات ہے۔

جب کہ ماہنامہ ''الفرقان'' کے مذکورہ خصوصی نمبر کی اشاعت سے پہلے حضرت مدنی کا یہ بیان سامنے نہیں آیا تھا، اور نہ ہی مولانا سندھی صاحب کے متنازع افکار پر اس نوعیت کی بحث کا آغاز ہوا تھا، جس کا حوالہ خود حضرت مدنی نے اپنے بیان کے شروع میں دیا ہے، اس لیے ماہنامہ ''الولی'' میں مولانا نعمانی کی شائع شدہ رائے ماہنامہ ''الفرقان'' میں مذکورہ رائے کے بعد کی ہے۔

اپنے اسی بعد والے مضمون میں آگے چل کر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب فرماتے ہیں:

مولانا (عبیداللہ سندھی) نے مجھ سے فرمایا کہ میں ہندوستان میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں (مولانا کا مقصد سیاسی کام سے تھا) کیا میرا ساتھ دو گے؟ میں نے

صفائی سے عرض کیا، میں غالباً آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا، مولانا نے مجھ سے وجہ دریافت نہیں فرمائی، میں نے خود عرض کیا کہ آپ بعض ایسی باتیں کرتے ہیں، جو ہم جیسوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں، اور ہم کسی طرح ان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ (ماہنامہ ''الولی'' حیدرآباد، بابت ماہ اگست/ستمبر 1994ء، جلد 17، نمبر 11,12، صفحہ 85، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان سندھی شاہ جہاں پوری، شعبہ نشر واشاعت: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ)

مذکورہ عبارت میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی بعض باتوں کو اپنے جیسے حضرات کی سمجھ سے بالاتر ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی اتفاق نہ ہونے کا اظہار فرمایا ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی بعض باتوں سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کو بھی اختلاف تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف اسی قسم کے امور سے ہوگا، جن امور سے ان جیسے دیگر مستند اہلِ علم حضرات اور حضرت مدنی، مولانا لاہوری وغیرہ کو بھی اختلاف تھا، اور اب بھی ہے ''وھو المقصود''۔

## مفتی محمد شفیع، مولانا بنوری اور علامہ عثمانی صاحبان کی تصریح

مولانا سندھی صاحب کی خدمات کے اعتراف کے باوجود ان کے بعض متنازع افکار و خیالات کا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے بھی ذکر فرمایا ہے، بلکہ مولانا محمد یوسف بنوری نے حضرت مدنی کو مولانا سندھی صاحب کے اس قضیے کی طرف متوجہ کیا تھا، جو حضرت مدنی کے مذکورہ بالا بیان کی اشاعت کا باعث بنا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حق کے معاملہ میں غیرت و

شدت کا خاص وصف عطا فرمایا تھا، وہ اپنی انفرادی زندگی اور عام برتاؤ میں جتنے نرم، خلیق اور شگفتہ تھے، باطل نظریات کے بارے میں اتنے ہی شمشیرِ برہنہ تھے، اور اس معاملے میں نہ کسی مداہنت یا نرم گوشے کے رَوادار تھے، اور نہ مصالح کو اہمیت دیتے تھے، بعض اوقات ان کی کسی تحریر و تقریر کے بارے میں یہ شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ عام دینی مصالح کے خلاف ہو، لیکن چونکہ ان کے اقدامات کا محرک للّٰہیت اور اخلاص کے سوا کچھ نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے اقدامات میں برکت عطا فرماتے، ان کے بہتر نتائج ظاہر ہوتے (چند سطور کے بعد فرماتے ہیں) مولانا کو خاص طور سے اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ علمائے دیوبند کا مسلک کسی غلط نظریے سے ملتبس نہ ہونے پائے۔ (پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں)

اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم چونکہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے رکنِ رکین رہے ہیں، اور آزادیٔ ہند کے لیے انھوں نے بے مثال قربانیاں دی ہیں، اس لیے علمائے دیوبند نے اس جہت سے ہمیشہ ان کی قدردانی کی ہے، اور جہاں آزادیٔ ہند کے لیے علمائے دیوبند کی جدوجہد کا ذکر آتا ہے، وہاں مجاہدین کی فہرست میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا نام بھی شامل ہوتا ہے، لیکن مولانا سندھی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ نہ تھے۔ [1]

اور ان کے نظریات میں دینی اعتبار سے وہ تصلّب نہ تھا، جو علمائے دیوبند کا طرہ امتیاز رہا ہے، اسی لیے وہ بعض عقائد و احکام میں وقتاً فوقتاً جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے تھے۔

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے 1306 ہجری کو چند ماہ دارالعلوم دیوبند میں داخل رہ کر کچھ کتب پڑھی تھیں، لیکن اس سال کے مکمل ہونے سے قبل انقطاع ہو گیا تھا، اور مولانا سندھی کے داخلہ کے بعد باضابطہ طریقہ پر تکمیل کی نوبت نہیں آئی۔

www.idaraghufran.org

احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے کسی ایسے ہی نظریے کا اعلان کر دیا تھا، جو جمہور علمائے امت کے خلاف تھا، تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے ان کو فہمائش کی، اور بات سمجھ میں آنے پر انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور ندامت کا اظہار کیا۔

حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد کوئی شخص ایسا نہ رہا، جو نظریاتی طور پر ان کی رہنمائی کر سکے۔

اس کے علاوہ ان کے مزاج میں مسلسل مصائب جھیلنے سے تشدد بھی پیدا ہو گیا، چنانچہ آخری دور میں انھوں نے پھر بعض ایسے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی، جو جمہور علمائے امت کے خلاف، بلکہ نہایت خطرناک اور زائغانہ تھے، ادھر چونکہ علمائے دیوبند کی جدوجہد آزادی میں برابر مولانا سندھی مرحوم کا نام آتا تھا، اس لیے خطرہ تھا کہ ان کے نظریات علمائے دیوبند کی طرف منسوب نہ ہوں، اس لیے حضرت مولانا بنوری نے نہ صرف مولانا سندھی کے ان نظریات کی تردید کی، بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس طرف متوجہ کیا، جو سیاسی جدوجہد میں مولانا سندھی مرحوم کے رفیق رہے تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ نے مولانا سندھی مرحوم کے ان نظریات کی تردید میں ایک مضمون لکھا، جو ''اخبار مدینہ، بجنور'' میں شائع ہوا۔

مولانا سندھی مرحوم کی تردید کے بارے میں یہ تمام تفصیلات احقر نے خود حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہیں، اور گزشتہ سال دوبارہ مولانا نے احقر سے ان کی توثیق فرمائی۔ (نقوشِ رفتگاں، صفحہ ۸۹، بحوالہ ''البلاغ'' جلد ۱۱، شمارہ ۱۲، ناشر: مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید، ذوالقعدہ 1424 ہجری، جنوری 2004ء)

www.idaraghufran.org

مذکورہ عبارت سے مولانا سندھی صاحب کی عظیم خدمات کے ساتھ ساتھ حضرت مدنی کے علاوہ دیگر اہلِ علم واہلِ فضل شخصیات کی طرف سے بھی ان کے متنازع وشاذ افکار وخیالات کی تردید اور حضرت مدنی کے مضمون وبیان کی تصدیق معلوم ہوئی۔

گزشتہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب، مولانا عبیداللہ سندھی کے بعض شاذ افکار کی وجہ سے کافی فکرمند تھے، جس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے استاذ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کو مولانا سندھی صاحب کی حیات کے آخری زمانے میں خط لکھا، جس کا علامہ عثمانی نے جواب تحریر فرمایا۔

ذیل کی سطور میں علامہ عثمانی کا جوابی خط پیش کیا جارہا ہے:

''برادرِ محترم (جناب مولانا محمد یوسف بنوری) دامت مکارمہم (مجلسِ علمی سملک، ڈاک خانہ ریسی، ضلع سورت، گجرات)

بعد سلام مسنون! خط کا جواب بہت دیر سے دے رہا ہوں، معاف کیجیے۔

جو کچھ آپ نے مولانا عبیدُ اللہ کے سلسلے میں لکھا ہے، میرے نزدیک یہ مسئلہ بے حد قابلِ توجہ اور اہم ہے، نہ صرف یہ ہی بلکہ جماعتِ دیوبند میں اب بہت سی شاخیں ایسی نکل رہی ہیں جو آزادی کی مسموم ہوا سے کم وبیش متاثر ہیں، شاید کچھ مدت کے بعد ہمارے اکابر کا مسلک ایسا ملتبس (یعنی خلط ملط) ہوجائے کہ کوشش کرنے والوں کے نزدیک بھی منقح (یعنی صاف) نہ ہوسکے۔ کئی مرتبہ اس سلسلے میں قلم اٹھانے کا خیال ہوا، لیکن کم ہمتی کے سوا کیا کہوں کہ کیا چیز مانع ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق ولطائف کو جس طرح تیز مگر زہر آلودہ چھری سے ذبح کیا جارہا ہے، اس کا احساس بہت ہی دردناک ہے۔

خط میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں، ان شاء اللہ اُدھر آنا ہوا تو زبانی اس پر تفصیل سے

صحیح مشورہ ہوجائے گا۔ یہ کوئی جزئی چیز نہیں، ایک فتنہ ہے جس کے آغاز کا انجام خدا جانے کہاں تک پہنچے۔ آپ کا دینی احساس اور صحیح مسلک کے لیے غیرت وجوش یقیناً مستحق تبریک وآفرین ہے۔

اللہ تعالیٰ برکت دے اور اعتدال پر قائم رکھے.....

شبیر احمد عثمانی

از دیوبند

۱۰ شوال ۱۳۶۲ ہجری مطابق: 9-10-1943''

(علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کے اس مکتوب کو نقل کرنے کے بعد پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن انور شیر کوٹی صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں)

علامہ عثمانی کے اس مکتوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دار العلوم کے بعض منتسبین مسلکِ ولی اللّٰہی سے ہٹ رہے ہیں، اور وہ خاندان ولی اللّٰہی کی صحیح راہ پہچاننے سے قاصر نظر آتے ہیں، اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم، اہلِ حق کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکا کیے ہیں، علامہ عثمانی کی ہستی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچنے میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی، چنانچہ ان کا خیال تھا کہ وہ ولی اللّٰہی کی حقیقت سے نقاب اٹھادیں، تاہم انھوں نے اپنی مختلف تصانیف میں روشنی ڈالی ہے۔

(انوار عثمانی صفحہ نمبر ۱۴۵ و ۱۴۶، خط نمبر ۳۱ بنام مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: محرم الحرام 1435 ہجری، بمطابق اکتوبر 2013 عیسوی)

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کا مذکورہ مکتوب ۱۰ شوال ۱۳۶۲ ہجری، مطابق: 9-10-1943 کا ہے، اس وقت مولانا سندھی صاحب حیات تھے۔

مولانا پروفیسر محمد انوار الحسن نے ''انوارِ عثمانی'' کی اشاعت پر اپنے پیش لفظ میں 18 محرم 1386 ہجری مطابق 10 مئی 1966 عیسوی کی تاریخ تحریر کی ہے۔

www.idaraghufran.org

جب کہ تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کا قیام مولانا سعید احمد رائے پوری کی سرپرستی میں فروری 1987 عیسوی کو عمل میں آیا۔

جس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ عثمانی کا مذکورہ مکتوب مولانا سندھی صاحب کی حیات ہی کا ہے، جب تک تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کو بھی وجود نہ ملا تھا، اور پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کا اس مکتوب پر یہ تبصرہ بھی تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے قائم ہونے سے پہلے کا ہے، جس میں انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے افکار کو اہلِ حق کی نظروں میں کھٹکنے کا ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوری کے جوابی مکتوب میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے نہ صرف یہ کہ مولانا سندھی صاحب کے مسئلے کو بے حد قابل توجہ قرار دیا، بلکہ اس کے ساتھ ہی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے حقائق کے ذبح کیے جانے پر گہرے دکھ کا اظہار فرمایا، اور اس کو ایک مستقل فتنہ قرار دیا، اور مولانا بنوری کے صحیح مسلک کے لیے غیرت وجوش کو باعثِ تبریک قرار دیا۔

اس مکتوب سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے مولانا سندھی صاحب کے اسی قسم کے شاذ افکار اور ان کی نشر واشاعت پر گہرے دکھ کا اظہار فرمایا۔

اور علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کا جو اہلِ دیوبند میں امتیازی مقام ہے، اس سے اہلِ علم حضرات بخوبی واقف ہیں، خود حضرت مدنی بھی اس کے معترف ہیں، جیسا کہ شروع تمہید میں گزرا۔

مگر افسوس کہ بعض لوگ اولاً تو علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب ودیگر حضرات کی نسبت سے اس قسم کی تحریرات کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، یا پھر ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور یا پھر دور دراز کی تاویلات کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب کسی حقیقت کا انکار کیا جاتا اور جھٹلایا جاتا ہے، تو اس کے لیے سینکڑوں حقائق کا انکار کرنا پڑتا ہے، مثل مشہور ہے کہ:

''ایک جھوٹ کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں''

اور ہمارے خیال میں اس قسم کی چیزیں علامہ عثمانی کے ذکر کردہ اس خطرہ ہی کے آثار ہیں،

جس کے انجام کو خدا جانے کہاں تک پہنچنے کا فرمایا تھا۔

## مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تصریح

شعبان 1417 ہجری، دسمبر 1996 عیسوی کے ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے حضرت مدنی کے بیان و مضمون کو شائع فرمایا تھا، جس کے شروع میں حضرت مفتی صاحب موصوف نے درجِ ذیل وضاحت فرمائی:

''احقر نے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ سے سنا تھا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی صاحب مرحوم کی طرف سے آخر دور میں جمہور علمائے امت کے موقف کے خلاف جو بعض افکار ظاہر ہوئے، ان پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے ''مدینہ بجنور'' میں ایک مضمون شائع کرایا، جس میں اکابر علمائے دیوبند کے مسلک کی وضاحت اور مولانا سندھی مرحوم کے مذکورہ بالا افکار سے برأت کا اظہار تھا۔ میں نے یہ بات حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے موقع پر لکھے گئے اپنے مضمون میں بھی تحریر کردی تھی۔ مدت سے خواہش تھی کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر بہ تمام وکمال باوثوق ذریعہ سے حاصل ہو۔ اب مخدوم ومکرم حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، مہاجر مدنی مدظلہم نے کسی طرح ''مدینہ بجنور'' سے اس مضمون کی فوٹو کاپی احقر کے پاس ارسال فرمائی ہے۔

یہ مضمون اخبار ''مدینہ بجنور'' کی 17 مارچ 1945ء مطابق 2 ربیع الثانی 1364ھ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی مجاہدانہ خدمات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور آخر دور میں ان کی طرف سے جو افکار جمہور کی راہ سے ہٹے ہوئے ظاہر ہوئے، اس کے اسباب پر بھی، اور اکابر

علمائے دیوبند کی ان سے برأت پر بھی۔ امید ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون ان حضرات کے لیے بصیرت کا سبب ہوگا، جو مولانا سندھی مرحوم کے نام سے بعض افکارِ زائغہ کی ترویج میں مصروف ہیں''۔

(محمد تقی عثمانی)

(ماہنامہ ''البلاغ'' جامعہ دارالعلوم کراچی، پاکستان، شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ، دسمبر 1996ء، صفحہ ۱۵)

یہ وضاحت ہماری مفصل کتاب کے صفحہ نمبر 91، 92 پر بھی شائع ہوئی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مدنی کے اس مضمون کی ''اخبار مدینہ، بجنور'' سے حاصل شدہ عکسی نقل مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کو باوثوق ذریعے سے حاصل ہوئی تھی، اور اسی اصل مضمون سے کتابت کر کے حضرت مدنی کے اس مضمون کو ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع کیا گیا تھا، اور اس کی عکسی نقل ارسال کرنے والی شخصیت موثق و مستند تھی، یعنی مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، نیز مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے بھی اس مضمون کی توثیق فرمائی تھی۔

لہٰذا حضرت مدنی کی اس تحریر کو جھوٹا قرار دینا اور اس کے لیے ایک غیر مستند روایت کا سہارا پکڑنا، ہمارے نزدیک انصاف و اعتدال پر مبنی نہیں۔

## مولانا سید محمود میاں صاحب کی تصریح

جامعہ مدنیہ لاہور کے ترجمان ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مدیر مولانا سید محمود میاں صاحب زید مجدہٗ نے بھی اپنے ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے شمارہ اکتوبر 1997 عیسوی، جمادی الاخریٰ 1418 ہجری کو حضرت مدنی کے مضمون کو شائع فرمایا، جو ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مدیر کو حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری نے ارسال فرمایا تھا، چنانچہ اس مضمون کے شروع میں مولانا سید محمود میاں صاحب زید مجدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین

احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کا ایک تاریخی مضمون جو ''اخبار مدینہ، بجنور'' میں 1945ء میں شائع ہوا تھا، اس کی فوٹو کاپی حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب البرنی مدظلہم نے ارسال فرمائی، اور ایک خط بھی تحریر فرمایا، جس میں موجودہ حالات میں اس مضمون کی اشاعت پر زور بھی دیا، تاکہ نئی نسل دینی نظریاتی اور تاریخی اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ رہے، لہٰذا حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلم کا خط اور مذکورہ مضمون نظرِ قارئین ہیں۔ مدیر'' (ماہنامہ ''انوارِ مدینہ لاہور، پاکستان''، اکتوبر 1997، جمادی الاخریٰ 1418 ہجری، ص ۴۹)

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا سید محمود میاں صاحب نے ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں ، حضرت مدنی کا یہ مضمون، مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری (خلیفۂ اجل شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ) کی خواہش پر شائع کیا تھا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایک تاریخی مضمون ہے، جو اخبارِ مدینہ بجنور میں 1945ء کو شائع ہوا تھا، اور اسی اخبار کی فوٹو کاپی یا عکسی نقل مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب نے اشاعت کے لیے ''انوارِ مدینہ'' کے مدیر کو ارسال کی تھی، جس سے کتابت کر کے مذکورہ رسالے میں اس کو شائع کیا گیا۔

لہٰذا اس مضمون کے مخترع اور جھوٹا ہونے کا دعویٰ کرنا یا اس مضمون میں مندرجہ بالا حضرات میں سے کسی کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا مبنی بر انصاف کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

## مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب کی تصریح

مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت مدنی کے مضمون کے ساتھ جو اپنا خط ماہنامہ انوارِ مدینہ کے مدیر کے نام ارسال فرمایا، اور یہ خط بھی ماہنامہ انوارِ مدینہ کے مذکورہ شمارہ میں ساتھ ہی شائع ہوا، اس کا مضمون درجِ ذیل ہے:

بگرامی خدمت جناب مولانا سید رشید میاں صاحب دامت برکاتہم

www.idaraghufran.org

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

امید ہے بخیر ہوں گے۔

جیسا کہ پُرانے حضرات کو معلوم ہے مولانا عبیداللہ سندھی ایک بزرگ حضرت شیخ الحدیث (شیخ الہند) قدس سرہٗ کے خاص تلامذہ میں سے تھے، تحریکِ ہند (ہندوستان کی آزادی) کی مساعی کے سلسلہ میں وہ باہر چلے گئے تھے، اسی سلسلے میں افغانستان میں بھی رہے، روس بھی گئے، مکہ معظّمہ میں بھی قیام کیا، یہاں وہ حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد 1356 ہجری یا 1357 ہجری (1939 عیسوی) میں واپس ہندوستان آئے، احقر اس وقت مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھتا تھا، مدرسہ شاہی آبادمرادآباد کے اکابر نے ان کا بہت بڑا استقبال کیا، دیگر اکابر کے علاوہ مولانا سندھی نے بھی چند منٹ تقریر فرمائی، اس کے بعد انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں قیام کیا، وہاں انھیں متعدد تلامذہ مل گئے، اور ان کی باتیں شائع ہونے لگیں، جن میں بہت سی باتیں ایسی تھیں، جو اہلِ علم کو گوارا نہ تھیں، اور اس پر تنقید ہونے لگی، اور کتابیں چھپنے لگیں، ایک کتاب کا نام ابھی تک یاد ہے، جس کا نام تھا ''عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد''۔

احقر مظاہر علوم سے فارغ ہوکر بعض مدارس میں درس دینے لگا، 1364 ہجری کی بات ہے، کھٹور ضلع میرٹھ میں پڑھاتا تھا، ایک دن جو ایک بزرگ کی دکان پر گیا، وہاں ''اخبار مدینہ'' سہ روزہ (بجنور) رکھا ہوا دیکھا، اٹھا کر پڑھنے لگا، تو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون نظر سے گزرا، جو مولانا عبیداللہ سندھی سے متعلق تھا (اس بات کو یہاں تک رہنے دیجیے) اب اگلی بات سنیے، چند سال سے ایسی خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ:

مولانا سندھی کے افکار وانظار کا پاکستان کے عربی مدارس کے طلبہ میں چرچا ہورہا ہے، اور طلبہ کی بعض جماعتیں فکری جماعت کے نام سے معروف ہورہی ہیں، مجھے پرانی بات یاد آ گئی، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دام ظلہم سابق مدیر اخبار ''مدینہ'' بجنور کو خط لکھا، اور حافظے میں جو تاریخیں حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مضمون شائع ہونے کی تھیں، وہ ان کو لکھ کر بھیجیں، اور مضمون کا فوٹو طلب کیا، انھوں نے مہربانی فرما کر وہ مضمون بھیج دیا ہے، اس کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں، آپ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع فرمادیں، تاکہ علماء وطلبہ کے سامنے دونوں رُخ آجائیں، اور جس کسی کو کام آگے لے کر بڑھنا ہو علیٰ وجہ البصیرۃ آگے بڑھے۔

والسلام۔ محمد عاشق الٰہی

(ماہنامہ ''انوارِ مدینہ لاہور، پاکستان''، اکتوبر 1997، جمادی الاخریٰ 1418 ہجری، ص ۴۹ و ۵۰)

ملاحظہ فرمایئے کہ پہلے تو 1364 ہجری (بمطابق 1945 عیسوی) کو مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری نے خود سے ''اخبار مدینہ'' میں حضرت مدنی کا وہ مضمون ملاحظہ کیا تھا، اور یہ وہی زمانہ تھا، جب حضرت مدنی کا یہ مضمون ابتداً اخبارات میں شائع ہوا تھا، اور اس وقت حضرت مدنی حیات تھے، پھر بعد میں مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب نے اسی اخبار مدینہ بجنور کے سابق مدیر مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے اس کی عکسی نقل حاصل کی، اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کو ارسال کی۔

پس حضرت مدنی کے اس مضمون کو جھوٹا قرار دینا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

مندرجہ بالا عبارت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری نے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے اس زمانے کو خود سے پایا ہے، اور اس زمانہ کے احوال وحالات کا معائنہ ومشاہدہ کیا ہے، چنانچہ مذکورہ مضمون میں خود مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد 1356ہجری یا 1357ہجری کو واپس ہندوستان آئے، احقر اس وقت مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھتا تھا، مدرسہ شاہی آباد مرادآباد کے اکابر نے ان کا بہت بڑا استقبال کیا، دیگر اکابر کے علاوہ مولانا سندھی نے بھی چند منٹ تقریر فرمائی، اس کے بعد انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں قیام کیا، وہاں انھیں متعدد تلامذہ مل گئے، اوران کی باتیں شائع ہونے لگیں، جن میں بہت سی باتیں ایسی تھیں، جو اہلِ علم کو گوارا نہ تھیں، اوراس پر تنقید ہونے لگی، اور کتابیں چھپنے لگیں''۔

جس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری صاحب نے اس زمانے کے حالات کا خود سے معائنہ ومشاہدہ کیا ہے، جب مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع افکار وخیالات اوران پر اہلِ علم حضرات کی طرف سے تنقید ہوئی تھی، اوراس سلسلے میں کتابیں چھپنا شروع ہوئی تھیں۔

حضرت مدنی کا مضمون بھی اسی زمانے میں اوران حالات کے پیشِ نظر ہی شائع ہوا تھا۔

چنانچہ حضرت مدنی کے مضمون کے شروع میں ہے:

''ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہورہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کردیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں''۔

حضرت مدنی کا یہ مکمل مضمون آگے آرہا ہے۔

فاضل ناقد اس کے باوجود فرماتے ہیں:

''مولانا عاشق الٰہی صاحب کا احترام ہمارے دل میں مولانا تقی عثمانی سے کم نہیں، ہم ان کے کاموں کی بھی قدر کرتے ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ بحث

ان کا موضوع نہیں، اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ان کی بالکل کوئی نظر نہیں،

حضرت مدنی کا یہ بیان 1364ھ مطابق 1945ء کا ہے''۔(''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۱۳)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب وغیرہ کا احترام فاضل ناقد کے دل میں کتنا ہے، اس کا اندازہ تو مذکورہ بالا کتاب میں ان کے حواشی وغیرہ سے ہوسکتا ہے، فاضل ناقد نے اپنے ایک مکتوب میں حضرت مفتی صاحب کے متعلق ''الو سیدھا کرنے'' کا الزام بھی عاید کردیا ہے، اور حضرت مفتی صاحب کی طرف تخریب کاری کرانے تک کی بھی نسبت کردی ہے، جیسا کہ اسی مضمون کے آخر میں فصل نمبر 7 میں آئے گا۔

اس سے قطع نظر اس موقع پر سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ مسئلہ پر مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب کی معتد بہ نظر نہیں، جب کہ انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے افکار پر ابتداً نقد ونظر ہونے والے زمانہ کو پایا اور ان حالات کا مشاہدہ ومعائنہ کیا ہے، بلکہ خود مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کی تقریر بھی بہ نفسِ نفیس سنی ہے، تو پھر ان کے مقابلہ میں کوئی یہی الزام بعد کے زمانہ میں آنے والے اور غیر مستند، سینہ بہ سینہ روایت کی خبر دینے والے صاحب کو دے، تو کیا یہ بھی ناانصافی ہوگی؟

کیا حضرت مدنی کے مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر ان پر بھی مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب والا حکم لگانے کی جرأت کی جاسکتی ہے؟ کیونکہ مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب نے تو حضرت مدنی کے مضمون وبیان کو حاصل کرکے صرف ارسال کرنے اور اس کی اشاعت کی خواہش کرنے کا اہتمام کیا ہے، اصل بنیاد تو خود حضرت مدنی کا مضمون وبیان ہی ہوا۔

## خبر کا درجہ عینی مشاہدہ کی طرح نہیں ہوتا

حضرت مدنی، اور ان کے بعد مفتی عاشق الٰہی صاحب جیسے حضرات مولانا سندھی صاحب کے زمانے کے حالات کے مشاہدہ ومعائنہ کار ہیں، جب کہ فاضل ناقد کو یہ مقام حاصل نہیں، اور

احادیث کی رُو سے مشاہدہ ومعائنہ کار کی رائے زیادہ قوی، راجح، وزنی اور اہم شمار ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " :لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ .

(مسند الإمام أحمد ، رقم الحديث ١٨٤٢) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی حقیقت کے برابر نہیں ہوسکتی ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ''۔ (مسند احمد)

اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ :لَيْسَ الْمُعَايِنُ كَالْمُخْبَرِ، أَخْبَرَ اللَّهُ مُوسَى أَنَّ قَوْمَهُ فُتِنُوا فَلَمْ يُلْقِ الْأَلْوَاحَ، فَلَمَّا رَآهُمْ أَلْقَى الْأَلْوَاحَ . (صحيح ابن حبان، رقم الحديث ٦٢١٤) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آنکھوں سے دیکھی حقیقت سنی ہوئی بات جیسی نہیں ہوتی، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ خبر دی کہ ان کی قوم فتنے میں مبتلا ہوگئی، تو انھوں نے توراۃ کی تختیوں کو نہیں ڈالا، لیکن جب انھوں نے اپنی قوم کو اس میں مبتلا دیکھا، تو تختیوں کو ڈال دیا۔ (ابنِ حبان)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی حالت کی خبر سن کر وہ اثر نہیں ہوا، جو اپنی قوم کی حالت کو دیکھ کر اثر ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ ''آنکھوں سے مشاہدہ کرنے والا خبر پانے والے کی طرح نہیں ہوتا''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

الشَّاهِدُ يَرَى مَا لَا يَرَى الْغَائِبُ .(مسند الإمام أحمد ، رقم الحديث ٦٢٨) [3]

---

[1] قال شعيب الارنؤط: حديث صحيح، رجاله ثقات رجال الشيخين (حاشية مسند احمد)

[2] قال شعيب الارنؤط: إسناده صحيح على شرط مسلم (حاشية صحيح ابنِ حبان)

[3] قال شعيب الارنؤط:حسن لغيره (حاشية مسند احمد)

www.idaraghufran.org

ترجمہ: موقع پر موجود شخص کی رائے جو حیثیت رکھتی ہے، وہ حیثیت غائب شخص کی رائے نہیں رکھتی۔ (مسند احمد)

اس طرح کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی مروی ہے۔ [1]

امام مناوی رحمہ اللہ مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ''فیض القدیر'' میں فرماتے ہیں:

**(ليس الخبر كالمعاينة) أى المشاهدة إذ هى تحصيل العلم القطعى وقد جعل الله لعباده أذانا واعية وأبصارا ناظرة ولم يجعل الخبر فى القوة كالنظر بالعيان** (فيض القدير شرح الجامع الصغير، تحت رقم الحديث ۷۵۷۴)

ترجمہ: سنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی حقیقت کے برابر نہیں ہوسکتی، کیونکہ آنکھوں سے دیکھنے سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے، اور اللہ نے اپنے بندوں کے لیے سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں بنادی ہیں، لیکن خبر کو قوت میں آنکھوں سے دیکھنے کی طرح کا درجہ حاصل نہیں۔ (فیض القدیر)

''الجامع الصغیر'' کی شرح ''التیسیر'' میں ہے:

**(ليس الخبر كالمعاينة) أى المشاهدة اذهى تحصيل العلم القطعى فهى أقوى وآكد ومنه أخذ أن البصر أفضل من السمع لان السمع يفيد الاخبار والخبر قد يكون كذبا بخلاف الابصار**

(التيسير بشرح الجامع الصغير، للمناوى، ج۲، ص ۳۲۰، حرف اللام)

ترجمہ: سنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی حقیقت کے برابر نہیں ہوسکتی، کیونکہ آنکھوں

---

[1] عن أنس، أن النبى صلى الله عليه وسلم قال : الشاهد يرى ما لا يرى الغائب (مسند الشهاب للقضاعى، رقم الحديث ۸۳)

قال الالبانى: وقد وجدت له شاهدا يرويه ابن لهيعة عن يزيد بن أبى حبيب وعقيل عن الزهرى عنأنس مرفوعا به .أخرجه القضاعى فى "مسند الشهاب "( 2/9 ) من طريق الطبرانى .وهذا إسناد لا بأس به فى الشواهد.(سلسلة الأحاديث الصحيحة، تحت رقم الحديث ۱۹۰۴)

www.idaraghufran.org

سے دیکھنے سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے، پس آنکھوں سے دیکھنا زیادہ قوی اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے، اور اسی سے یہ بات لی گئی ہے کہ دیکھنا، سننے سے افضل ہے، کیونکہ سننا، خبر کا فائدہ دیتا ہے، اور خبر کبھی جھوٹی بھی ہوتی ہے، برخلاف دیکھنے کے۔ (التیسیر)

فیض القدیر میں ایک مقام پر ہے:

**(إن الشاهد) أى الحاضر (يرى) من الرأى فى الأمور المهمة لا من الرؤيا (ما لا يرى الغائب) أى الحاضر يعلم ما لا يعلمه الغائب إذ ليس الخبر كالمعاينة** (فيض القدير شرح الجامع الصغير، تحت رقم الحديث ۲۰۱۴)

ترجمہ: بے شک شاہد یعنی حاضر شخص اہم امور میں وہ رائے رکھتا ہے، جو رائے غائب شخص نہیں رکھتا، یعنی حاضر شخص وہ چیزیں جانتا ہے، جو غائب نہیں جانتا، کیونکہ سنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی حقیقت کے برابر نہیں ہوسکتی۔ (فیض القدیر)

''**الجامع الصغير**'' کی شرح ''**التنوير**'' میں ہے:

**أى أن الشاهد يتبين له من الرأى والنظر فى الأمر ما لا يظهر للغائب لأن الشاهد للأمر يتضح له ما لا يتضح للغائب .** (التنوير شرح الجامع الصغير، ج٦، ص ۵۳۳، حرف الشين مع الالف)

ترجمہ: یعنی حاضر شخص کی رائے اور نظر میں کسی معاملے کے وہ پہلو ظاہر ہوجاتے ہیں، جو غیر حاضر کے لیے ظاہر نہیں ہوتے، کیونکہ کسی معاملے کا مشاہدہ کار کے لیے جو چیز واضح ہوتی ہے، وہ غائب کے لیے واضح نہیں ہوتی۔ (التنویر)

''**الجامع الصغير**'' کی شرح ''**التيسير**'' میں ہے:

**(الشاهد) أى الحاضر (يرى ما لا يرى الغائب) أى الشاهد للأمر**

**يتبين له من الرأى والنظر فيه ما لا يظهر للغائب فمعه زيادة علم .**

(التيسير بشرح الجامع الصغير، للمناوی، ج ۲، ص ۸۱، حرف الشين)

ترجمہ: شاہد یعنی حاضر شخص کی رائے میں وہ قوت ہوتی ہے، جو غائب کی رائے میں نہیں ہوتی، یعنی کسی معاملے میں شاہد کی رائے اور نظر میں وہ پہلو ظاہر ہو جاتے ہیں، جو غائب کے لیے ظاہر نہیں ہوتے، چونکہ شاہد و حاضر کے ساتھ (غائب کے مقابلے میں) زیادہ علم ہوتا ہے۔ (التیسیر)

پس مذکورہ مستند احادیث اور ان کی معتبر تشریح کی روشنی میں جن پر ہمارا ایمان و یقین ہے، ہمارے نزدیک معائنہ و مشاہدہ کار حضرات کا درجہ زیادہ ہے، اور حضرت مدنی کا مضمون و بیان سچا ہے، نہ کہ جھوٹا۔

## جناب ماہر القادری صاحب کی تصریح

مشہور صاحبِ قلم جناب ماہر القادری صاحب ''مولانا عبید اللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' مؤلف پروفیسر محمد سرور پر تبصرہ'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلان فرمایا تھا کہ دیوبند، مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار کا ذمہ دار نہیں ہے''۔ (ماہنامہ ''فاران'' کراچی، صفحہ 44، اکتوبر 1974ء)

جناب ماہر القادری صاحب جو کہ اپنے زمانہ کے ایک مشہور صاحبِ قلم تھے، انھوں نے بھی اپنے ماہنامے میں حضرت مدنی کی اس تحریر کی تصدیق و توضیح کی ہے۔

## جناب موسیٰ بھٹو اور عبد الماجد دریابادی صاحبان کی تصریح

جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب (مدیر: ماہنامہ بیداری، حیدر آباد، سندھ) لکھتے ہیں:

مولانا عبید اللہ سندھی نے وطن کی آزادی کے لیے جو قربانیاں دیں، وہ نا قابلِ

www.idaraghufran.org

فراموش ہیں۔ مولانا سندھی جدوجہد، انقلاب کے لیے تڑپ، زہد اور استغنیٰ جیسی صفات میں اپنی مثال آپ تھے، لیکن ان ساری صفات کے باوجود ان کی فکر میں ایسی کمزوریاں ہیں، جو صحیح اسلامی فکر کے تسلسل کے لیے ضربِ کاری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (بیسویں صدی کے اسلامیت کے، ممتاز شارح، ان کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۱۷۱، تصنیف: مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ، ترتیب: محمد موسیٰ بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ، سال اشاعت، جولائی ۲۰۰۵ء)

اسی مضمون میں جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب لکھتے ہیں:

مولانا سندھی کی شخصیت پر ایک تنقیدی مضمون مولانا حسین احمد مدنی کا بھی ہے، جو اس زمانے کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوا تھا، جو مختلف کتابوں میں شامل ہے، صِدق نے اس مضمون کا ایک مختصر حصہ شائع کیا ہے، وہ بھی ہم نے یہاں دیا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں دُکھ محسوس ہو رہا ہے، اس لیے کہ سندھی بزرگوں اور دیوبند کے ممتاز علما کی تربیت یافتہ شخصیت تو ہمارا اپنا سرمایہ ہے۔

جس طرح اپنی ذات پر تنقید اذیت سے خالی نہیں ہوتی، لیکن اصلاحِ نفس اور دوسروں کو نفس کی شرارتوں سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے، اسی طرح مولانا کی فکر پر تنقید سے مقصود اس فکر کی خرابیوں کی نشان دہی ہے، تاکہ مولانا سندھی سے والہانہ محبت کی وجہ سے ایک مذہبی طبقے کا رشتہ جس طرح سلف کے نصبُ العینی اسلامی فکر سے منقطع ہو رہا ہے، اس کے ازالے کی صورت پیدا ہو۔

(صِدق میں شائع شدہ مولانا حسین احمد مدنی کے مضمون کا وہ مختصر حصہ درجِ ذیل ہے)

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں و پریشان رہے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔

برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کس مپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا مرحوم کا زندہ واپس آ جانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبید اللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانائے مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی جان سخت ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانائے مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہو گئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے مدینہ وحجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی روشن خیالی وہ حلم اور بردباری، وہ سکون وسکوت، جس کو ہم پہلے سُنا کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، وہ ذرا

ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلّانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے، باتیں زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان احوالِ متضادہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا، اور وہ کیوں نہ ہو، جو ناسازگار ماحول اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر بنے (اقرار کیا) ایسے احوال میں ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ کوششوں میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ (بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارح، ان کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۱۷۴، وصفحہ ۱۷۵، تصنیف: مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ، ترتیب: محمد موسیٰ بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ، سال اشاعت، جولائی ۲۰۰۵ء)

جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو اور مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبان کی مذکورہ تصریحات سے بھی حضرت مدنی کی تحریر و بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

فاضل ناقد چونکہ اپنے مدّعا کے خلاف جس کا مضمون ملاحظہ فرماتے ہیں، اس میں وہ کوئی نہ کوئی اعتراض فرما دیتے ہیں۔

بندے کی تالیف پر جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے بھی تبصرہ کیا تھا، اس پر اعتراض کرتے ہوئے فاضل ناقد اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ کی کتاب پر تبصرہ کرنے والوں میں موسیٰ بھٹو کون ہے؟ کیا یہ حضرت تھانوی کی سلوک وتصوف کی آڑ میں اپنے جماعتِ اسلامی کے تعلق کو چھپا سکتا ہے؟

اس خط کا مضمون آخری فصل میں آتا ہے۔

اوّلاً تو اس موقعے پر جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے، بطورِ خاص اس کے درجِ ذیل جملوں کو:

''سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں دُکھ محسوس ہو رہا ہے، اس لیے کہ سندھی بزرگوں اور دیوبند کے ممتاز علما کی تربیت یافتہ شخصیت تو ہمارا اپنا سرمایہ ہے۔''

دوسرے جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں ہی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کی جماعت پر جو تفصیلی تبصرہ کیا ہے، اس کو بھی ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب لکھتے ہیں:

مولانا مودودی کی فکر اور کام کے یہ وہ افادی اور مثبت پہلو ہیں، جنھیں کسی بھی منصِف مزاج فرد کے لیے نظر انداز کرنا ممکن نہیں، ان مثبت پہلوؤں کے ساتھ اس فکر کے بعض کم زور پہلو بھی موجود ہیں، جو اتنے ہی اہم اور فیصلہ کُن ہیں، مولانا مودودی سے ایک بڑی فروگزاشت جو ہوئی، جس کی وجہ سے ان کی فکر اور جماعت سیرت و کردار کے اعتبار سے طاقت ور افراد پیدا نہ کر سکی، اور افراد کی نفسی تربیت کے معاملے میں وہ مؤثر ثابت نہ ہو سکی، وہ یہ ہے کہ اسلام کی ساری تعبیر وتشریح عقل کی بنیاد پر ہوئی ہے، اور جدید نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر ہوئی ہے، اور جدید نظام ہائے زندگی کے مقابلہ میں اسلام مکمل نظامِ زندگی ہے، کے اُصول پر ہوئی ہے، اور اسلام مذہب نہیں، بلکہ وہ ایک تحریک ہے، جو سراپا باطل کے خلاف جدوجہد اور ریاستی نظام کو تبدیل کرنے کا نام ہے، اس نعرے پر ہوئی ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ سلفِ صالحین کے اسلامی فکر اور ان کی حکمتِ عملیوں پر بھرپور تنقید بھی ہے، اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں، الٰہ، ربّ، دین، عبادت کے بارے میں تفصیل و وضاحت کے ساتھ یہ نکتہ بھی پیش کیا گیا ہے، کہ تیرہ سو سال

سے قرآن کی ان بنیادی اصطلاحات کا حقیقی مفہوم نہیں سمجھا گیا۔

اسلام کی اس تشریح میں دل اور نفس کی اصلاح کا پہلو غیر معمولی طور پر متأثر ہے۔

(بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارح، ان کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۲۵۱، تصنیف: مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ، ترتیب: محمد موسیٰ بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ، سال اشاعت، جولائی ۲۰۰۵ء)

کسی کو جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے مذکورہ تجزیے، یا اس کے کچھ اجزا سے اختلاف ممکن ہے، لیکن ان کے مذکورہ تجزیے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اُن پر جو الزام عاید کیا گیا ہے، وہ زیادہ وزن کا حامل نہیں۔

اگر کسی کا جماعتِ اسلامی سے تعلق ہو، لیکن اس کا کسی موضوع پر موقف اہلِ دیوبند کے مشائخ وعلما کے موافق ہو، تو بھی ایک دیوبندی مکتبہ فکر سے وابستہ شخصیت کا اس پر مذکورہ اعتراض کرنا حق پرستی پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔

## جناب شکیل عثمانی صاحب کی تصریح

جناب شکیل عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) تحریکِ آزادی کے ایک رہنما اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر و دانش کے علم بردار کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصدِ زندگی کے لیے بے مثال قربانیاں دیں (اور چند صفحات کے بعد لکھتے ہیں) پروفیسر محمد سرور کی اس کتاب (افادات وملفوظات امام عبیداللہ سندھی) سے فکرِ ولی اللّٰہی کی جو تعبیر سامنے آئی، اس پر مولانا سید سلیمان ندوی، ان کے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور عبدالماجد دریابادی نے شدید تنقید کی اور واضح کیا کہ مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی غلط ترجمانی کی ہے، اور

ان کے افکار وخیالات اسلامی طرزِ فکر سے متصادم ہیں۔

بعد میں مولانا سندھی کے شاذ افکار کو دیکھتے ہوئے دارُالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ان کے افکار سے اپنی اور حلقۂ دیوبند کی برائت کا اظہار کیا۔ (روزنامہ ''مدینہ'' بجنور، ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء)

البتہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے مولانا سندھی کے افکار وخیالات کا دفاع کیا۔

(''ششماہی نقطہ نظر اسلام آباد'' شمارہ نمبر ۲۰، اپریل۔ستمبر ۲۰۰۶ء، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد)

فاضل ناقد نے جناب شکیل عثمانی صاحب کے بارے میں اپنے خط میں یہ سوال کیا ہے کہ ''یہ شکیل عثمانی کون ہے؟'' جیسا کہ آخری فصل میں آتا ہے۔

تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ جناب شکیل عثمانی صاحب ایک ذمہ دار صحافی، مصنف اور عقیدۂ تحفظ ختمِ نبوت کے ممتاز محقق شمار ہوتے ہیں۔

آپ، جناب حضرت نواب عشرت علی خان قیصر صاحب رحمہ اللہ (خلیفۂ اجل: مولانا فقیر محمد پشاوری ومسیحُ الامت مولانا محمد مسیحُ اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہما اللہ) کے حلقۂ ارادت سے تادمِ وفات وابستہ رہے۔

جناب شکیل عثمانی صاحب کے متعلق روزنامہ جنگ میں 27/ اگست 2017ء کو اُن کی وفات پر درجِ ذیل مضمون شائع ہوا:

اسلام آباد (نمایندہ خصوصی) بزرگ صحافی، مصنف اور عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے محقق محمد شکیل عثمانی انتقال کر گئے، جنھیں گزشتہ روز اعوان ٹاون، نصیر آباد، راولپنڈی میں سپردخاک کردیا گیا۔ ان کی عمر 77 سال تھی۔ شکیل عثمانی ریڈیو پاکستان کے شعبہ نیوز سے وابستہ رہے۔ (روزنامہ جنگ، اسلام آباد، ۲۷، اگست، ۲۰۱۷)

روزنامہ نوائے وقت میں درجِ ذیل مضمون شائع ہوا:

راولپنڈی (اپنے سٹاف رپورٹر سے) بزرگ صحافی، مصنف اور عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے ممتاز محقق محمد شکیل عثمانی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 77 سال تھی۔ شکیل عثمانی ریڈیو پاکستان کے شعبہ نیوز سے وابستہ رہے اور کنٹرولر نیوز کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ بعدازاں انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا سلسلہ دیگر رسائل وجراید اور اخبارات سے وابستگی میں بسر کیا۔ وہ عقیدۂ ختمِ نبوت اور اقبالیات کے ممتاز محقق کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انھوں نے شاعر مشرق کے حوالے سے بعض اعتراضات کا مدلل علمی جواب دینے کے لیے باضابطہ کتاب بھی تحریر کی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ فتنہ قادنیت کے خلاف علمی جدوجہد میں گزرا۔ انھوں نے مختلف دینی موضوعات پر تحقیق پر مبنی مقالے لکھے، جو اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔ (روزنامہ نوائے وقت، ۲۷، اگست، ۲۰۱۷)

جناب شکیل عثمانی صاحب نے ایک کتاب ''غلام احمد پرویز کی فکر کا علمی جائزہ'' کے نام سے مرتب کی، جس پر ماہنامہ نقیب ختم نبوت، ملتان، میں صبیح ہمدانی صاحب کا درجِ ذیل تبصرہ شائع ہوا:

''غلام احمد پرویز صاحب برِّصغیر پاک وہند میں انحراف کی تاریخ کا ایک اہم نام ہیں۔ اگرچہ ان کی معنویت اور تطبیق آج کے دور میں اتنی اہم نہیں رہی، لیکن ملکِ عزیز پاکستان میں اعتقادی وعملی گمراہی ایک طویل عرصے تک اس فکر کی ہی مرہونِ منت رہی ہے۔ اہلِ اقتدار اور پاکستانی معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگوں کو اس فکر میں ہمیشہ اپنی دل چسپی کا سامان ملتا رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی پاکستان کی ملت اسلامیہ اگر اس فکر اور اس کے بعض منتجات (مثلاً عائلی قوانین وغیرہ) سے دوچار ہے، تو اس کی سب سے بڑی وجہ اربابِ اقتدار واختیار کی جانب سے اس فکر کی سرپرستی ہے۔ پرویز صاحب کی فکر پہلودار ہے؛ مثلاً ان کے

ہاں انکارِ حدیث ہے، تفسیر بالرائے ہے، مغرب کی اسلام کاری ہے، سوشلزم سے تأثُّر ہے اور سب سے بڑھ کر طاقت وقوّت کی دائمی موافقت وہم نوائی ہے۔

زیرِ نظر کتاب پرویز صاحب کی فکر کے انھی مختلف گوشوں کے حوالے سے متعدّد موضوعات کا مجموعہ ہے، جسے ہمارے دیرینہ مہربان جناب شکیل عثمانی نے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں ان کا اپنا ایک مضمون؛ بعنوان : پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کا سیاسی کردار بھی شامل ہے۔

محترم شکیل عثمانی، علم وتحقیق کا ذوق رکھنے والے صاحبِ قلم ہیں۔ زیرِ نظر کتاب سے پہلے مختلف عنوانات اور موضوعات پر ان کے علمی وتحقیقی مقالات موقّر جرایدو رسائل میں شائع ہوکر اہلِ علم وفضل کی دادوتحسین حاصل کر چکے ہیں''۔

(تبصرہ کتب مجلس احرار اسلام، پاکستان)

(http://ahrar.org.pk/ur/naqeeb-rasala)

اس کے علاوہ جناب شکیل عثمانی صاحب نے ایک مضمون ''ریاست اور مذہب کا تعلق غامدی صاحب کا جوابی بیانیہ، خود اُن کی عدالت میں'' تحریر کیا تھا، جو ماہنامہ ''بینات'' کراچی میں دو اقساط میں شائع ہوا، جس میں جناب شکیل عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

حال ہی میں جناب جاوید احمد غامدی کا ایک مضمون ''اسلامی ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' اُن کے ماہنامہ اشراق لاہور اور چند دوسرے رسائل اور جراید میں شائع ہوا ہے۔ موضوع کی اہمیت اور دل فریب اندازِ بیان کے سبب یہ مضمون گہرے غور و فکر کا متقاضی سمجھا گیا اور اس پر بحثیں بھی ہوئیں۔ اس لیے بھی کہ یہ ملک میں جاری اسلام اور سیکولرزم کی اُس کش مکش کی عکاسی کرتا ہے، جس کے دوررس نتائج ہوں گے۔ ذیل کی سطور میں مضمون کے صرف چند نکات کا اختصار سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب یا دین نہیں ہوتا۔ (ماہنامہ بینات، محرم ۱۴۳۸، نومبر، ۲۰۱۶، پہلی قسط)

نیز لکھتے ہیں:

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعاوی اور محمد علی صاحب لاہوری کی تحریروں پر اپنے معروضات پیش کرنے کے بعد جاوید غامدی سے درخواست ہے کہ وہ اپنے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے واضح اعلان کریں کہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کی آئینی ترمیم جس کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا، قرآن اور سنت کے مطابق ہے۔ (ماہنامہ بینات، صفر ۱۴۳۸، دسمبر، ۲۰۱۶، دوسری اور آخری قسط)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں جناب شکیل عثمانی صاحب کو پہچاننا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ ان تمام تر حوالہ جات وتصریحات کے بعد حضرت مدنی کی تحریر کو سرے سے جھوٹا اور مخترع قرار دینے کے دعوے سے اتفاق کیا جانا مشکل ہے۔

## ماضی کے بجائے حال کے صیغوں کا قضیہ

جہاں تک فاضل ناقد کی طرف سے حضرت مدنی کے مضمون میں صیغوں کے الفاظ کا تعلق ہے، جن کے متعلق فاضل ناقد لکھتے ہیں:

''اس (مولانا مدنی کے) مضمون کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ یہ مضمون جو حضرت سندھی کی وفات کے بعد لکھا گیا، اس میں بعض جگہ صیغے ماضی کے بجائے حال کے لکھے گئے''۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہماری کتاب میں مذکور صیغے ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مطابق ہیں، اور اس بارے میں تفصیلاً آگے آئے گا کہ ان دونوں رسائل کا مضمون اصل ماخذ ''اخبار مدینہ، بجنور، انڈیا'' ہے، جس سے اس مضمون کو نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔

البتہ ماہنامہ ''برہان'' میں بعض مقامات پر صیغے مختلف ہیں، چنانچہ ماہنامہ برہان میں شائع

ہونے والے مضمون کے الفاظ درجِ ذیل ہیں:

''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون وسکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے ہیں''۔ (ماہنامہ ''برہان'')

فاضل ناقد اپنے تئیں چونکہ ماہنامہ ''برہان'' کے مضمون کو ترجیح دیتے ہیں، اور اسی بنیاد پر وہ دوسرے رسائل میں منقول بعض الفاظ کو تحریف شدہ قرار دیتے ہیں، جیسا کہ آگے آتا ہے، اس لیے انھیں اگر ماہنامہ ''برہان'' کے الفاظ اور صیغوں پر اعتماد ہو، تو وہ اپنی پسند کے ان الفاظ کو ترجیح دے سکتے ہیں، ہمیں اس پر کوئی شکایت ومنازعت نہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو صاحب اپنی اردو زبان کے محاورات اور عرف سے واقف ہوں، تو ان کو اس طرح کا اشکال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، کیونکہ متعلقہ مقام پر مذکورہ الفاظ اور صیغوں کا جو مفہوم بنتا ہے، وہی مفہوم ماضی کے صیغوں کی صورت میں بھی بنتا ہے، اور عرفِ عام میں اس طرح کا استعمال شائع ہے، چنانچہ مذکورہ عبارت میں اگر حال کے صیغوں کے بجائے ماضی کے صیغے استعمال کر لیے جائیں، تب بھی ان کا مطلب مختلف نہیں ہوگا، اگر فن بلاغت کی کتب (مثل مختصر المعانی وغیرہ) کی طرف مراجعت کریں، تو وہاں اس بات کی صراحت پائیں گے کہ حال کو ماضی اور ماضی کو حال کے صیغوں سے تعبیر کرنا، کن کن موقعوں پر کن کن مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔

مثلاً ماضی کو حال کے صیغوں میں بیان کرنا ماضی کا ہو بہو آنکھوں میں نقشہ کھینچنے، منظر نگاری

کرنے کے لیے بھی ہوتا ہے، قرآن مجید میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے صیغوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ اہلِ جنت واہلِ جہنم کے احوال، جو قیامت کے بعد پیش آئیں گے، ماضی کے صیغوں سے بھی ذکر ہوئے ہیں۔

جیسا کہ یہ تقابل ہماری کتاب کے درجِ ذیل الفاظ:

''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں''۔

اور ان حال کے صیغوں کو ماضی کے صیغوں سے بدل کر درجِ ذیل الفاظ سے ظاہر ہوگا:

''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں''۔

اب ہر صاحبِ عقل وفہم یہ فیصلہ بآسانی خود کر سکتا ہے کہ مذکورہ صیغوں اور الفاظ کے فرق سے

حضرت مدنی کے بیان کے بنیادی مفہوم اور اصل مقصود و مدعا میں کون سا بگاڑ اور فساد پیدا ہوگیا، جس پر زورِ قلم خرچ کرنے کی ضرورت پیش آئے، اور صرف اس کی بنیاد پر حضرت مدنی کے ایک علمی، تاریخی، نہایت معتمد و مستند اور معتدلانہ و منصفانہ مضمون ہی کو سرے سے جھوٹا قرار دے دیا جائے۔ ع

خوئے بدرا بہانہ بسیار

اس کی مزید توضیح دوسری فصل میں آتی ہے۔

## دماغ خراب ہونے کی تعبیر

جہاں تک فاضل ناقد کی طرف سے حضرت مدنی کے بیان میں مولانا سندھی صاحب کا ''دماغ خراب ہونے'' کا تعلق ہے، تو یہ تعبیر اپنے الفاظ میں فاضل ناقد کی ہے، جس سے خوامخواہ اصل حقیقت کو نہ سمجھنے والوں کے جذبات بھڑکتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک حضرت مدنی نے اپنے مضمون میں اس مقصد کی بہت احسن اور مہذب طریقے وسلیقے سے تعبیر کی ہے، جس طرح محدثین نے زوالِ عقل وغیرہ کی اختلاط واختلال وغیرہ جیسے الفاظ سے تعبیر کی ہے، جس کی کچھ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے، اور مزید تفصیل وتشریح آگے فصل نمبر 3 میں آئے گی، جس میں حضرت مدنی کے مکمل مضمون کے اصل الفاظ بھی آتے ہیں، اس سے اچھی طرح واضح ہوجائے گا کہ حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب یا ان کے دماغ کے متعلق کیا کچھ فرمایا ہے۔

www.idaraghufran.org

## (فصل نمبر 2)

# حضرت مدنی کے مضمون میں تحریف کا الزام

فاضل ناقد نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں، حضرت مدنی کا مضمون ماہنامہ ''برہان'' کے حوالے سے نقل کیا ہے، جس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس مضمون کو اس لیے شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہوجائے کہ وہ مضمون کون سا ہے، جس پر مفاد پرست دل لگی کررہے ہیں۔
> یہ مضمون ''مدینہ اخبار''، پھر ''برہان دہلی'' اور ''البلاغ''، ''الخیر''، ''انوارِ مدینہ'' میں شائع کرایا گیا۔ (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۹۲۲)

فاضل ناقد چونکہ اس مضمون کو سِرے سے حضرت مدنی کا نہیں سمجھتے، اس لیے ان پر اس مضمون کے مثبت پہلوؤں کا خاطر خواہ اثر نہیں، اور اسی لیے وہ اس مضمون کو نقل کرنے یا اس مضمون کی اتباع کرنے والوں کو مفاد پرست اور اس مضمون سے دل لگی کرنے والا قرار دے رہے ہیں۔

تاہم واضح نہیں کیا گیا کہ ان مفاد پرست اور دل لگی کرنے والوں کا مصداق کون سے حضرات ہیں؟

کیا اس کے مصداق میں بڑے بڑے اصحابِ علم واصحابِ قلم حضرات بھی شامل ہیں، جو اس مضمون کو نقل کرتے یا اس کا حوالہ دیتے آئے ہیں، یا پھر کوئی دوسرے مخصوص افراد واصحاب ہی اس کا مصداق ہیں؟

پھر آگے چل کر فاضل ناقد صاحب، حضرت مدنی کا ماہنامہ ''برہان'' کے حوالے سے مکمل مضمون وبیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''جہاں جہاں ☆ بنایا گیا ہے وہ اس کی نشان دہی کے لیے ہے کہ یہاں اصل مضمون کے الفاظ جو تھے انھیں بدل دیا گیا ہے، اور یہ ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کی اشاعت اور مفتی رضوان صاحب کی ''کالی کتاب'' میں ہوا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے یہ مضمون ''انوارِ مدینہ'' سے نقل کیا ہے؟

کیونکہ ماہ نامہ ''برہان'' اور ''الخیر'' میں ایک ہی الفاظ ہیں، اور ''الخیر'' میں جو مضمون شائع ہوا ہے، وہ دراصل ''البلاغ'' سے فوٹو اٹھایا گیا ہے، اس لیے ''البلاغ'' کا مضمون ''برہان'' کے مطابق ہوا۔

(''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۹۲۹)

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جو اس قسم کے دعوے یا فیصلے موصوف نے کیے ہیں، وہ شاید مکمل مطالعے اور صحیح تحقیق کے بغیر جذبات اور عجلت میں کیے ہیں۔

چنانچہ فاضل ناقد نے جو یہ فرمایا ''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے یہ مضمون ''انوارِ مدینہ'' سے نقل کیا ہے'' یہ بات حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ ہم نے اپنی تالیف میں حضرت مدنی کا یہ بیان و مضمون ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے بجائے ماہنامہ ''البلاغ'' سے نقل کیا ہے، جس کے شروع میں ہم نے مندرجہ ذیل وضاحت بھی کی ہے:

''مولانا عبیداللہ سندھی، افغانستان، سویٹ یونین، ترکی اور حجاز میں قیام کے بعد 1939ء میں جب ہندوستان پہنچے، تو انھوں نے اپنی بعض تقریروں اور تحریروں میں ایسے خیالات کا اظہار کیا، جو جمہور علمائے امت کے موقف کے خلاف تھے، اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے اخبار ''مدینہ'' بجنور میں ایک مضمون لکھا، جس میں اکابر علمائے دیوبند کے مسلک کی وضاحت اور مولانا سندھی کے شاذ افکار سے برأت کا اظہار تھا، یہ مضمون مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے نوٹ کے ساتھ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی میں شائع کیا، ذیل

کی سطور میں یہ نوٹ اور مولانا مدنی رحمہ اللہ کا مضمون پیش کیا جارہا ہے''۔(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص۹۰، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

پھر مضمون کے آخر میں اس کے ماخذ کو بیان کرتے ہوئے ہم نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 99 پر درجِ ذیل عبارت بھی صراحت کے ساتھ درج کی ہے:

''بشکریہ: ماہنامہ ''البلاغ'' جامعہ دارالعلوم کراچی، پاکستان، شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ، دسمبر 1996ء، صفحہ ۱۵ تا ۱۹''۔

جہاں تک فاضل ناقد کی طرف سے ''الخیر'' کے مضمون کے ''البلاغ'' سے فوٹو کاپی اٹھانے کے دعوے کا تعلق ہے، تو یہ بھی خلافِ حقیقت ہے، کیونکہ حضرت مدنی کا مضمون ماہنامہ ''الخیر'' میں اکتوبر 1993 میں شائع ہوا، اور ماہنامہ ''البلاغ'' میں اس کے تقریباً تین سال بعد، دسمبر 1996ء میں شائع ہوا، پس تین سال بعد شائع ہونے والے مضمون کی فوٹو کاپی، تین سال پہلے ماہنامہ ''الخیر'' میں کیسے اٹھائی جاسکتی ہے؟

ان تصریحات کے باوجود ہماری طرف اس مضمون کے ''انوارِ مدینہ'' سے نقل کرنے اور ''الخیر'' کے مضمون کو ''البلاغ'' سے فوٹو اٹھانے کی نسبت کرنا، کیسے درست قرار پاسکتا ہے؟

اس کے بعد عرض ہے کہ یہ بحث کرتے ہوئے جو الفاظ کی تبدیلی یا تحریف کا الزام عائد کیا گیا ہے، یہ بحث ہمارے نزدیک علمی اعتبار سے اس قابل نہیں تھی کہ اس کی تحقیق وتمحیص کی جائے، اور اس میں وقت صرف کیا جائے، لیکن جس انداز سے دوسرے کی طرف تبدیلی یا تحریف کے الزام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کو باقاعدہ شائع کردیا گیا ہے، اس سے بعض کم علم حضرات میں غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے اس کی اصل حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

فاضل ناقد فرماتے ہیں:

''ماہ نامہ ''برہان'' اور ''الخیر'' میں ایک ہی الفاظ ہیں، اور ''الخیر'' میں جو مضمون

شائع ہوا ہے، وہ دراصل ''البلاغ'' سے فوٹو اٹھایا گیا ہے، اس لیے ''البلاغ'' کا مضمون ''برہان'' کے مطابق ہوا''

جب فاضل ناقد صاحب کی تصریح کے مطابق ماہنامہ ''برہان'' اور ماہنامہ ''الخیر'' کے الفاظ ایک طرح کے ہیں، اور ''الخیر'' کا مضمون ماہنامہ ''البلاغ'' سے فوٹو کاپی کر کے اٹھایا گیا ہے، اور ''البلاغ'' کا مضمون ماہنامہ ''برہان'' کے مطابق ہے، تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ فاضل ناقد کے نزدیک مذکورہ تینوں رسائل کا مضمون ایک جیسا ہے، جس کے مطابق فاضل ناقد کی بیان کردہ بحث ہی ''بناءُ الفاسد علی الفاسد'' کا مصداق قرار پاتی ہے، جیسا کہ آگے آنے والی تفصیل سے معلوم ہوگا۔

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' کا مضمون نقل کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے:

''جہاں جہاں ☆ بنایا گیا ہے وہ اس کی نشان دہی کے لیے ہے کہ یہاں اصل مضمون کے الفاظ جو تھے انھیں بدل دیا گیا ہے، اور یہ ماہنامہ انوارِ مدینہ کی اشاعت اور مفتی رضوان صاحب کی ''کالی کتاب'' میں ہوا ہے''۔

اولاً تو معلوم نہیں کہ فاضل ناقد کے نزدیک ''کالی کتاب'' کی تعبیر کس بنیاد پر ہے۔

اس سے قطع نظر ہم نے فاضل ناقد کے اس مضمون میں مذکورہ ☆ نشان کو جن جن مقامات پر ملاحظہ کیا، ان کی تفصیل فاضل ناقد کی طرف سے نقل کردہ الفاظ کی صورت میں نمبر شمار کے ساتھ بالترتیب وبعینہٖ درجِ ذیل ہے:

(1) ''حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ☆ کے غیرت مندوں میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کردی''۔ (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۹۶۴)

(2) ''انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند ☆ رحمۃ اللہ علیہ سرشاد ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۴)

www.idaraghufran.org

(3) ''تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں، آئے☆ اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

(4) ''کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع ☆ کو روشن کیا، مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شموع ☆ کو بجھا دیا''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

(5) ''افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل☆ تھا''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

(6) ''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے☆ اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۷)

(7) ''بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے☆ ہیں''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۷)

(8، 9) اس کے علاوہ فاضل ناقد نے ماہنامہ ''برہان'' دہلی سے مضمون نقل کرتے وقت اپنی مرتب کردہ مذکورہ کتاب کے حاشیہ میں دو جگہ تحریف یا تبدیلی کی نشان دہی بھی کی ہے، چنانچہ فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' کے حوالے سے متن میں ایک جگہ درجِ ذیل عبارت نقل کی ہے:

''حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کے غیرت مندوں میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۴)

مذکورہ عبارت کے حاشیے میں فاضل ناقد لکھتے ہیں:

ماہنامہ ''برہان دہلی'' اور ماہنامہ ''الخیر ملتان'' میں یہی الفاظ ''غیرت مند'' ہیں، جب کہ ماہنامہ انوارِ مدینہ لاہور اور مفتی رضوان صاحب کی کتاب میں ''عقیدت مند'' کے الفاظ ہیں۔ (''یادگارِ اکابر'' حاشیہ صفحہ ۹۲۴)

ملحوظ رہے کہ فاضل ناقد کی کتاب کے متن میں تو ماہنامہ ''برہان'' سے نقل کرتے ہوئے ''غیرت مندوں'' کے الفاظ ہیں، اور نیچے اسی کے حاشیہ میں نشان دہی کرتے وقت فاضل ناقد نے ''غیرت مند'' کے الفاظ درج کیے ہیں۔

اب معلوم نہیں کہ فاضل ناقد کے نزدیک ایک ہی صفحہ پر متن اور حاشیے میں درج دو قسم کے الفاظ میں سے کون سا لفظ صحیح ہے اور کون سا غلط ہے؟ یہ بھی تحریف کے مفہوم و مصداق میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کے بعد فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' کے حوالے سے متن میں ایک جگہ درجِ ذیل عبارت نقل کی ہے:

> ''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۷)

پھر مذکورہ عبارت کے حاشیے میں فاضل ناقد لکھتے ہیں:

> مفتی رضوان صاحب اور ''انوارِ مدینہ'' میں اس مضمون کی اشاعت میں تحریف کی گئی ہے، یہاں حال کا صیغہ شامل کر کے ماضی کو ختم کر دیا گیا، مثلاً ''جب حجاز پہنچے ہیں'' حالانکہ اصل صرف ''پہنچے'' تھا۔ (''یادگارِ اکابر'' کراچی، حاشیہ صفحہ ۹۲۷)

یہاں بھی ملحوظ رہے کہ فاضل ناقد کے نقل کردہ متن میں تو ''جب حجاز میں پہنچے'' کے الفاظ ہیں، اور اس کے نیچے حاشیے میں نشان دہی کرتے وقت انھوں نے ''جب حجاز پہنچے'' کے الفاظ درج کیے ہیں۔

یہاں بھی معلوم نہیں کہ ایک ہی صفحے پر متن اور حاشیے میں درج دو قسم کے الفاظ میں سے کون سا لفظ صحیح ہے اور کون سا غلط، اور یہ بھی تحریف میں تو داخل نہیں؟ ممکن ہے کہ اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اصلاح اور وضاحت کر دی جائے، لیکن ہمارے سامنے شائع شدہ جو نسخہ ہے، ہم نے اس کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے۔

## ''عقیدت مند'' اور ''غیرت مند'' میں تبدیلی کا الزام

آخر میں مذکورہ دونوں مقامات پر فاضل ناقد نے ماہنامہ ''البلاغ'' کا ذکر نہیں کیا، جب کہ اس سے پہلے وہ ماہنامہ ''البلاغ'' کے مضمون کو ماہنامہ ''برہان'' اور ماہنامہ ''الخیر'' کے مطابق قرار دے چکے ہیں، ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ ہم نے حضرت مدنی کا مضمون ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے بجائے ماہنامہ ''البلاغ'' سے نقل کیا ہے، اس لیے اگر کسی جگہ ہمارے مضمون میں تحریف یا تبدیلی ہے، تو وہ دراصل ''البلاغ'' کی طرف منسوب ہے، جب کہ ماہنامہ ''البلاغ'' کا مضمون ''اخبار مدینہ، بجنور'' سے نقل کیا گیا ہے، اور حضرت مدنی کے مضمون کا اصل ماخذ یہی ہے۔

پس اگر تبدیلی اور تحریف کا الزام ماہنامہ ''البلاغ'' یا ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کی طرف عائد کیا جاسکتا ہے، تو ماہنامہ ''برہان'' کی طرف بھی عائد کیا جاسکتا ہے، بلکہ ماہنامہ ''برہان'' کی طرف بدرجہ اولیٰ عائد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ماہنامہ ''برہان'' میں اصل ماخذ سے نقل کرنے کا ذکر نہیں، جب کہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ میں اصل ماخذ کا ذکر ہے۔

پھر تبدیلی اور تحریف کے دعوے یا دلیل کی بنیاد اصل مضمون اور ماخذ کے بجائے کسی دوسری تحریر پر کیسے رکھی جاسکتی ہے؟

اگر بہ نظرِ انصاف غور کیا جائے، تو مذکورہ رسائل میں سے کسی کی طرف بھی تحریف اور تبدیلی کا الزام عائد کرنا درست نہیں، کیونکہ جہاں مذکورہ رسائل میں چند الفاظ کا فرق ہے، وہ یا تو تعبیر

اور مفہوم کو درست اور صحیح یا سہل کرنے کے لیے ہے، یا کتابت کی غلطی کا امکان ہے۔

اور کتابت کی غلطی جس طرح بعد والے ناقلین کی طرف سے ممکن ہے، اسی طرح پہلے ناقل کی طرف سے بھی ممکن ہے، جس نے مضمون نگار کے مضمون کی سب سے پہلے کتابت کی ہو، یعنی ''اخبارِ مدینہ، بجنور'' کے کاتب نے، اس لیے بعد کے حضرات کو اس کی اصلاح کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

فاضل ناقد نے ماہنامہ ''برہان'' اور ماہنامہ ''الخیر'' میں ''غیرت مند'' کے الفاظ ہونے اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ہماری کتاب میں ''عقیدت مند'' کے الفاظ ہونے کا حکم لگایا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے اصل مضمون میں جس کو ہم نے ملاحظہ کیا، نہ تو خالی ''غیرت مند'' کے الفاظ ہیں، اور نہ ہی ''عقیدت مند'' کے الفاظ ہیں، بلکہ ان دونوں کے بجائے ''غیرت مند دل'' کے الفاظ ہیں، جس کی طرف فاضل ناقد کی توجہ نہیں ہو سکی۔

چنانچہ ماہنامہ ''برہان'' میں یہ پورا جملہ اس طرح سے ہے:

> ''مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم اور روس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کی غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی''۔

ماہنامہ ''الخیر'' اور ''ذاتی ڈائری'' کے مضمون میں بھی ''غیرت مند دل'' الفاظ ہیں۔

ماہنامہ ''برہان'' اور ''الخیر'' نیز ''ذاتی ڈائری'' کا اصل مفصل مضمون آگے آ رہا ہے، جو ہم نے مذکورہ رسائل کی اصل فائلیں حاصل کر کے ان سے براہِ راست نقل کیا ہے۔

ماہنامہ ''البلاغ'' ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ہماری اصل کتاب میں ''عقیدت مندوں'' کے

الفاظ ہیں، ان میں سے کسی میں بھی ''غیرت مند'' کے الفاظ نہیں۔

چنانچہ مذکورہ دونوں رسائل میں درجِ ذیل الفاظ ہیں:

''مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم وروس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کی غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے عقیدت مندوں میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی''۔

ممکن ہے کہ اصل عبارت میں ''عقیدت مندوں'' کے الفاظ ہوں، لیکن بعد والوں نے ''مند'' کے بعد ''واو'' کو ''د'' اور ''نون غنہ'' کو ''ل'' سمجھ لیا ہو، یا اس کے برعکس ہو، کیونکہ اخبارات کی لکھائی عام طور پر چھوٹی ہوتی ہے، اور پہلے زمانہ میں لکھائی عموماً کاتب ہاتھ سے کیا کرتے تھے، اور عکسی نقل میں بالخصوص جب کہ ایک عرصے بعد کسی کاغذ کی عکسی نقل حاصل کی جائے، اس طرح کی غلطی کا امکان ہوتا ہے، لیکن اس سے حضرت مدنی کے مضمون کے اس اصل مقصود پر فرق نہیں پڑتا، جو زیرِ بحث ہے۔

ماہنامہ ''البلاغ'' اور ''انوارِ مدینہ'' وغیرہ میں اصل ماخذ سے مضمون کو نقل کر کے شائع کیا گیا ہے، تو اس کے الفاظ کو غلط قرار دینے اور ایسے الفاظ کو صحیح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، جن کا ابھی تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا

## ''حجاز پہنچے'' اور ''پہنچے ہیں'' میں تبدیلی کا الزام

اس کے بعد فاضل ناقد نے ہمارے مضمون اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مضمون میں تحریف کا الزام عاید کرتے ہوئے ''جب حجاز پہنچے'' کے الفاظ کو ''جب حجاز پہنچے ہیں'' سے تحریف کرنے

کا حکم لگایا ہے۔

حالانکہ اولاً تو دونوں طرح کے الفاظ سے اصل مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، جیسا کہ فصل نمبر 1 کے آخر میں بھی گزرا۔

دوسرے ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' دونوں میں ایک ہی طرح کے الفاظ ہیں، اوران دونوں رسائل میں اصل مآخذ سے مضمون کو نقل کیا گیا ہے، اور ہم نے اپنی کتاب میں ماہنامہ ''البلاغ'' سے مضمون کو نقل کیا ہے، اور ماہنامہ ''البلاغ'' کے مضمون کا ماہنامہ ''برہان'' کے مضمون کو اصل اور مآخذ بنانے کی موصوف صراحت کر چکے ہیں۔

تیسرے فاضل ناقد نے دونوں طرح کے حوالہ جات کی نشان دہی جن الفاظ سے کی ہے، وہ بھی اصل کے مطابق نہیں، کیونکہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ہماری کتاب میں ''جب حجاز میں پہنچتے ہیں'' کے الفاظ ہیں، اور فاضل ناقد کہتے ہیں کہ ہماری کتاب اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں ''جب حجاز پہنچے ہیں'' کے الفاظ ہیں، لہٰذا فاضل ناقد کا یہ اعتراض درست نہیں۔

چوتھے ماہنامہ ''برہان'' میں ''جب حجاز میں پہنچے'' کے الفاظ ہیں، نہ کہ فاضل ناقد کے دعوے کے مطابق ''جب حجاز پہنچے'' جو کہ فاضل ناقد کے دعوے کے مطابق خود ان کی طرف سے تحریف ہے۔

پھر ہمارے نزدیک دونوں طرح کے الفاظ سے اصل مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ دونوں طرح کے الفاظ کا ذیل میں تقابل کرنے سے معلوم ہوگا۔

(1) ''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی''۔ (ماہنامہ ''البلاغ'' ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'')

(2) مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا

شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ (ماہنامہ ''برہان'')

قارئینِ کرام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا دونوں عبارات میں مفہوم کے اندر، کون سا فرق پیدا ہو جاتا ہے، جس پر نزاع کھڑا کیا جائے، یا اس سے بڑھ کر اصل مضمون ہی کی تحریف کا الزام عائد کر کے تردید کی کوشش کی جائے۔

ماہنامہ ''البلاغ'' ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ماہنامہ ''برہان'' تینوں کے اصل مضامین آگے بالترتیب تفصیل کے ساتھ آ رہے ہیں۔

## ''رحمۃ اللہ علیہ'' میں تبدیلی کا الزام

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' سے ایک جگہ مضمون نقل کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی نشان دہی درج ذیل طریقہ پر کی ہے:

> انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند ☆ رحمۃ اللہ علیہ سرشاد ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کر دیں''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۴)

شاید فاضل ناقد کا مقصد یہ ہو کہ شیخ الہند کے بعد ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے الفاظ نہیں لکھے گئے، حالانکہ اولاً تو یہ الفاظ نہ ''ماہنامہ برہان'' میں ہیں، اور نہ ''ماہنامہ البلاغ'' میں اور نہ ہی ''ماہنامہ انوارِ مدینہ'' میں، البتہ ''ماہنامہ الخیر'' میں ہیں۔

اگر فاضل ناقد ان الفاظ کے اضافے کو ترجیح دیتے ہیں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اچھی بات ہے، اور اس طرح نقل در نقل عبارات میں استعمال عام ہے، جس میں کوئی عیب نہیں، لیکن اگر فاضل ناقد اس کو تحریف کے مفہوم میں داخل کرتے ہیں، تو ماہنامہ ''برہان'' کو ترجیح دینے کی وجہ سے اس کا مصداق وہ خود بنے ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض کاتب کسی بزرگ کے نام کے ساتھ صرف ''رح'' کا چھوٹا سا نشان لگادیتے ہیں، بعض یہ بھی نہیں لگاتے، اور بعض پورا ''رحمۃ اللہ علیہ'' جب کہ بعض ''رحمہ اللہ'' یا اس سے ملتا جلتا دعائیہ کلمہ لکھ دیتے ہیں، اس سے اصل مقصود پر فرق نہیں پڑتا، اور اس طرح کے فرق کو تحریف یا تبدیلی قرار نہیں دیا جاتا۔

اس کے علاوہ فاضل ناقد کے نقل کردہ مضمون میں ''سرشاذ'' کے الفاظ ہیں، جب کہ ''ماہنامہ'' برہان''، ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' بلکہ ماہنامہ ''الخیر'' اور ''ذاتی ڈائری'' میں سب جگہ ''سرشار'' کے الفاظ ہیں۔

معلوم نہیں کہ فاضل ناقد اپنی کتاب میں درج اس غلطی کو اپنی متعدد اغلاط کی طرح دوسروں کے حق میں صادِر کردہ فیصلوں کی مانند تحریف کے مفہوم میں شمار کریں گے، یا کسی اور مفہوم میں؟ لیکن ساتھ ہی مومن ہونے کی وجہ سے، انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی:

لاَ یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ، حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهِ .(بخاری، رقم الحدیث ۱۳، کتاب الایمان، باب: من الإیمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه)

ترجمہ: تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے، جس چیز کو اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔(بخاری)

چنانچہ ''البلاغ'' اور انوارِ مدینہ'' میں اس موقع پر درج ذیل الفاظ ہیں:

انھی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند سرشار ہورہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں۔(البلاغ، انوارِ مدینہ)

اور ''برہان'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

انھی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند سرشار ہورہے تھے، ان کے

باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں۔(برہان)

''ماہنامہ البلاغ'' نیز ''ماہنامہ انوارِ مدینہ'' کے بارے میں پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ان کا اصل ماخذ ''اخبار مدینہ بجنور'' ہے۔

## ''وہ آئے'' اور ''آئے اور'' میں تبدیلی کا الزام

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' سے ایک جگہ مضمون نقل کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی نشان دہی درج ذیل طریقے پر کی ہے:

''تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں، آئے ☆ اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے''۔(یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

اس موقع پر فاضل ناقد نے ''آئے'' کے بعد جو نشان دہی کی ہے، اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ہماری کتاب میں یہاں تبدیلی کی گئی ہے، کیونکہ ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں اور ہماری کتاب میں جو کہ ماہنامہ ''البلاغ'' سے منقول ہے، اس میں ''وہ آئے اور'' کے الفاظ ہیں۔

چنانچہ ''البلاغ'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ وہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے۔(البلاغ)

ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت

ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ وہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ و پَو کرنے لگے۔ (انوارِ مدینہ) [1]

[1] ''تگ و پَو'' اور ''تگ و دو'' یہ الفاظ ایک دوسرے کے مترادف استعمال ہوتے ہیں، جن کے معنیٰ ''دوڑ دھوپ'' اور ''تلاش و جستجو'' کرنے کے آتے ہیں (ملاحظہ ہو: فیروز اللغات، صفحہ ۲۷۲، مادۃ ''ت گ'' مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ)

''برہان'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ و دو کرنے لگے۔ (برہان)

اس سلسلے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہمارا مضمون ماہنامہ ''البلاغ'' سے منقول ہے، اور ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کا مضمون ''اخبار مدینہ، بجنور'' سے منقول ہے، جو کہ اصل ماخذ ہے۔

کسی بھی صاحبِ فہم کے لیے یہ بات سمجھنا دشوار نہیں کہ دونوں قسم کے الفاظ سے اصل مفہوم پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، لہٰذا اس قسم کی بحث سے اصل مدعا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## ''شمع'' اور ''شموع'' میں تبدیلی کا الزام

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' سے ایک جگہ مضمون نقل کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی نشان دہی درج ذیل طریقہ پر کی ہے:

''کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع ☆ کو روشن کیا، مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شموع ☆ کو بجھا دیا''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

اس سے فاضل ناقد کا مقصود یہ ہے کہ اصل مضمون میں پہلی جگہ ''شمع'' اور دوسری جگہ

''شموع'' تھا۔

چنانچہ ''برہان'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شموع کو بجھا دیا۔ (برہان)

لیکن ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں دونوں جگہ ''شمعوں'' کے الفاظ ہیں۔

چنانچہ ''البلاغ'' اور ''انوارِ مدینہ'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمعوں کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا۔ آپ کی حسرت و یاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ (البلاغ، انوارِ مدینہ)

فاضل ناقد کی اس بات کا جواب بھی وہی ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کا مضمون اصل ماخذ سے نقل کیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک وہی راجح ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں جگہ اردو زبان میں جمع کا صیغہ ہی زیادہ موزوں ہے، ایک جگہ واحد کا اور دوسری جگہ جمع کا صیغہ زیادہ موزوں نہیں۔

علاوہ ازیں اردو زبان میں ''شمع'' کی جمع کا صیغہ ''شموع'' استعمال نہیں ہوتا، اور عربی زبان میں بھی ''شموع'' ''شمع'' کی جمع نہیں۔ [1]

---

[1] مقلوبه (ش م ع)

الشمع والشمع: موم العسل .الواحدة شمعة وشمعة .قال يعقوب: والمولدون يقولون شمع، وقد غلط، لأن الشمع والشمع: لغتان فصيحتان.

وأشمع السراج: سطع نوره.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

یہ تمام بحث بھی اس لیے کی گئی ہے کہ اس موقع پر الفاظ کی تبدیلی یا تحریف کا الزام عائد کردیا گیا ہے، ورنہ اس قسم کے الفاظ میں فرق سے اصل مدعا پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا، بہت سی اغلاط پروف ریڈنگ کی بھی شمار ہوتی ہیں، اور اس طرح کی بے شمار اغلاط خود فاضل ناقد کی ترتیب شدہ زیرِ تبصرہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' اور ان کے دوسرے مضمون میں بھی پائی جاتی ہیں، جن کو احاطۂ شمار میں لانا آسان نہیں۔

## ''حصہ تھا'' اور ''حصہ شامل تھا'' میں تبدیلی کا الزام

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' سے ایک جگہ مضمون نقل کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی نشان دہی درج ذیل طریقے پر کی ہے:

''افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل ☆ تھا''۔ (یادگارِ اکابر، ص ۹۲۵)

اس سے فاضل ناقد کا مقصود یہ ہے کہ اصل مضمون میں ''حصہ'' کے بعد ''شامل'' کے الفاظ تھے۔

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

والشمع والشموع، والشماع، والشماعة، والمشمعة: الطرب والضحک والمزاح، قال المتنخل الهذلی:

سأبدؤهم بمشمعة وأثنی ...بجهدی من وساد أو بساط

أراد: من طعام وبساط.

والشموع: الجارية اللعوب الضحوک الآنسة .وقيل: هی المزاحة الطيبة الحديث، التی تقبلک ولا تطاوعک علی ما سوی ذلک .وقيل الشموع: اللعوب الضحوک فقط .وقد شمعت تشمع شمعا وشموعا .ورجل شموع: لعوب ضحوک .والفعل کالفعل والمصدر کالمصدر .وقول أبی ذؤيب يصف الحمار:

فلبثن حينا يعتلجن بروضة ...فيجد حينا فی العلاج ويشمع

قال الأصمعی: معناه: يلعب لا يجاد .(المحکم والمحيط الاعظم لابی الحسن علی بن إسماعيل بن سيده المرسی، ج ا ص ۳۸۸، باب العين والشين والميم)

www.idaraghufran.org

''برہان'' میں درجِ ذیل الفاظ ہیں:

افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا۔ (برہان)

لیکن ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں ''بڑا حصہ تھا'' کے الفاظ ہیں ''شامل'' کا لفظ نہیں۔

''البلاغ'' اور ''انوارِ مدینہ'' میں درجِ ذیل الفاظ ہیں:

افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔ (البلاغ، انوارِ مدینہ)

اس کا جواب بھی وہی ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کا مضمون اصل ماخذ سے نقل کیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک یہ الفاظ اصل ماخذ کے مطابق ہیں، جن سے اصل مقصود پر فرق نہیں پڑتا، لیکن اگر بتادرِ ذہنی اور عام فہمی کے لیے ''شامل'' کا لفظ بڑھا دیا جائے، تو اس کو تحریف نہیں کہا جائے گا، اور اگر اس کے باوجود ناقد کے بقول یہ تحریف ہے، تو اس کا ارتکاب ناقد کے معتبر ماخذ یعنی ''البرہان'' میں ہوا ہے۔

مذکورہ الفاظ میں سے جو الفاظ بھی فاضل ناقد کے نزدیک معتبر اور زیادہ بہتر ہوں، ان کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، جس میں نزاع اور جھگڑے یا بحث ومباحثہ کی کوئی بات نہیں۔

## ''متخالف امور وطرز ہوتے'' میں تبدیلی کا الزام

فاضل ناقد نے ''ماہنامہ برہان'' سے ایک جگہ مضمون نقل کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی نشان دہی درج ذیل طریقے پر کی ہے:

''بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے ☆ ہیں''۔

(یادگارِ اکابر، ص ۹۲۷)

www.idaraghufran.org

اس سے فاضل ناقد کا مقصود یہ ہے کہ اصل مضمون میں ''متخالف اُمور وطرز ہوتے'' کے الفاظ تھے۔

چنانچہ ''برہان'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے ہیں۔(برہان)

لیکن ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں ''متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں'' کے الفاظ ہیں۔

چنانچہ ''البلاغ'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔(البلاغ)

''انوارِ مدینہ'' میں درج ذیل الفاظ ہیں:

بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور مخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔(انوارِ مدینہ)

اس کا جواب بھی وہی ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کا مضمون اصل ماخذ سے نقل کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک یہ الفاظ اصل ماخذ کے مطابق اور راجح ہیں، اور متخالف و مخالف کے معنیٰ بھی ایک جیسے ہی ہیں۔

البتہ اگر پھر بھی فاضل ناقد کو ماہنامہ ''برہان'' کے الفاظ کے درست ہونے اور ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے الفاظ غلط ہونے پر اصرار یا اس کی خواہش ہو، تو یہ ان کا معاملہ ہے، لیکن ان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اصل ماخذ سے نقل کرنے والوں پر کسی دوسرے مضمون کی بنیاد پر تحریف وتبدیلی کے ارتکاب کا الزام عائد کریں۔

حضرت مدنی کے مضمون کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے شعبان 1417 ہجری، دسمبر 1996 عیسوی کے ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی میں شائع فرمایا تھا، ہم نے اپنی کتاب میں ماہنامہ ''البلاغ'' کے مذکورہ شمارہ سے ہی حضرت مدنی کے اس مضمون کو نقل کیا ہے، جس کو یہاں اگرچہ دوبارہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن فاضل ناقد نے اس رسالے کا

دوسرے رسائل سے تقابل کر کے مضمون کے الفاظ بدلنے اور تحریف کرنے کا الزام عائد کیا ہے، اس لیے آگے ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اور ماہنامہ ''برہان'' کے ساتھ ساتھ ماہنامہ ''البلاغ'' کا مکمل مضمون بھی آئے گا، تاکہ قارئین کو ان تمام رسائل میں شائع شدہ مضمون میں تقابل کر کے خود سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ ان میں کہاں کہاں تعارض ہے، اور کہاں کہاں تحریف ہوئی ہے؟

ہمیں اس سے پہلے ''ماہنامہ الخیر'' اور ''ذاتی ڈائری'' میں تحریر شدہ حضرت مدنی کا مضمون دستیاب نہ ہو سکا تھا، اب بحمد اللہ تعالیٰ وہ بھی بعض احباب کی کوششوں سے دستیاب ہو گیا، اور اس کو بھی آگے شامل کر لیا گیا۔

## (1)..... حضرت مدنی کا ''البلاغ'' میں شائع شدہ مکمل مضمون

ماہنامہ ''البلاغ'' میں حضرت مدنی کا جو بیان و مضمون شائع ہوا، وہ ذیل میں مکمل طریقے پر نقل کیا جاتا ہے:

> ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہو رہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کر دیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط و تفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کی روشنی کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات و نصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے (جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تا دمِ مرگ ان کو ملک در ملک پھراتا رہا تھا) رائے قائم فرمائیں۔
>
> مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم نہایت ذکیُ الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی

ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوان شباب کی غلط کاریاں اور لغو و بے معنیٰ حرکات جو اس زمانے میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں، مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغلِ علمی میں انہماک رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ ان کی ذکاوت اور علمی دل چسپی اور استقامت ہی کی بنا پر ان سے بہت زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتداء ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے، تا آنکہ اکثر مضامین ان کتب کے اِن کو اَز بر ہو گئے تھے۔

دارُالعلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانے کے وہیں کے اکابرِ طریقت سے بھی تعلق شدید رہا۔ انھوں نے علمِ ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ، تگ و دو جاری رکھی، جس کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے ان کو 1326 ہجری سے اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً ساکت و صامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغلِ قلبیہ اور معارفِ علمیہ میں منہمک، عبادات اور اعمالِ صالحہ کے دل دادہ، بزرگانِ دین اور اکابر امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت و سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی حرمت اور احادیثِ نبویہ اور کتبِ دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے، اور جاہِ دنیاوی

اور عزت فی الخلق کو لاشئ محض خیال کرتے تھے، امراء اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی، غربا اور فقرا، طلبا اور اہلُ اللہ سے ان کو انسِ عظیم تھا۔ دن رات اسی اصلاحِ عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت ان کا مشغلہ اور نصبُ العین تھا۔

اسی نصبُ العین کے ماتحت دارُالعلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انھوں نے جمعیۃُ الانصار قائم کی اور اسی کے لئے انھوں نے دہلی میں مدرسہ معارفُ القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانے میں ان کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا اس نصبُ العین کے زیرِ سایہ رہتا تھا۔

مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم و روس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کی غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے عقیدت مندوں میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت رحمہ اللہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تأثر قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لیے چندہ کی تحریک کی، جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھ دار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامینِ ''الہلال'' نے جو اس زمانہ میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالمِ وجود سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے، اس لیے بجز آزادیِ ہندوستان کوئی صورت ممالکِ اسلامیہ کی امداد اور

خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہوسکتی۔ انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند سرشار ہورہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں اور مجبور کردیا کہ خود ہی سربکف ہوکر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصبُ العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ بالخصوص آزادیِ ہندان کا نصبُ العین ہوگیا، جس کے نتیجے میں اب ان کی زندگی، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سوچ بچار صرف آزادیِ ہندوستان اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ ہوگئی۔

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ وہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے۔ بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہوگیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، افکار تھے تو اسی کے، زبان پر ذکر تھا تو اسی کا، تدبیریں تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کرکے اپنی امیدوں کی شمعوں کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا۔ آپ کی حسرت ویاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا، وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ

شدید مایوسی بھی ان کے اعضا کو بے کار نہ کر سکی۔ جب امیر امانُ اللہ خان سریر آرائے سلطنت ہو گئے تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ [1]

افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ یہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبیداللہ کی فتح ہے۔ یقیناً جو اسکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی وہ اگر بروئے کار آ جاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیمُ الشان کامیابی ہو جاتی۔ مگر مشرقی کمان کی خیانت نے

---

[1] ہندی اہلِ تحریک اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی یہ غلط فہمی رہی کہ وہ شروع میں امیر حبیبُ اللہ خان کو انگریزوں کا دشمن اور مسلمانانِ ہند کا خیر خواہ سمجھتے رہے کہ فرنگی افواج، یورپ میں مشغولِ جنگ ہیں، امیر حبیبُ اللہ خان، خیبر و پشاور کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ کر دے، اس کے حملہ کرتے ہی دہلی، کلکتہ، بمبئی، پنجاب و سرحد ہر جگہ اہلِ ہند انگریزی اقتدار سے بغاوت کر دیں۔

دوسری طرف ترکی وزیرِ جنگ انور پاشا، حج کرنے کے لئے حجاز آئے، ان کو سمندری راستہ سے، ہندوستان پر بحری حملہ کے لیے آمادہ کرنے کی غرض سے خود شیخُ الہند حج کے عنوان سے حجاز پہنچے۔

اندرونِ ملک بغاوت کرانے کا پروگرام ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور کانگریسی قیادت کے تحت ہونے کا پروگرام تھا۔

اس طرح ریشمی رومال تحریک کے یہ تین مراحل تھے، جن کو باہم مربوط کر لیا گیا تھا، شاید تاریخیں بھی مقرر کر لی گئی تھیں، ایک امیر حبیبُ اللہ خان کا خیبر و پشاور کے راستہ سے حملہ کرنا، دوسرے ترکوں کا بحری حملہ کرنا، تیسرے اندرونِ ملک بغاوت جس کے لیے ہند کے اندرون میں محمد علی جوہر تیار تھے، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے افغانستان سے ایک خط اور ریشمی رومال بھیجا تھا، جو امیر حبیبُ اللہ خان کی سازش سے پکڑا گیا۔ ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف ۔۔۔ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

جس امیر حبیبُ اللہ خان پر سہارا رکھا گیا، وہ انگریز کا وظیفہ خوار تھا، جس نے ریشمی رومال تحریک کا سارا راز فاش کروایا، اس کے نتیجے میں حجاز میں شیخُ الہند بھی گرفتار ہو گئے، اور اندرونِ ملک بغاوت کا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔

پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا سندھی 1915ء میں کابل گئے، مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے افغانستان سے حملہ کرایا جائے، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ تو محض ایک خیال خام تھا، شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان، انگریزوں کے زیرِ اثر ہیں“۔ (افادات وملفوظات ص ۴۴، بعنوان: مکہ معظّمہ علمی وسیاسی دلچسپیاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

www.idaraghufran.org

تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کردی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کرلی گئی۔ [1]

یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی سرگرمیاں اوران کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجے کی اسکیمیں ایسی نہ تھیں کہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخران کو کابل، افغانستان سے نکل جانا پڑا، حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جاچکی تھی۔ یہ تیسرا دھکا تھا، جس کا سخت صدمہ ان کو برداشت کرنا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کی شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز، یمن، نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہوجانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آجانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹائے۔ بالخصوص اصحابِ حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی کلفت پیش

---

[1] انگریزوں کو یہی غلط فہمی مارگئی، ورنہ مولانا عبیداللہ صاحب کو تو اس جنگ میں محاذ پر لے جایا ضرور گیا، لیکن وہ بے دست وپا حیثیت سے رکھے گئے، مولانا سندھی صاحب اسی شکست خوردہ کمان کے ہمراہ محاذ پر رہے تھے، جس کا آپ کو قلق بھی تھا۔

ظفر حسن ایبک کی خاطرات میں یہ موقع پڑھنے کے لائق ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے بارے میں یہ حسنِ ظن محض ہندی مسلمانوں کی خوش فہمی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی کمان کے ہڈحرام افغان فوجی اپنے کمانداں سمیت نہایت رذیل لوگ تھے، انھوں نے اس جنگ کو سنجیدگی سے لڑا ہی نہیں، وہ تو محاذِ جنگ پر ایسے رہے، جیسے خالہ جی کا گھر ہو، نتیجہ ظاہر ہے کہ اس محاذ پہ عبرت ناک شکست ہوئی، رہا معاملہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا، تو وہ اس محاذ پر کمان دان کے ایک نظر بند قیدی کی حیثیت رکھتے تھے۔

جن کو کابلیوں نے اہمیت نہ دی، وہ تو بھلا ہوٹھل (موجودہ ٹل، نزد کوہاٹ) کے محاذ کے سپہ سالار جنرل نادر خان کا، جو بعد میں شاہِ افغانستان بنے کہ انھوں نے ظفر حسن ایبک کو اپنے ساتھ رکھ کر اور ایبک کی ذکاوت وذہانت سے فائدہ اٹھا کر اس محاذ پر فرنگیوں کو پسپا کیا، اور افغان فوجیوں کا بھرم رہ گیا۔

ورنہ فرنگیوں کو اندازہ ہوتا کہ نادر خان کے چند دستوں کے علاوہ کس قدر ہڈحرام اور نالائق فوج محاذ پر پڑی ہے، تو وہ کبھی صلح کی پیش کش نہ کرتے، بلکہ کابل پہنچ کر دَم لیتے۔ محمد امجد حسین۔ ادارہ غفران۔

www.idaraghufran.org

آئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے قلب اور دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا وہ سوائے خداوندِ کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ وہ چوتھا عظیم الشان صدمہ تھا، جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت سَرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزہ اور اقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب، ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے، مال ومتاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں، موجود نہ تھا، نیز کہیں سے خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا، مالٹا میں قید تھے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ [1]

---

[1] جناب ظفر حسن ایبک صاحب جو کہ افغانستان، روس اور ترکی وغیرہ میں مولانا سندھی صاحب کے ہمراہ تھے، انھوں نے حضرت مدنی کی اس بات سے اختلاف کیا ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مولانا مدنی نے جو لکھا ہے کہ قبلہ مولانا (سندھی) صاحب کو کوسوں پیدل چلنا پڑا، یا بہت لمبے فاقے کاٹنے پڑے، بالکل غلط ہے، وہ روس آتے ہوئے، افغانستان میں جہاں موٹر یا ریل کی سڑک نہیں ہے، اور گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے، کبھی ایک قدم بھی پیدل چلنے پر مجبور نہیں ہوئے، اور نہ روس میں بھوکے رہے، وہ روسی گورنمنٹ کے مہمان تھے، اور اس واقعے کے بعد ان کے پاس روپیہ بھی کافی ہو گیا تھا۔ (خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ ۲۲۹، بارہواں باب ''مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ ماسکو میں'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

مزید لکھتے ہیں:

(تاشقند سے ماسکو، روانہ ہونے کے وقت) ہماری خوراک کا خرچ اور ریل کا کرایہ روسی گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا تھا، کیونکہ ہم ہندوستانی انقلابی ہونے کی وجہ سے روسی گورنمنٹ کے مہمان مانے گئے

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

تھے۔ (خاطرات ''آپ بیتی''، صفحہ ۲۳۱، بارہواں باب ''مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ ماسکو میں''
مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی''، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

تاہم کسی شخص کے دماغ کے متاثر ہونے کے لیے فقر وفاقہ وغیرہ کا پایا جانا ضروری نہیں، بلکہ بعض دیگر حوادث ومصائب اور خود جسمانی بیماری بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔

اسی طرح دوسرے مواقع پر اس طرح کے واقعات پیش آنے کا امکان ہے۔

چنانچہ پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا کو مکہ معظّمہ کے زمانہ قیام میں سخت معاشی پریشانیوں میں سے گزرنا پڑا۔ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا، ہندوستان سے بعض احباب کچھ بھیج دیتے تھے لیکن وہ ناکافی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان کے پاس صرف اللہ کا نام رہ گیا، اور فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دو تین دن تک کھانے کو کچھ میسر نہ آیا، شاید عید الفطر کا دن تھا۔ مولانا نے اپنے عزیز سے جو زندگی بھر ان کی خدمت میں رہے ہیں، فرمایا کہ میں نماز کے لیے خانہ کعبہ جاتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے غافل تو نہیں ہے، وہ کچھ دے گا تو کھا لیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس طرح کے فاقے کئی بار آئے ہیں لیکن طبیعت کبھی بددل نہیں ہوئی''۔
(مولانا عبیداللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۱۱۹۔ بعنوان: تصوف۔ مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

نیز پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے دورانِ گفتگو میں مولانا سے سوال کیا کہ کابل میں اپنی سات سال کی تگ ودو کی ناکامی کے بعد جو دراصل آپ کی اس سے پہلے کی پوری زندگی کی ناکامی تھی، آپ جب وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو اس صدمے کا جو ظاہر ہے، آپ کے لیے بڑا صدمہ تھا، آپ کے ذہن پر کیا اثر پڑا؟ مولانا نے ذاکر صاحب کے اس نہایت پُرمعنیٰ اور بڑے دوررس سوال کے جواب میں فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب! کابل سے افغانستان کی حدود اور وہاں سے ماسکو تک پہنچنے کے اس طویل سفر میں راستے میں جن جسمانی تکلیفوں اور دوسری مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، اس نے ذہن کو اتنی فرصت اور موقع ہی نہ دیا کہ وہ اس صدمے کے بارے میں کچھ سوچ بچار کرسکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر ذہن تمام تر ادھر مصروف نہ رہتا تو اس پر ایک طویل جدوجہد کے اس قدر ہولناک انجام کا کتنا سخت ردِعمل ہوتا اور میں اپنے ہوش وحواس اور پہلے تصورات ومعتقدات کہاں تک قائم رکھ سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ راستے کی مادی صعوبتوں نے مجھے اس ذہنی ابتلا سے محفوظ رکھا''۔ (افادات وملفوظات ص ۴۸ و ۴۹، بعنوان: مکہ معظّمہ علمی وسیاسی دلچسپیاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا مرحوم کا زندہ واپس آجانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ موت کے گھاٹ تک مولانا کو پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے قلب اور دماغ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر وغور اور جودتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہوچکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوجاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر

کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو نا ساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔ (یعنی اقرار کیا) ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس رتبے اور پوزیشن کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔

مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے ہی بہت زیادہ دقیق (یعنی باریک) ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ اُلجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّین قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی

www.idaraghufran.org

کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اوران کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔

**واللّٰہ الموفق**

**ربنا ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین**

(بشکریہ: ماہنامہ ''البلاغ'' جامعہ دارالعلوم کراچی، پاکستان، شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ، دسمبر 1996ء، صفحہ ۱۵ تا ۱۹)

## (2)..... حضرت مدنی کا ''انوارِ مدینہ'' میں شائع شدہ مکمل مضمون

مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری رحمہ اللہ کی طرف سے فراہم کردہ ''اخبار مدینہ، بجنور، انڈیا'' میں شائع شدہ مضمون کی ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں جو اشاعت ہوئی، اس کو مکمل طریقہ پر نقل کیا جاتا ہے:

ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہورہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کردیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کی روشنی کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات ونصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے (جو اُن

www.idaraghufran.org

کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک در ملک پھراتا رہا تھا) رائے قائم فرمائیں۔

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نہایت ذکیٔ الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوان شباب کی غلط کاریاں اور لغو و بے معنیٰ حرکات جو اس زمانے میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں، مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغلِ علمی میں انہماک رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز ان کی ذکاوت اور علمی دل چسپی اور استقامت ہی کی بنا پر ان سے بہت زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے، تا آنکہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہو گئے تھے۔

دارُالعلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانے کے وہاں کے اکابرِ طریقت سے بھی تعلق شدید رہا۔ انھوں نے علمِ ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ، تگ و دو جاری رکھی، جس کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے ان کو ۱۳۲۶ ہجری سے اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً ساکت و صامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغلِ قلبیہ اور معارفِ علیہ میں منہمک، عبادات اور اعمالِ صالحہ کے دل دادہ، بزرگانِ دین اور اکابر امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت

مند پائے جاتے تھے۔ [1]

ان کی ہر ہر حرکت وسکون اور ہر ہر قول وعمل سے متانت اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی حرمت اور احادیثِ نبویہ اور کتبِ دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے، اور جاہِ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشئ محض خیال کرتے تھے، امرا اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی، غربا اور فقرا، طلبا اور اہلُ اللہ سے ان کو انسِ عظیم تھا۔ دن رات اسی اصلاحِ عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت ان کا مشغلہ اور نصبُ العین تھا۔

اسی نصبُ العین کے ماتحت دارُ العلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ارشاد سے انھوں نے جمعیتُ الانصار قائم کی اور اسی کے لیے انھوں نے دہلی میں مدرسہ معارفُ القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانہ میں ان کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا اس نصبُ العین کے زیرِ سایہ رہتا تھا۔

مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم وروس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کی غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے عقیدت مندوں میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تأثر قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لیے چندہ کی تحریک کی، جس پر مسلمانانِ ہند نے

---

[1] ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں ''معارفِ علیہ'' کے الفاظ ہیں، جب کہ ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''برہان'' میں ''معارفِ علمیہ کے الفاظ ہیں، ''علمیہ'' کے معنیٰ تو واضح ہیں، اور ''علیہ'' بلند کو کہتے ہیں۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

عموماً لبیک کہا مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھ دار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی اور نہ قلق واضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامینِ ''الہلال'' نے جو اس زمانہ میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالمِ وجود سے بھی ہٹا دینا چاہتا ہے، اس لیے بجز آزادیِ ہندوستان کوئی صورت ممالکِ اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہوسکتی۔ انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند سرشار ہورہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں اور مجبور کردیا کہ خود ہی سربکف ہوکر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصبُ العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ بالخصوص آزادیِ ہندان کا نصبُ العین ہوگیا، جس کے نتیجے میں اب ان کی زندگی، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سوچ بچار صرف آزادیِ ہندوستان اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ ہوگئی۔

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ وہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ وپو کرنے لگے۔ [1]

بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہوگیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، افکار

---

[1] ''تگ وپو'' اور ''تگ ودو'' یہ الفاظ ایک دوسرے کے مترادف استعمال ہوتے ہیں، جن کے معنیٰ ''دوڑ دھوپ'' اور ''تلاش وجستجو'' کرنے کے آتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: فیروز اللغات، صفحہ ۲۷۲، مادۃ ''ت گ'' مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ)

www.idaraghufran.org

تھے تو اسی کے، زبان پر ذکر تھا تو اسی کا، تدبیریں تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمعوں کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا۔ آپ کی حسرت و یاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا، وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضا کو بے کار نہ کر سکی۔ جب امیر امانُ اللہ خان سر بر آرائے سلطنت ہو گئے تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ یہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبید اللہ کی فتح ہے۔ یقیناً جو اسکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی وہ اگر بروئے کار آ جاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیم الشان کامیابی ہو جاتی۔ مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کر دی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔ یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبید اللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کی سرگرمیاں اور ان کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجے کی اسکیمیں ایسی نہ تھیں کہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخر ان کو کابل، افغانستان سے نکل جانا پڑا، حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔ یہ تیسرا دھکا تھا، جس کا سخت صدمہ ان کو برداشت کرنا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کی شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز،

یمن، نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہو جانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آ جانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹائے۔ بالخصوص اصحابِ حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی کلفت پیش آئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے قلب اور دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا وہ سوائے خداوندِ کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ وہ چوتھا عظیم الشان صدمہ تھا، جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت سَرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزہ اور اقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب، ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے، مال و متاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں، موجود نہ تھا، نیز کہیں سے خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا، مالٹا میں قید تھے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا مرحوم کا زندہ واپس آ جانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلے ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ

موت کے گھاٹ تک مولانا کو پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے قلب اور دماغ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر وغور اور جودتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور زرافت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور مخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو نا ساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔ (یعنی اقرار کیا) ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی

اعلیٰ قابلیت اور پیش از پیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس رتبے اور پوزیشن کو مولانا مرحوم کے لئے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔

مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے ہی بہت زیادہ اَدَق ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ اُلجھن پیدا ہونے لگی، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّین قواعد وتالیفات پر پرَکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک ہی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔

**واللّٰہ الموفق**

**ربنا ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین**

(ماہنامہ ''انوارِ مدینہ لاہور، پاکستان''، اکتوبر 1997، جمادی الاخریٰ 1418 ہجری، ص ۵۱ تا ۵۵)

## (3)..... حضرت مدنی کا ''الخیر'' میں شائع شدہ مکمل مضمون

ماہنامہ ''الخیر'' ملتان کے اکتوبر 1993 عیسوی کے شمارہ میں حضرت مدنی کا یہ تاریخی مضمون ''مولانا عبیداللہ سندھی کی علمی وسیاسی زندگی اور تفردات کا پسِ منظر'' کے عنوان سے شائع ہوا، جو ہمیں ابھی تلاشِ بسیار کے بعد موصول ہوا، اس کو ماہنامہ ''الخیر'' کے شمارہ سے ذیل میں مکمل طریقہ پر بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہو رہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کر دیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورۂ ذیل معروضات کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات اور نصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے، جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک بہ ملک پھراتا رہا تھا، رائے قائم فرمائیں۔

مولانا عبیداللہ مرحوم ذکیُ الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوانِ شباب کی غلط کاریوں اور لغو، بے معنیٰ حرکات جو کہ اس زمانہ میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں، مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام

زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغلِ علمی میں انہماک رکھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ان کی ذکاوت اور علمی دل چسپی اور استقامت ہی کی بنا پر ان سے بہت زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے، تا آنکہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہو گئے تھے۔

دارُ العلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانے کے وہاں کے اکابرِ طریقت سے تعلق شدید رہا۔ انھوں نے علمِ ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ اور تگ و دو جاری رکھی، جن کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے ان کو سن ۱۳۲۶ ہجری اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً نہایت ساکت و صامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغلِ قلبیہ اور معارفِ علمیہ میں منہمک، عبادات اور اعمالِ صالحہ کے دل دادہ، بزرگانِ دین اور اکابرِ امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متأدب پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت اور رزانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی خدمت اور احادیثِ نبویہ اور کتبِ دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے، اور جاہِ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشئ محض خیال

کرتے تھے، امرا اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی، غربا اور فقرا، طلبا اور اہلُ اللہ سے ان کو انسِ عظیم تھا۔

دن رات اسی اصلاحِ عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت، مشغلہ اور نصبُ العین تھا۔

اسی نصبُ العین کے ماتحت دارُ العلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انھوں نے جمعیتُ الانصار قائم کی اور اسی کے لئے انھوں نے دہلی میں مدرسہ معارفُ القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانہ میں ان کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا اسی نصبُ العین کے زیرِ سایہ رہتا تھا۔

مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم اور روس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کے غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں اور بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کردی۔

حضرت رحمۃ اللہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تاثیرِ قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لئے چندہ کی تحریک کی، جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھ دار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، اور نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامینِ ''الہلال'' نے جو اس زمانے میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے ساتھ شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالمِ وجود

سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے، اس لیے بجز آزادیِ ہندوستان کوئی صورت ممالکِ اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہوسکتی۔

انھی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سرشار ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کر دیں اور مجبور کر دیا کہ خود بھی سر بکف ہو کر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔

انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصبُ العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ بالخصوص آزادیِ ہند اِن کا نصبُ العین ہوگیا، جس کے نتیجے میں اب ان کی زندگی، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سوچ بچار صرف آزادیِ ہندوستان اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ ہوگئی۔

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔

یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں، آئے، اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ و دو کرنے لگے۔

بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہوگیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، افکار تھے تو اسی کے، زبان پر ذکر تھا تو اسی کا، تدابیر تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے

حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شموع کو بجھا دیا۔ اوران کی حسرت ویاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا، وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضا کو بے کار نہ کر سکی۔ جب امیر امانُ اللہ خان سریر آرائے سلطنت ہو گئے تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ ''کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبیداللہ کی فتح ہے''۔

یقیناً جو اسکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی وہ اگر بروئے کار آجاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیمُ الشان کامیابی ہو جاتی۔ مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کر دی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی سرگرمیاں اوران کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجے کی اسکیمیں ایسی نہ تھیں کہ وہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخران کو کابل، بلکہ افغانستان سے نکل جانا پڑا، حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔

یہ تیسرا دھکا تھا، جس کا سخت صدمہ ان کے قلب اور دماغ کو اٹھانا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانہ میں ترکی حکومت کو شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز، یمن اور نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہو جانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آجانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ

لوٹائے۔ بالخصوص اصحابِ حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی کلفت پیش آئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے قلب اور دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا، وہ سوائے خداوندِ کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

یہ وہ چوتھا عظیم صدمہ تھا، جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت سَرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشاں رہے۔ اعزہ واقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب، ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے، مال ومتاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں، موجود نہ تھا، نیز خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخُ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا، مالٹا میں قید تھے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔

ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا کا زندہ واپس آ جانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟

اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانائے مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب

کے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، وہ حلم وبردباری، وہ سکون وسکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور و طرز ہوتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان احوالِ متضاد میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو ناساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔

ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں

میں اس پوزیشن اور رتبے کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل ہونے نہ دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔

مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کے بنا پر پہلے بھی بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لئے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ اُلجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ اور ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اس کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔

(ماہنامہ ''الخیر'' ملتان، صفحہ ۱۷ تا ۲۳، ربیع الثانی 1414 ہجری، اکتوبر 1993 عیسوی)

www.idaraghufran.org

## (4)..... حضرت مدنی کا ''برہان'' میں شائع شدہ مکمل مضمون

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعلق حضرت مدنی کا یہ مضمون اُن کی حیات میں سب سے پہلے سہ روزہ ''مدینہ بجنور'' میں 17 مارچ 1945ء کو شائع ہوا تھا، جس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا یہ مضمون اسی زمانہ میں اگلے ماہ ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے شمارے اپریل 1945ء میں بھی شائع ہوا تھا۔

ماہنامہ ''برہان'' میں حضرت مدنی کا جو مضمون شائع ہوا، وہ ماہنامہ ''برہان'' کے شمارے سے ذیل میں مکمل طریقہ پر بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہو رہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کر دیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات اور نصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے، جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک بہ ملک پھراتا رہا تھا، رائے قائم فرمائیں۔

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ذکیُ الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوان شباب کی غلط کاریوں اور لغو و بے معنیٰ حرکات جو کہ اس زمانہ میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں، مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغلِ علمی میں انہماک رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ان کی

ذکاوت اور علمی دل چسپی اور فقاہت ہی کی بناء پر ان سے بہت زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے، تا آنکہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہو گئے تھے۔

دارُالعلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانے کے وہاں کے اکابرِ طریقت سے بھی تعلق شدید رہا۔ انھوں نے علمِ ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ، تگ و دو جاری رکھی، جس کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے ان کو ۱۳۲۶ ہجری اور اس کے مابعد کے زمانے میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً نہایت ساکت و صامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغلِ قلبیہ اور معارفِ علمیہ میں منہمک، عبادات اور اعمالِ صالحہ کے دل دادہ، بزرگانِ دین اور اکابر امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متأدب پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت اور رزانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی خدمت اور احادیثِ نبویہ اور کتبِ دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے، اور جاہِ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشئ محض خیال کرتے تھے، امرا اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی، غربا اور فقرا، طلبا اور اہلُ اللہ سے ان کو انسِ عظیم تھا۔ دن رات اسی اصلاحِ عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی

جراثیم سے حفاظت مشغلہ اور نصبُ العین تھا۔

اسی نصبُ العین کے ماتحت دارُالعلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انھوں نے جمعیۃُ الانصار قائم کی اور اسی کے لئے انھوں نے دہلی میں مدرسہ معارفُ القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانہ میں ان کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا اسی نصبُ العین کے زیرِ سایہ رہتا تھا۔

مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم اور روس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کی غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی۔

حضرت رحمۃ اللہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تأثر قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لیے چندہ کی تحریک کی، جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھ دار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامینِ ''الہلال'' نے جو اس زمانے میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے ساتھ شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالمِ وجود سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے، اس لیے بجز آزادیِ ہندوستان کوئی صورت ممالکِ اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہوسکتی۔ انھی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند سرشار ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی

موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں اور مجبور کردیا کہ خود ہی سر بکف ہوکر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصبُ العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ بالخصوص آزادیِ ہندان کا نصبُ العین ہوگیا، جس کے نتیجہ میں اب ان کی زندگی، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سوچ بچار صرف آزادیِ ہندوستان اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ ہوگئی۔

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ آئے اور اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے۔ بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہوگیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، افکار تھے تو اسی کے، زبان پر ذکر تھا تو اسی کا، تدبیر تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کرکے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شموع کو بجھا دیا۔ ان کی حسرت ویاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا، وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضا کو بے کار نہ کرسکی۔ جب امیر امانُ اللہ خان سریر آرائے سلطنت ہوگئے تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ

شامل تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبیداللہ کی فتح ہے۔ یقیناً جو اسکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی وہ اگر بروئے کار آجاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیم الشان کامیابی ہوجاتی۔ مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کردی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کرلی گئی۔ یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی سرگرمیاں اور ان کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجہ کی اسکیمیں ایسی نہ تھیں کہ وہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخر ان کو کابل، بلکہ افغانستان سے نکل جانا پڑا، حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جاچکی تھی۔ یہ تیسرا دھکا تھا، جس کا سخت صدمہ ان کے قلب اور دماغ کو اٹھانا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کو شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز، یمن، نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہوجانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آجانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹائے۔ بالخصوص اصحابِ حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی کلفت پیش آئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے قلب اور دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا وہ سوائے خداوندِ کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ وہ چوتھا عظیم صدمہ تھا، جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہوکر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت سَرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزہ اور اقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب،

ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے، مال ومتاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہوجاتی ہیں، موجود نہ تھا، نیز خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جاسکتا تھا، مالٹا میں قید تھے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا کا زندہ واپس آجانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبید اللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانائے مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون و سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہوچکے

ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان احوالِ متضاد میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو ناساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔

ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس پوزیشن اور رتبے کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔

مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے بھی بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح

نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بناء پر اور بھی زیادہ اُلجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ اور ضروریاتِ دین اور عقائد اور اعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّین قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔ واللہ الموفق

**ربنا ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین۔**

(ماہنامہ ''برہان'' ندوۃ المصنفین، دہلی، جلد چہاردہم، شمارہ ۴، ربیع الثانی 1364ہجری، مطابق اپریل 1945ء، صفحہ ۲۴۵ الی ۲۵۱)

## (5)..... حضرت مدنی کا ''ذاتی ڈائری'' میں شائع شدہ مکمل مضمون

پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ اور حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب (زیارت کاکا صاحب، ضلع پشاور) نے ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' کو 1946 عیسوی میں ''ادبستان، لاہور'' سے شائع کرایا تھا۔

''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' میں، 1946 عیسوی کو حضرت مدنی کا جو مضمون

شائع ہوا، وہ ذیل میں مکمل طریقہ پر بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہوئے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کردیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورۂ ذیل معروضات کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور اپیل ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات اور نصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے، جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک بملک پھراتا رہا تھا، رائے قائم فرمائیں۔

مولانا عبیداللہ مرحوم ذکیُ الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے۔ عنفوانِ شباب کی غلط کاریوں اور لغو، بے معنیٰ حرکات جو کہ اس زمانہ میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں، مرحوم میں ان کا وجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانہ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا۔ کتب بینی اور مشاغلِ علمی میں انہماک رکھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ان کی ذکاوت، علمی دل چسپی اور استقامت ہی کی بنا پر ان سے زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کی کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے، تاآنکہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہوگئے تھے۔

دارُالعلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانے کے وہاں کے اکابر سے تعلق شدید رہا۔ انھوں نے علمِ ظاہر کے

مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ اور تگ و دو جاری رکھی، جن کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے ان کو سن ۱۳۲۶ ہجری اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً نہایت ساکت و صامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغلِ قلبیہ اور معارفِ علمیہ میں منہمک، عبادات اور اعمالِ صالح کے دل دادہ، بزرگانِ دین اور اکابرِ امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متأدب پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت اور رزانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی خدمت اور احادیثِ نبویہ اور کتبِ دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے، اور جاہِ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشئ محض خیال کرتے تھے، امرا اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی، غربا اور فقرا، طلبا اور اہلُ اللہ سے ان کو انسِ عظیم تھا۔

دن رات اسی اصلاحِ عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہر آلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت، مشغلہ اور نصبُ العین تھا۔

اسی نصبُ العین کے ماتحت دارُ العلوم کی ترقی کے لیے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انھوں نے جمعیتُ الانصار قائم کی اور اسی کے لیے انھوں نے دہلی میں مدرسہ معارفُ القرآن کی بنا ڈالی۔ اس زمانہ میں ان کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا اسی نصبُ العین کے زیرِ سایہ رہتا تھا۔

مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگِ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے، جنھوں نے سابقہ جنگِ روم اور روس اور جنگِ یونان

وغیرہ پر یورپین اقوام کے غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی اور حساس مسلمانوں اور بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کردی۔

حضرت رحمۃ اللہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تاثیرِ قوی کے ماتحت ہلالِ احمر کے لیے چندہ کی تحریک کی، جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھ دار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، اور نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی۔ ادھر مضامینِ ''الہلال'' نے جو اس زمانہ میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے ساتھ شائع ہوتے تھے، یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، بلکہ اس کو عالمِ وجود سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے، اس لیے بجز آزادیِ ہندوستان کوئی صورت ممالکِ اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہوسکتی۔

انھی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سرشار ہو رہے تھے، ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کردیں اور مجبور کردیا کہ خود بھی سربکف ہوکر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں۔

انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصبُ العین سے تقریباً ہٹ گئے اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ بالخصوص آزادیِ ہند اِن کا نصبُ العین ہوگیا، جس کے نتیجہ میں اب ان کی زندگی، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سوچ بچار صرف آزادیِ ہندوستان اور آزادیِ ممالکِ اسلامیہ ہوگئی۔

www.idaraghufran.org

تھوڑے ہی عرصے میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا۔

یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں۔ چنانچہ اپنی اپنی بساط کے موافق تگ ودو کرنے لگے۔

بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہو گیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، افکار تھے تو اس کے، زبان پر ذکر تھا تو اس کا، تدبیر تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیبُ اللہ خان صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا۔ مگر امیر حبیبُ اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا۔ اور ان کی حسرت ویاس کی کوئی حد باقی نہ رہی۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا تھا، وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضا کو بے کار نہ کر سکی۔ جب امیر امانُ اللہ سریر آرائے سلطنت ہو گئے تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگِ آزادی میں مرحوم کی اسکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ ”یہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبیداللہ کی فتح ہے“۔

یقیناً جو اسکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی وہ اگر بروئے کار آجاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیم الشان کامیابی ہو جاتی۔ مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کر دی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

یہ دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبیداللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولانا عبیداللہ صاحب کی سرگرمیاں اور ان کی ذہنی رسائی اور اعلیٰ درجہ کی اسکیمیں ایسی نہ تھیں کہ وہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخران کو کابل، بلکہ افغانستان سے نکل جانا پڑا، حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔

یہ تیسرا دھکا تھا، جس کا سخت صدمہ ان کے قلب اور دماغ کو اٹھانا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کو شکست اور عراق، شام، فلسطین، حجاز، یمن اور نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہو جانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آ جانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹائے۔ بالخصوص اصحابِ حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی تکلیف پیش آئی۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے قلب اور دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا، وہ سوائے خداوندِ کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

یہ وہ چوتھا عظیم صدمہ تھا، جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سال ہا سال ان سخت سے سخت سَرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزہ واقربا ساتھ نہ تھے، یار اور احباب، ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے، مال ومتاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں، موجود نہ تھا، نیز خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔

استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا، مالٹا میں قید تھے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف کے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی

اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔

ان عظیم الشان صدمات اور جاں گداز احوال میں مولانا کا زندہ واپس آ جانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟

اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیم غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانا مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، حلم و بردباری، وہ سکون و سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد امور و طرز ہوتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان متضاد امور میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ

اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو ناساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔

ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہوجانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس پوزیشن اور رتبے کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقین مستحق تھے۔

مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے بھی بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لئے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ اُلجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ

اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ اور ضروریاتِ دین اور عقائد و اعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد و تالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف و اکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد و اعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول و قوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اس کی تعلیم و تلقین کرتے رہے ہیں۔

**واللّٰہ الموفق**

**ربنا ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین۔**

(ذاتی ڈائری، صفحہ ۴۱ تا ۵۰، ناشر: ادبستان، بیرون موچی دروازہ، لاہور، بارِ اول: اکتوبر 1946 عیسوی)

## (6)..... حضرت مدنی کا ''صدق'' میں شائع شدہ مضمون

حضرت مدنی کے مضمون کا ایک حصہ ان کی حیات میں ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' میں بھی شائع ہوا تھا، جو حال ہی میں ہمیں صدق کی پرانی فائلوں میں دستیاب ہوا، جس کا مضمون درجِ ذیل ہے:

مولانا عبید اللہ سندھی

(از: مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ)

مولانا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سالہا سال ان سخت سے سخت اور اجنبی ملکوں میں

www.idaraghufran.org

سرگرداں و پریشان رہے۔ پے در پے مہینوں فاقے کرنے پڑے، میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔

برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جانگداز احوال میں مولانا مرحوم کا زندہ واپس آجانا قدرت کے عجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے؟

وطن اور مذہب کی آزادی کے لئے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلے ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں؟ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانائے مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی جان سخت ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانائے مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں میں پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون وسکوت، جس کو ہم پہلے سُنا کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلّانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے، باتیں زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور مخالف اُمور فرماتے

رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان احوالِ متضادہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بناء پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو ناسازگار احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کمترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے، ایسے احوال میں ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ کوششوں میں اختلال پیدا ہوجانا طبعی بات ہے (از: زمزم)

(ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' صفحہ ۴ وصفحہ ۸، جلد نمبر 10، شمارہ نمبر 50، دوشنبہ، 16 جمادی الاولیٰ 1364 ہجری، بمطابق 30 اپریل 1945 عیسوی)

ماقبل میں حضرت مدنی کے بیان کو ''ماہنامہ البلاغ، ماہنامہ انوارِ مدینہ، ماہنامہ الخیر، ماہنامہ برہان'' اور ''ذاتی ڈائری'' میں شائع ہونے والی تفصیل کے مطابق بالترتیب الگ الگ مکمل طور پر نقل کردیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ہفت روزہ ''صدق'' میں شائع شدہ حضرت مدنی کے مضمون کا ایک اقتباس بھی نقل کردیا گیا ہے۔

قارئینِ کرام ان رسائل وکتب کے الفاظ میں تقابل کرکے بآسانی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان میں کتنی تحریف وتبدیلی یا دل لگی کی گئی ہے، اور چند الفاظ وحروف کے باہمی فرق یا پروف ریڈنگ میں اکّا دکّا اغلاط سے تحریف کا دعویٰ، کتنی اہمیت رکھتا ہے؟ جس کے بعد اس کی حیثیت کا ''کھودا پہاڑ، نکلا چوہا'' سے زیادہ ثابت ہونا مشکل ہوگا۔

یہ بات سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ مذکورہ رسائل وکتب میں سے حضرت مدنی کے جس مضمون کو بھی اختیار کیا جائے، اس سے بحمد اللہ تعالیٰ اصل مقصود ومدعا پر فرق واقع نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ تعصّب وتحزّب سے محفوظ فرما کر راہِ اعتدال اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(فصل نمبر 3)

# حضرت مدنی کے بیان کی غلط تشریح کرنے کا الزام

فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب اوران کے مضمون کے بعض مقامات وعبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اس چیز سے بھی اختلاف ہے کہ اگر حضرت مدنی کے ''اخبار مدینہ، بجنور'' ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' وغیرہ میں شائع شدہ بیان ومضمون کو سچا تسلیم کرلیا جائے، تو اس بیان ومضمون کی جو تشریح وتوضیح عام طور پر پیش کی جاتی ہے، جس میں مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں مصائبِ غیر متناہیہ کی بنا پر قلبی ودماغی انقلاب اور دماغی توازن کھو بیٹھنے اور اس کی بنیاد پر مولانا سندھی کی علمی ومذہبی تقاریر اور تحریرات کے متضاد ومتخالف ہونے اور قرآن وسنت اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ اصول وقواعد اور مسلک کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح اور غلط افکار وخیالات کو رَد وقبول کرنے کا جو ذکر کیا جاتا ہے، اور اسی بنیاد پر اہلُ السنۃ والجماعۃ اور ان کے اکابر کے اصولوں کے خلاف پائے جانے والے افکار وخیالات کے غیر معتبر ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے، وہ درست نہیں ہے۔

حالانکہ ہماری نظر میں حضرت مدنی کی تحریر سے یہ امور انصاف واعتدال پسند کے لیے واضح اور عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں، جس کی ذیل میں کچھ وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

# حضرت مدنی کے بیان کی توضیح

حضرت مدنی کے اصل بیان کو مکمل ومفصل طریقے پر پیچھے فصل نمبر 2 کے آخر میں ''ماہنامہ البلاغ، ماہنامہ انوارِ مدینہ'' اور ''ماہنامہ برہان'' سے الگ الگ نقل کیا جاچکا ہے، اور اگرچہ حضرت مدنی کے بیان ومضمون کا مفہوم واضح ہے، جس کی توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں،

لیکن بعض حضرات کی طرف سے اس سلسلہ میں کچھ شکوک وشبہات پیش کیے جاتے ہیں، اور مولانا سندھی صاحب کو تادمِ آخر شاذ افکار اور دماغی انقلاب واختلال سے پاک قرار دیا جاتا ہے، اس لیے اب حضرت مدنی کے اس بیان ومضمون کی ذیل میں مفصل توضیح وتشریح پیش کی جاتی ہے، جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ اہلِ انصاف اور حق واعتدال کے متلاشی لوگوں کو حضرت مدنی کے اصل مقصود کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور اس سلسلے میں پیدا کردہ غلط فہمیوں سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔

حضرت مدنی نے اپنے بیان ومضمون کے شروع میں تحریر فرمایا ہے:

> ''ان دنوں کچھ عرصے سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہورہے ہیں، جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتُ الامر کو شائع کردیا جائے، تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے بچ جائیں۔ اور جن باتوں کو مذکورہ ذیل معروضات کی روشنی کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات ونصبُ العین کی قدر کرتے ہوئے (جو اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادمِ مرگ ان کو ملک در ملک پھراتا رہا تھا) رائے قائم فرمائیں''۔

حضرت مدنی کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں جب حضرت مدنی کا یہ بیان منظرِ عام پر آیا، اس وقت مولانا سندھی صاحب کے متعلق مختلف مضامین شائع ہورہے تھے، جن میں ظاہر ہے کہ ان کے متنازع وشاذ افکار وخیالات کے خلاف مضامین بھی تھے، جیسا کہ ہماری کتاب کے کئی مضامین کی اشاعت کی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ وہ اسی زمانے کے ہیں، اور مولانا سندھی صاحب کے افکار پر معاصر مشاہیر اہلِ علم کے نقد ونظر پر مشتمل اور مولانا سندھی صاحب کے شاذ افکار پر ان مشاہیر کی بے چینی وبے فکری پر مشتمل تھے۔

چنانچہ پہلے مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہری صاحب کے حوالے سے بھی صراحتاً اس کا ثبوت گزر چکا ہے، اور آج بھی مولانا سندھی صاحب کی طرف سے اور ان کے خلاف اس زمانے کے تحریر کردہ بعض مضامین مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، ان حالات کی بنا پر حضرت مدنی کی طرف سے حقیقۃُ الامر شائع کرنے اور افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرنے اور حضرت مدنی کی ہدایات کی روشنی کے خلاف دیکھنے کی صورت میں حقیقت کو سمجھنے کی غرض سے یہ مضمون تحریر کیا گیا۔

اسی کے ساتھ مولانا سندھی صاحب کی عمر کے بہترین سرمایہ کے اصل جذبات ونصبُ العین کو سمجھنے پر بھی توجہ دلائی گئی۔

پھر اس کے بعد حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کی عمر کے بہترین سرمائے کے اصل جذبات اور نصبُ العین کو خود ہی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

اس کے بعد حضرت مدنی نے اپنے الفاظ میں:

''بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل، الخ''

مولانا سندھی صاحب کے کابل پہنچنے اور آزادی کے جذبے میں ترقی اور غلو ہونے اور اس جذبے کے جنون کے درجے تک پہنچنے اور پھر روسی ممالک میں ہوتے ہوئے حجاز پہنچنے اور ان تمام ممالک ومراحل میں پے در پے تکالیف ومصائب برداشت کرنے کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد حضرت مدنی نے فرمایا:

''ان مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ نے اگرچہ موت کے گھاٹ تک مولانا (سندھی) کو پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی، تاہم وہ مولانا کے قلب اور دماغ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر وغور اور جودتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی

عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہو گئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے، اور کیوں نہ ہو، جو ناساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کم ترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔ (یعنی اقرار کیا) ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔ چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس رتبے اور پوزیشن کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے''۔

حضرت مدنی کی مذکورہ بالا عبارت میں درجِ ذیل چند جملے قابلِ غور ہیں۔

(1)..... ''وہ (یعنی مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ) مولانا کے قلب اور دماغ کو متاثر

کرنے میں کامیاب ہوگئیں''۔

(2).....''مولانا (سندھی) دماغی توازن کھو بیٹھے''۔

(3).....''صبر وتحمل، حلم وبردباری، استقلال وگراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا''۔

(4).....''فکر وغور اور جودتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیاتِ مدنیہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے، وہ تقریباً کافور ہوگئے''۔

(5).....''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی''۔

(6).....''ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں''۔

(7).....''ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آجاتا ہے''۔

(8).....''باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں''۔

(9).....''بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں''۔

(10).....''ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا''۔

(11).....''جس کی بنا پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے''۔

(12)..... ''اور کیوں نہ ہو، جو نا ساز احوال اور گوں ناگوں صدماتِ عظیمہ ان کو پیش آئے تھے، ان کا یہ اثر بہت ہی کمترین اثر تھا''۔

(13)..... ''متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے''۔

(14)..... ''ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے''۔

(15)..... ''یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا''۔

(16)..... ''اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس رتبہ اور پوزیشن کو مولانا مرحوم کے لیے حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ یقیناً مستحق تھے''۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا جملوں میں سے پہلے جملے میں مصائبِ عظیمہ غیر متناہیہ کے سبب مولانا سندھی صاحب کے قلب ودماغ کے متاثر ہو جانے کا ذکر ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ قلب ودماغ کے متاثر ہونے کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے، جس کی تعبیر و تشریح حضرت مدنی نے آگے دوسرے الفاظ میں فرمائی ہے، اور بعض دیگر حضرات نے اپنے اپنے انداز میں فرمائی ہے۔

لہٰذا اس پر فاضل ناقد یا کسی دوسرے کا اعتراض کرنا درست نہیں، بالخصوص جب کہ اس کی تائید دیگر حضرات کے ذریعے سے بھی ہوتی ہو۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا دوسرے جملے میں مولانا سندھی صاحب کے دماغی توازن کھو بیٹھنے کا ذکر ہے، جس کے معنیٰ اور مفہوم سے عوام وخواص سب واقف ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ دماغی توازن کھو بیٹھنے کی تعبیر کئی قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی ممکن ہے، لہٰذا اس موقع پر بعض حضرات کا لفظی ہیر پھیر کی بحث میں پڑ کر اصل مقصود کو نظر انداز کرنا

درست طرزِ عمل معلوم نہیں ہوتا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا تیسرے اور چوتھے جملوں میں بعض اخلاقِ عالیہ وحسنہ مثلاً صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال وگراں باری کے جواب دینے اور سابقہ غور وفکر و جودتِ طبع و غیرہ کے تقریباً کافور ہوجانے کا ذکر ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مذکورہ صفات کا کافور ہونا ایک مقتدا شخص کے دینی تشخص کے لیے نقصان دہ ہے۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا پانچویں اور چھٹے جملوں میں حضرت مدنی کے قیامِ حجاز کے زمانے میں مولانا سندھی صاحب کے مصائب جھیلنے کے بعد ان سے ملاقات ومشاہدہ کرنے کے بعد، مولانا سندھی صاحب کی سابقہ ذہانت، رزانت، حلم وبردباری، سکون وسکوت، سب کے تقریباً رخصت ہونے پر انتہائی تعجّب وتحیّر کا ذکر ہے۔

ظاہر ہے جس شخص کی اعلیٰ درجے کی صفات کا شہرہ و مشاہدہ ہو، اس میں ایسی چیزوں کا مشاہدہ سابق حالت کے بالکل برعکس ہونے کی وجہ سے یقیناً انتہائی تعجّب وتحیّر کا باعث ہی ہوگا۔

اور پیچھے گزرا کہ مشاہدہ ومعائنہ کار کا درجہ وحیثیت خبر دینے والے سے زیادہ ہوتی ہے۔

پس حضرت مدنی کے مشاہدہ کے مقابلے میں اور اس کے برعکس بعد کے شخص کی خبر کا درجہ وہ نہیں ہوگا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا ساتویں اور آٹھویں جملوں میں حضرت مدنی کی طرف سے مولانا سندھی صاحب کے متعلق بعض اخلاقِ غیر حسنہ کے سرزد ہونے، مثلاً ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوجانے، چیخنے، چلانے، غصہ آجانے، باتیں بہت زیادہ کرنے کے مشاہدہ کا ذکر ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کسی دینی مقتدا و پیشوا میں مذکورہ صفات، عادتاً اس کے مقتدا ہونے میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں، اور ایسی حالت میں انسان کی تحریر اور املائی تقاریر میں بھی مذکورہ آثار

کا ظاہر ہونا ایک فطری امر ہے۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا نویں جملہ میں مولانا سندھی صاحب کے ایک ہی مجلس میں متضاد ومتخالف باتیں کرنے کا ذکر ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جس طرح یہ متضاد باتیں دنیا کے متعلق اور سیاست کے بارے میں ہوسکتی ہیں، اسی طرح دین ومذہب کے متعلق بھی ہوسکتی ہیں، جس کی صراحت حضرت مدنی ہی کے بیان کردہ اگلے جملوں میں بھی آتی ہے۔

جس زمانے میں دماغی اختلال وانقلاب مولانا سندھی صاحب کے زبانی طور پر متضاد و متخالف امور فرمانے کی صورت میں ظاہر ہوا، اس زمانے میں ان کی قلمی تحریرات اور املائی تقاریر میں بھی ظاہر ہوگا، کیونکہ قلم دراصل زبان کا ترجمان ہوتا ہے۔

عربی میں اسی کی تعبیر ''**القلم احد اللّسانین** ''اور''**الکتابة تقوم مقام اللفظ** ''اور''**ان البیان بالکتاب بمنزلة البیان باللّسان** ''اور''**الکتاب کالخطاب** ''وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے اس دور کے امالی وتحریرات میں بھی تضادات کا وجود پایا جاتا ہے، جب کہ بعض حضرات ان تضادات ہی کی بنا پر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر، مولانا سندھی صاحب کی طرف، ان تضادات کی نسبت کی تکذیب کرتے ہیں۔

پس بعض حضرات کا مولانا سندھی صاحب کے تفردات کو صرف سیاسی واجتہادی نوعیت کے ساتھ مخصوص کرنے یا تضادات کی وجہ سے ان کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف کرنے کی تکذیب سے ہمیں توافق محسوس نہیں ہوسکا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا دسویں جملے میں ہندوستان واپسی کے بعد مذکورہ احوال وکیفیات میں اضافہ ہونے کا ذکر ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان واپس تشریف لانے کے بعد بھی مولانا سندھی صاحب سے شاذ افکار

اور متضاد امور کا دیگر ذرائع سے ثبوت پایا جاتا ہے۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا گیارہویں جملے میں مولانا سندھی صاحب کے دماغ پر کاری اثر پڑنے کے یقین ہونے کا ذکر ہے۔

اس سے پہلے جملوں میں قلب و دماغ کے متاثر ہونے، دماغی توازن کھو بیٹھنے اور ایک ہی مجلس میں متضاد و متخالف باتیں کرنے اور فکر و غور اور جودتِ طبع وغیرہ کے کافور ہونے، اور متضاد احوال میں اضافہ ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔

ایک ہی مجلس میں متضاد باتیں کرنا دراصل دماغی توازن کھو بیٹھنے کا ہی ایک اثر ہے، لہٰذا اس زمانے کی تحریرات و تقاریر میں جہاں باہم تضاد و تعارض محسوس ہو، وہ مولانا سندھی صاحب کے مخصوص دماغی عارضے کا اثر ہوگا، نہ یہ کہ تضاد و تخالف کی وجہ سے، اس کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف کرنے ہی کی نفی کی جائے۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا بارہویں جملے میں مذکورہ احوال و کیفیات کے اہم سبب یعنی ناسازاحوال اور گوناگوں صدماتِ عظیمہ کا ذکر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ احوال و اسباب طبعی و طبی طور پر قلبی و دماغی حالت کو متاثر کرنے کا اثر رکھتے ہیں، جس میں بسا اوقات خود متاثرہ شخص کا اختیار شامل نہیں ہوتا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا تیرہویں جملے میں مولانا سندھی صاحب کے خود اپنی مذکورہ کم زوریوں کے اعتراف کرنے کا ذکر ہے۔

مولانا سندھی صاحب تو اپنی متعدد کم زوریوں کا اعتراف کریں، اور ان کے غالی معتقدین و محبین ان چیزوں کے مولانا سندھی صاحب سے صدور کا انکار کریں، تو یہ ''مدّعی سست اور گواہ چست'' والا معاملہ ہی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا چودہویں جملے میں مذکورہ حالات و کیفیات میں ہر چیز کے اعتدال سے ہٹنے، اور تمام شعبوں میں خلل پیدا ہو جانے کا ذکر ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ہر چیز کے اعتدال سے ہٹنے اور تمام شعبوں میں خلل پیدا ہونے کے وسیع مفہوم میں، سیاست و مذہب اور عقائد و نظریات اور تحریرات و تقاریر، اور املا وغیرہ سب داخل ہیں۔

لہٰذا بعض حضرات کا اپنی طرف سے اس سلسلے میں تقسیم در تقسیم اور تاویل در تاویل کی جدوجہد سے ہمیں حضرت مدنی کے بیان کے پیشِ نظر اتفاق نہیں ہوسکا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا پندرہویں جملے میں مولانا سندھی صاحب کے دماغی انقلاب کے سیاست سے تجاوز کر کے علمی اور مذہبی تقاریر و تحریرات تک متجاوز ہونے کا ذکر ہے۔

حضرت مدنی کے مذکورہ بالا دونوں جملوں سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں ان کے جملہ امور میں اعتدال و استقلال نہیں رہا تھا، اور ان میں اختلاف واقع ہوگیا تھا، جو کہ ایک طبعی امر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت مدنی کے بقول غیر معتدل و غیر مستقل احوال اور دماغی اختلال و انقلاب، سیاسیات اور علمی و مذہبی تقاریر و تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔

حضرت مدنی نے سیاسیات سے لے کر مذہبی و علمی امور میں جو دماغی اختلال و انقلاب کے متجاوز ہونے کا ذکر فرمایا، اس میں کوئی تخصیص نہیں کی کہ وہ کس درجے اور نوعیت کا تھا، کیونکہ جب دماغی اختلال ہوتا ہے، اس کے اثرات کسی خاص نوعیت تک محدود نہیں رہتے۔

لہٰذا مولانا سندھی صاحب کی علمی و مذہبی تقاریر و تحریرات میں غیر معتدل و متنازع اور شاذ افکار و خیالات کے وجود کا انکار کرنا اور ان کو مولانا سندھی کے بجائے ان کے املا کنندہ اور شاگرد حضرات کی طرف منسوب کرنا، حضرت مدنی کے بیان کی رُو سے ایک غیر ضروری امر ہوگا۔

حضرت مدنی کے مندرجہ بالا سولہویں جملے میں اس بات کا ذکر ہے کہ مذکورہ حالات و کیفیات اور ان کے نتائج یعنی دماغی انقلاب اور جملہ شیون میں اختلال کے سیاسیات اور علمی و مذہبی تقاریر و تحریرات تک متجاوز ہونے وغیرہ کے باعث مولانا سندھی صاحب کو عوام اور سیاسی رہنماؤں میں وہ مقام حاصل نہ ہوا، جس کے وہ ان حالات و کیفیات اور ان کے نتائج

واثرات سے ہٹ کر یقیناً مستحق تھے۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ احوال و افعال کے صادر ہونے پر خواہ ان کا سبب کچھ بھی ہو، سابقہ کردار کی پوزیشن عوامی حلقوں اور سیاسی جماعتوں میں متاثر ہوا کرتی ہے، جو ہو کر رہی، اور اسی وجہ سے مولانا سندھی صاحب کے اس قسم کے احوال واقوال سامنے آنے کے بعد ان سے تقریباً تمام مذہبی وسیاسی جماعتوں نے کنارا کشی اختیار کی، اور عقیدت مندوں کا جمگھٹا ہٹتا گیا، اور مولانا سندھی صاحب کو اجتماعات کی صدارت کے مواقع بھی فراہم نہیں کیے گئے، جس کی باحوالہ تفصیل پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

ان تمام امور کے باوجود اگرچہ مولانا سندھی صاحب کے سابق کردار کا اعتراف اپنی جگہ باقی رہنا اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے، ہم بھی اس کے معترف ہیں، لیکن ہمارا مطمحِ نظر ان متنازع وشاذ افکار کی تردید ہے، جن کی موجودہ دور میں منظّم انداز میں تبلیغ وتشہیر، عوام کی گمراہی کا باعث ہے۔

اس کے بعد حضرت مدنی نے اپنے بیان میں فرمایا:

> مولانا کا کلام، ان کی شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے ہی بہت زیادہ دقیق (یعنی باریک) ہوتا تھا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم وفہم کو بھی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اُن کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دَور میں بھی جب کہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحابِ فہم حضرات اُصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں۔
>
> مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ اُلجھنیں پیدا ہونے لگیں، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

مذکورہ عبارت میں حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے حالات وحادثات سے پہلے کے کلام کو شدتِ ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر بہت زیادہ دقیق قرار دیا، جس کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم واہلِ فہم کو بھی غیر ضروری غور وفکر کی ضرورت ہوتی تھی، اور آخری دور میں بھی جب کہ ان کا دل ودماغ مصائبِ غیر متناہی سے متاثر ہو چکا تھا، سیاسی ونظری اعلیٰ حقائق کے ظہور پذیر ہونے کا ذکر فرمایا، جن سے اصحابِ فہم اصولی طور پر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں۔

لیکن حضرت مدنی نے مذکورہ حادثے کی بنا پر جس کا اس سے پہلی عبارت اور جملوں میں ذکر کیا گیا، جن میں مصائبِ غیر متناہیہ کی بنا پر مولانا سندھی صاحب کے قلب ودماغ کے متاثر ہونے اور دماغی توازن کھو بیٹھنے اور دماغی توازن پر کاری اثر پڑنے اور ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور فرمانے اور ہندوستان آنے کے بعد ان احوالِ متضادہ میں اضافہ ہونے اور ان امور کے مولانا سندھی صاحب کی سیاست سے لے کر علمی ومذہبی تقاریر وتحریرات میں متجاوز ہونے کا بھی ذکر ہے، مولانا سندھی صاحب کے کلام میں اور زیادہ الجھنیں پیدا ہونے کا حکم لگایا۔

لہٰذا ان حالات میں مولانا سندھی صاحب کے جملہ افکار کو کیسے قابلِ حجت سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ ان کو اس کسوٹی پر پرکھنا اور کھرے کھوٹے کی تمیز کرنا لازم ہوگا، جس کا ذکر آگے حضرت مدنی کے حوالے سے ہی آتا ہے۔

اس کے بعد اپنے بیان میں حضرت مدنی نے فرمایا:

> بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں۔

اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔

مذکورہ عبارت میں حضرت مدنی نے ''بنابریں'' فرما کر مندرجہ بالا احوال واسباب کی بنا پر، جن میں مصائبِ غیر متناہیہ کے سبب سے مولانا سندھی صاحب کے قلب ودماغ کا متاثر ہونا اور دماغی توازن کھو بیٹھنا اور دماغی توازن پر کاری اثر پڑنا اور ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور فرمانا اور ہندوستان آنے کے بعد ان احوالِ متضادہ میں اضافہ ہونا اور سیاست سے لے کر علمی ومذہبی تقاریر وتحریرات میں بھی ان امور کا متجاوز ہونا سب داخل ہے۔

اس کے بعد تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست کی ہے کہ وہ مولانا سندھی صاحب کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور اسی طرح تمام اہلِ علم وارباب قلم مولانا سندھی صاحب کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں، جب تک کہ وہ اسی کسوٹی (یعنی اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف) پر اس کو کس نہ لیں، کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے

www.idaraghufran.org

تابع ہیں، اوراسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی بات کسی کے صرف اجتہادی وسیاسی اور فقہی وفروعی نوعیت کے اختلافی مسائل کے متعلق نہیں کہی جاسکتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فکر متعدد اجتہادی، فقہی وفروعی مسائل مثلاً تقلید واجتہاد، قرأت خلف الامام، رفع یدین وغیرہ کے سلسلے میں بہت توسّع کی حامل ہے، جس کا ذکر ہم نے اس سلسلے میں اپنی مستقل تالیف میں کردیا ہے۔

لہٰذا حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کے کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ کے کلام پر پرکھنے کی جو تنبیہ فرمائی ہے، وہ اس قسم کے اجتہادی وفروعی مسائل کے بجائے، افکارِ شاذہ وغیرہ کی نوعیت سے متعلق ہے۔

مزید تاکید کے طور پر حضرت مدنی کی مذکورہ عبارت میں حضرت مدنی کے درجِ ذیل جملے الگ الگ انتہائی اہم اور قابلِ غور ہیں:

(1)..... ''مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں''۔

(2)..... ''جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں''۔

(3)..... ''اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو''۔

(4)..... '' حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔

(5)..... ''یہ حضراتِ اکابر (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند رحمہم اللہ) جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ

فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں''۔

مذکورہ جملوں سے معلوم ہوا کہ حضرت مدنی نے یہ بات مولانا سندھی صاحب کی تحریر اور کلام سے ظاہر ہونے والے غیر اجتہادی وفروعی افکار وافعال کے متعلق فرمائی ہے، جس کے بارے میں پہلے حضرت مدنی خود واضح فرما چکے ہیں کہ مولانا سندھی صاحب کا قلبی ودماغی انقلاب واختلال سیاسیات کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔

حضرت مدنی نے یہ بات اپنے مشاہدہ کی روشنی میں فرمائی ہے کہ ان کے مشاہدہ کے مطابق مولانا سندھی صاحب کی تحریر وکلام اور تقریر میں افکار وافعال سے متعلق، اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں، اسی لیے حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کی کسی بھی تحریر وکلام اور تقریر کو اس وقت تک حجت قرار دینے اور قبول کرنے اور مولانا سندھی صاحب کے کلام کو شاہ ولی اللہ ودیگر اسلاف واکابر اہلِ حق کا کلام سمجھنے سے اس وقت تک منع فرمایا، جب تک اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، ساتھ ہی حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند رحمہم اللہ کو جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع رہنے اور اس کی تعلیم وتلقین کرتے رہنے والا قرار دیا۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اجتہادی وفقہی، فروعی نوعیت کے امور کے متعلق نہیں ہے، پس مولانا سندھی صاحب کی جس تحریر وتقریر اور کلام سے افکار وخیالاتِ شاذہ وفاسدہ یا زائغہ کا ظہور وثبوت ہو رہا ہو، یا یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ حضرت شاہ ولی اللہ یا دیگر اکابر دیوبند وغیرہ

کا فلاں نظریہ تھا، اور وہ نظریہ دین کے اصول کے خلاف ہو، تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگا، بلکہ قابلِ تردید و قابلِ نکیر ہوگا۔

اب جو متعدد و مستند اہلِ علم و اہلِ قلم حضرات مولانا سندھی صاحب کے اس طرح کے افکار و خیالات کی تردید اور ان پر نکیر کرتے آئے ہیں، ان کا طرزِ عمل حضرت مدنی کے مذکورہ بیان و مضمون اور ان کی پرزور درخواست کے مطابق ہے، پس یہ حضراتِ گرامی، حضرت مدنی کے مخالف کیسے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

البتہ حضرت مدنی کی مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق حسنِ ظن کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کے افکار کو مولانا سندھی صاحب کے قلب و دماغ کے متاثر ہونے، دماغی توازن کھو بیٹھنے، اور دماغ پر کاری اثر پڑنے وغیرہ پر محمول کیا جائے۔

اگر مولانا سندھی کے کلام و تحریر اور تقریر میں کسی جگہ صحیح بات اور کسی جگہ اس کے برعکس غلط بات ہو، اس کو حضرت مدنی کی تصریح کے مطابق مولانا سندھی صاحب کے احوالِ متضادہ پر محمول کیا جائے گا، جو خود دماغی توازن کھو بیٹھنے کا اثر ہوگا، نہ یہ کہ غلط بات کو کسی اور کی طرف اور صحیح بات کو مولانا سندھی صاحب کی طرف منسوب کیا جائے، اور اس سے بڑھ کر یہاں تک کہہ دیا جائے کہ مولانا سندھی صاحب کی نسبت سے جملہ افکارِ شاذہ صرف ان کے تلامذہ کی ذہنی اختراع اور قلبی ایجاد ہیں، مولانا سندھی صاحب ان سے بری الذمہ ہیں۔

جو حضرات یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، وہ متضاد و متنازع افکار کی ایسے افراد کی طرف نسبت کر رہے ہیں، جو حضرت مدنی کے بیان کی رُو سے اس نسبت کے اصل مستحق نہیں، کیونکہ حضرت مدنی نے اپنے بیان میں ناقلین وغیرہ حضرات کو احوالِ متضادہ اور دماغی توازن کھو بیٹھنے وغیرہ کے عارضے میں مبتلا قرار نہیں دیا، بلکہ مولانا سندھی صاحب کو قرار دیا، جب کہ مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے تلامذہ اپنے آپ کو صرف ناقل و ترجمان اور املا کرنے والا قرار دے رہے ہیں، پھر کس بنیاد پر ان تمام چیزوں کی نفی کر کے ایسا دعویٰ کیا

جائے، جو ابھی تک اس طرح کے قوی مشاہدات سے بھی ثابت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت لاہوری، جو کہ مولانا سندھی صاحب کے ابتدا سے ہی تلمیذ اور زیرِ تربیت رہے ہیں، وہ بھی بعد از ہجرت مولانا سندھی صاحب کے افکار و خیالات میں تبدیلی کی وجہ سے سخت اختلاف رکھتے تھے، جیسا کہ گزرا، اور مولانا لاہوری کو مولانا سندھی کے فکر و فلسفے کا اصل اور حقیقی ترجمان قرار دیا جاتا ہے، لیکن وہ اس دور کے افکار کی ترجمانی تو درکنار، ان افکار کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔

حضرت مدنی کے بیان و مضمون کی مذکورہ توضیح و تشریح سے معلوم ہوا کہ اس میں حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کی زندگی اور ان کے حالات و عوارض کے جملہ پہلوؤں کو اصولی انداز میں ذکر فرما کر ہر قسم کی افراط و تفریط سے بچنے بچانے اور اعتدال کو ملحوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے، اب جیسی جس موقع پر ضرورت پیش آئی، حضرت مدنی کے اس مضمون و بیان کی روشنی میں اس پہلو کو اخذ کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

ہر موقع پر حضرت مدنی کے پورے مضمون کو نقل کرنے کی نہ تو ضرورت تھی، اور نہ اس سے کوئی فرق پڑتا تھا۔

موجودہ دور میں ایک خاص جہت سے حضرت مدنی کے مذکورہ بیان و مضمون میں مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں متنازع و شاذ خیالات و افکار کا پہلو زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس قسم کے افکار و خیالات کی خاص انداز میں تبلیغ و تشہیر کی وجہ سے نزاع پیدا ہوتا ہے، اور اسی قسم کے افکار دین و شریعت کی رُو سے قابلِ کلام اور عوام الناس کی بے راہ روی کا باعث بنتے ہیں، ورنہ مولانا سندھی صاحب کی خدمات و اوصاف سے کسی کو اختلاف نہیں، اسی لیے اس سلسلے میں اہلِ علم و اہلِ فکر حضرات و اشخاص کی طرف سے حضرت مدنی کے فیصلے کو نہایت معقول و معتدل ہونے کی وجہ سے اختیار کیا جاتا رہا۔

# مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی بیان کردہ توضیح

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ العالی فرماتے ہیں:

حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز کی یہ تحریر بالکل واضح ہے، جس میں حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں کو بھی واضح فرمادیا ہے، اوراس کے ساتھ ان کے افکارِ شاذہ سے اپنی اور اکابر علمائے دیوبند کی برأت کا بھی اظہار فرمادیا ہے، اور افکار کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کا عذر بھی بیان فرمادیا ہے کہ وہ مسلسل مصائب وشدائد سہنے کے نتیجے میں اختلالِ ذہنی کا شکار ہوگئے تھے، اس حالت میں ان سے جو نظریات وافکار صادِر ہوئے، ان میں وہ خود تو شاید اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ سے معذور ہوں گے، لیکن دوسرے لوگوں کو ان افکار میں ان کی اتباع کرنے کے بجائے جمہورِ امت کے مسلک ہی کو اختیار کرنا چاہیے، اور حضرت نے یہ بھی بیان فرمادیا کہ ان کے افکارِ شاذہ کو حضرت شاہ ولی اللہ یا حضرت نانوتوی یا حضرت شیخ الہند کی طرف منسوب کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

حضرت مولانا سندھی کے بارے میں اس سے زیادہ معتدل، مستند اور قابلِ اعتماد رائے اور کیا ہوسکتی ہے؟

مولانا سندھی مرحوم کی زندگی کا وہ دور جو حضرت مدنی قدس سرہٗ کے الفاظ میں اختلال یا زیادہ مؤدب محدّثانہ اصطلاح میں ''اختلاط'' کا دور تھا، اس کے بارے میں حضرت مدنی قدس سرہٗ متنبہ فرمارہے ہیں کہ ان کے اس دور کے افکار قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ (تبصرے، از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، صفحہ ۴۸۳، ۴۸۴، ترتیب: مولانا محمد حنیف خالد، مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: ۱۴۲۶ھ اپریل 2005ء)

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت مدنی نے جس اہم مقصد کے لیے اپنا بیان جاری فرمایا تھا، اور وہ اہم

مقصد حضرت مدنی کی تحریر کے آخر میں صاف صاف مذکور ہے، آج ایک طبقہ اسی اہم مقصد کو فوت کرنے میں لگا ہوا ہے کہ وہ مولانا سندھی صاحب کی تحریر وتقریر اور کلام میں پائے جانے والے ہر طرح کے غیر معتدل و زائغانہ افکار و خیالات کو برحق، بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شیخ الہند اور اکابرِ دیوبند ومسلکِ دیوبند کی صحیح فکر ہی اس کو قرار دیتا ہے، جس کی تردید کی حضرت مدنی نے تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پُر زور درخواست کی تھی۔

افسوس کہ حضرت مدنی کی اس منشا پر عمل کرنے والے حضرات ہی کو آج مطعون کیا جاتا اور ان کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم وناانصافی کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت مدنی کے مضمون وبیان کی جو تشریح وتوضیح ہم پہلے پیش کر چکے ہیں، اس کی روشنی میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی توضیح وتشریح دراصل حضرت مدنی کے بیان ومضمون کی صحیح ترجمانی ہے، جس پر اشکال یا اعتراض کرنا ہمیں درست معلوم نہیں ہوتا۔

## مولانا سید محمود میاں صاحب کی بیان کردہ توضیح

جب ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے مدیر نے مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری کا خط اور حضرت مدنی کا مضمون شائع کیا، تو اس کے ردّعمل میں ان کو فاضل ناقد صاحب کا جذباتی خط موصول ہوا، جس میں اس مضمون سے اختلاف کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت پر ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا، جب کہ اس پر ناگواری کی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

مولانا سید محمود میاں صاحب نے ''حضرت مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، ردِّعمل اور جواب'' کے عنوان سے فاضل ناقد کے مذکورہ خط کا جواب ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' جنوری 1998 عیسوی، رمضان المبارک 1418 ہجری کے شمارے میں شائع فرمایا، حضرت مولانا سید محمود میاں صاحب زید مجدہٗ نے اپنے اس وضاحتی مضمون میں تحریر فرمایا کہ:

''شیخ العرب والعجم حضرت مولانا السید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا ایک تاریخی

مضمون جو اخبار ''مدینہ، بجنور'' میں 1945ء میں شائع ہوا تھا، جو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق تھا، جس کو ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' کے اکتوبر 1997ء کے شمارہ میں شائع کیا گیا تھا، اس پر آپ نے اپنا ردِّ عمل نہایت جذباتی انداز میں بندے کے نام خط میں ظاہر کیا، جب کہ اس میں جذباتی ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی، ایسا لگتا ہے کہ کسی نے اس معاملے میں آپ کو تصویر کا ایک خاص رُخ جذباتی انداز میں پیش کیا کہ آپ کے ذہن سے حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز کے مضمون کا مقصد ہی اوجھل ہو گیا، بلکہ کچھ دیر کے لیے آپ کے ذہن سے یہ بات بھی محو ہو گئی کہ یہ مضمون حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے تحریر فرمودہ ہے، وگرنہ آپ کے خط کا مضمون ایسا نہ ہوتا کہ اس میں تحریر کردہ اعتراضات کا مصداق آپ کا مخاطب ہے ہی نہیں، بلکہ حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی اس کے مخاطب بنتے ہیں، تاہم جذبات کی شدت میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ [1]

آپ کے خط کا مختصر اور اصل جواب تو یہ ہے کہ حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی یہ تحریر میرے نزدیک ''محاکمہ'' کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے اس کو ''انوارِ مدینہ'' میں شائع بھی کیا ہے۔

مولانا تقی صاحب عثمانی کی تقلید میں ہم نے یہ کام نہیں کیا، اور نہ ہی اس معاملے میں ان کی تقلید کی ضرورت ہے۔

مولانا تقی صاحب عثمانی کا تعلق جس خانوادے سے ہے، آپ نے اپنے خط میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا سید محمود میاں صاحب مدظلہم نے کتنے تحمل اور سنجیدگی کے انداز میں مذکورہ کلمات تحریر فرمائے، جس میں حسنِ اخلاق کی واضح جھلک محسوس کی جا سکتی ہے، لیکن آج کل بعض لوگوں کی طرف سے حسنِ اخلاق کے برتاؤ کو دوسرے کی بزدلی اور کم زوری سمجھ لیا جاتا ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

جب کہ میرا تعلق جس خانوادے سے ہے، وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔

اس لیے خانوادہ کی نسبت سے جو اعتراضات مولانا تقی صاحب عثمانی مدظلہم پر آپ نے کیے ہیں، وہی مجھ پر بھی کر دیے، حالانکہ وہ مجھ پر نہیں کیے جاسکتے، لہٰذا یہ اعتراضات مولانا ہی پر ہوسکتے ہیں، وہی ان کا جواب دیں تو دیں، میرا ان اعتراضات سے کوئی تعلق نہیں بنتا، اگر آپ جذبات سرد پڑنے پر ٹھنڈے دل سے اپنے خط کو پڑھیں گے، تو آپ پر یہ بات خوب آشکارا ہوجائے گی۔ [1]

حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر میں مولانا سندھی رحمہ اللہ کی دینی خدمات اور قربانیوں کا کہیں انکار نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو تو سراہا گیا ہے، اور وہ بھی اس انداز میں کہ مضمون کا اکثر حصہ ان کے کارہائے نمایاں، عالی ہمت اور فراخ حوصلہ ہونے کے تذکرے پر مشتمل ہے، ان کی دنیا سے بے رغبتی تعلق مع اللہ اور مجاہدات کا تذکرہ نہایت شاندار انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

آخر میں حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے حوادثِ زمانہ کی وجہ سے حضرت سندھی رحمہ اللہ کے دماغ پر پڑنے والے اثرات اور ان کے نتیجے میں دماغی توازن کھو بیٹھنے کا تذکرہ کیا ہے، یعنی ان کے ذہنی طور پر علیل ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے، اپنی طرف سے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی، یہ ایسے ہی ہے، جیسے بہت پریشانیوں اور مصائب کے سبب کوئی بیمار ہوجائے، کوئی فالج زدہ ہوجائے، کوئی دل کا، کوئی شوگر کا، کوئی بلڈ پریشر کا مریض ہوجائے، ظاہر ہے یہ عوارض طبعی ہی کہلائیں گے، جس میں مریض بے چارے کا کیا قصور، ان قدرتی مصائب و

---

[1] حضرت مولانا سید محمود میاں اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحبان مدظلہما کے الگ الگ خانوادوں سے تعلق ہونے کے باوجود حضرت مدنی کی تحریر کو سچا اور حجت و معتدل سمجھنے میں دونوں حضرات متفق ہیں، اور اس وقت زیرِ بحث یہی موضوع ہے، ان حضرات کے خانوادوں یا خود ان میں کسی دوسری جہت سے علمی و اجتہادی نوعیت کے اختلاف سے مسئلہ ہذا پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

آفات سے اس کی سابقہ خدمات وکمالات ختم نہیں ہوتے، بلکہ باقی رہتے ہیں۔ [1]

حضرت مولانا سندھی رحمہ اللہ چونکہ بہت بڑے مفکر ہونے کے ساتھ دینی اعتبار سے بھی بہت بڑا مقام اور مذہبی وسیاسی پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے، اور ذہن، افکار کا مخزن ومنبع اور شارح ہوتا ہے، اس میں اختلال اگر دائمی ہو، تو افکار میں بھی لازمی طور پر خلل واقع ہوجاتا ہے، اور دائمی نہ ہو، تو افکار میں خلل کا امکان تو بہرحال ہوتا ہے۔ [2]

لہٰذا اس وقت کے ناگزیر حالات اور پیش بندی کے طور پر حضرت مدنی رحمہ اللہ نے یہ مضمون تحریر فرمایا، تاکہ لوگ ان کی قائدانہ حیثیت کے سبب ان کے افکار پر بے تامل عمل پیرا نہ ہوجائیں، چنانچہ حضرت رحمہ اللہ اپنے ہی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دور میں بھی جبکہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہوچکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوت فکر ونظر کا سامان تھے، ان سے اصحابِ فہم حضرات (عام آدمی نہیں) اصولی طور پر پَرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کرسکتے ہیں، مگر اب اس حادثے کی بنا پر اور بھی زیادہ الجھن پیدا

---

[1] جن کا انکار کرنا درست نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان عوارض کی حالت میں جو غیر معتدل وشاذ افکار صادر ہوں، ان کا غیر مقبول ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، اور آگے بھی آتا ہے۔ محمد رضوان۔

[2] یہ بات ظاہر ہے کہ مولانا سندھی کے افکار میں قابلِ ذکر اختلال ان کے آخری دور کے متعلق ہے، جو ہندوستان سے ہجرت کے بعد کا وقت ہے، اس لیے دائمی نہیں، اسی طرح بعد کے زمانے میں بھی یہ اختلال اس نوعیت کا نہیں، جس کے نتیجے میں ہمہ جہتی اعتبار سے مولانا سندھی صاحب کو مختل العقل قرار دیا جائے، تاہم افکار میں اختلال عارضی ہونے یا کسی وقت اس اختلال کا غلبہ ہونے اور کبھی نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افکار میں تضاد وتخالف بھی ہوتا ہے، جو اسی اختلال کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی کوئی بات صحیح اور کوئی بات غیر صحیح کرنا، جس کا حضرت مدنی رحمہ اللہ نے صراحتاً بھی اپنی زیرِ بحث تحریر میں ذکر فرمایا ہے، اور اس کی توضیح پہلے کی جاچکی ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

ہونے لگی، چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم اور ارباب قلم وعلم سے پُر زور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد و اعمال اہلِ سنت والجماعت کے زرّیں قواعد و تالیفات پر پرکھ نہ لیں۔

**علی ھذا القیاس** مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف و اکابر دیوبند کا مسلک ہی نہ سمجھیں، جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔

(بحوالہ انوارِ مدینہ، اکتوبر 1997ء)

اس عبارت میں حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے افکار ونظریات کو یکسر مسترد نہیں فرمایا، بلکہ ان کو پرکھنے کی تلقین فرمائی، اور قدیم سے جب بھی ضرورت محسوس کی گئی، تو مسئلہ میں یہی کیا گیا کہ اس کو مسلمات وقواعدِ دینیہ پر پرکھ کر فیصلہ کیا گیا، محض کسی شخصیت کے قول وفعل پر انحصار نہیں کیا گیا، چاہے یہ شخصیت کتنی ہی اعلیٰ ذہنی استعداد اور بیداری کی آخر وقت تک کیوں نہ حامل رہی ہو، اسلاف میں یہ طریقہ قدیم سے چلا آرہا ہے، کیونکہ دین کا مفاد اور اس کی اہمیت افراد کی اہمیت اور مفاد پر بہر حال مقدم ہے، فن اسماء الرجال جس پر علمِ حدیث کا مدار ہے، اس پر شاہد عدل ہے۔ [1]

---

[1] حضرت مدنی کی اس ہدایت کے مطابق متعدد اہلِ علم واہلِ قلم حضرات نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا کہ مولانا سندھی صاحب کی تحریر یا تقریر میں، جو افکار وخیالات قرآن وسنت یا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے منافی محسوس ہوئے، ان کی تردید کی، لیکن ایک طبقہ مولانا سندھی صاحب کے اس ذہنی ودماغی اختلال کے زمانے کے افکار کو پرکھے بغیر ان کی تبلیغ وتشہیر کرنے کے دَرپے ہے، جب کہ دوسرا فریق مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں اس ذہنی ودماغی اختلال کو قبول وتسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

تو جہاں ذہنی فتور پایا جاتا ہو، وہاں تو یہ اصول بطریقِ اولیٰ جاری ہو جاتا ہے، اور اس اصول کی وجہ سے مولانا سندھی رحمہ اللہ کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ان کی یہ بیماری طبعی اور قدرتی تھی، اور ان کے کسب و اختیار سے نہ تھی، آخرت میں ان کے لیے اس پر مزید اجر و ثواب کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ [1]

حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے مضمون کی تائید مولانا عبداللہ صاحب لغاری کی کتاب کے چند اقتباسات سے ہوتی ہے، جو انھوں نے ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل'' کے نام سے لکھی، مولانا لغاری مولانا سندھی کے معتمدِ خاص تھے، ان کے ساتھ 1915ء میں کابل گئے، پھر جب 1926ء میں مولانا سندھی رحمہ اللہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، تو مولانا لغاری وہاں ان کی خدمت میں پہنچے۔ بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ص۲۶۳۔

مولانا لغاری تحریر فرماتے ہیں:

''جب مولانا سندھی مکہ معظّمہ میں آئے، تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے، مولانا سندھی رحمہ اللہ نے پہلے آہستگی سے ان کو سمجھایا، اور کہا کہ آپ مولانا شیخ الہند کی جگہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ بنے ہیں، آپ کو حق نہ تھا کہ مولانا محمد علی کو جنھیں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ نے جمعیت العلماء کا پریزیڈنٹ بنایا تھا، ان کو معزول کر کے آپ پریزیڈنٹ بنتے، مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آخر یہ جمعیت علماء تھی، اس کا پریزیڈنٹ بھی عالم ہونا چاہیے، اس پر مولانا سندھی کو بڑا غصہ آیا، اور کہا کہ تم کو کیا اختیار تھا، تم میں کیا علم تھا، کیا تم میں فضیلت تھی کہ تم ایک پولیٹکل جماعت کے سردار بنتے، تم نے کہاں سے سیاست سیکھی، مدینے میں تو سیاست ہے بھی نہیں، دو چار مہینے تم شیخ الہند رحمہ

---

[1] بیماری پر اللہ کی طرف سے اجر و ثواب ہے، تاہم اس بیماری کے عارضے میں مبتلا ہونے کی صورت میں غیر معتدل و شاذ افکار و خیالات قابلِ اتباع و قابلِ تقلید نہ ہوں گے، بلکہ قابلِ تردید و قابلِ نکیر ہوں گے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اللہ کے ساتھ قید میں رہے، بس اس سے تم سیاست سیکھ گئے، آپ کا نظریہ اور مولانا شیخ الہند کا نظریہ متضاد چیزیں ہیں، تم مولوی اشرف علی کے تابع دار ہو، مولوی اشرف علی نہیں چاہتے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، میں تم کو کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جا کر اپنی غلطی کی تلافی کرو، اور پھر مولانا محمد علی کو بلوا کر اس کا پریزیڈنٹ بناؤ، ورنہ میں تمھارا سر پھوڑ دوں گا، تم کیا چیز ہو کہ تم میرے استاد اور شاہ ولی اللہ کی ساری کی ساری تحریک برباد کرتے ہو، پھر تو مولانا حسین احمد رونے بیٹھ گئے، اس لیے جب مولانا سندھی ہندوستان آئے، تو ہمیشہ مولانا حسین احمد ان کی مخالفت کرتے رہے، اور مسلم لیگ کے نوجوانوں کو کافر کہتے رہے"۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، ص ۲۶۳)

(یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، بلکہ بہتانِ عظیم ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی لیگیوں کو کافر نہیں کہا۔) [1]

کیا مولانا سندھی رحمہ اللہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بحالت ہوش وحواس حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز سے اس قسم کی گفتگو کر سکتے ہیں، اگر کوئی عام آدمی

---

[1] ملحوظ رہے "مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل" کے دستیاب نسخہ میں ہمیں یہ عبارت موصول نہیں ہو سکی کہ "اور مسلم لیگ کے نوجوانوں کو کافر کہتے رہے"۔

یہ عبارت تفصیل کے ساتھ ہم دوسرے موقع پر فصل نمبر 1 کے ضمن میں نقل کر چکے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"جب مولانا سندھی ہندوستان میں آئے، تو ہمیشہ مولانا حسین احمد ان کی مخالفت کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا یہ کہ مسلم لیگ کے نوجوانوں نے ایک ٹکڑا ہندوستان کا، پاکستان کے نام پر آزاد کرالیا۔

اور مولانا شیخ الہند کی تحریک کو مولانا حسین احمد نے یوں بے کار کر دیا"۔ (مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۱۴۲ و ۱۴۳، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

اور اگر اصل کتاب میں یہ عبارت نہ ہو، تو اس پر بہتانِ عظیم کا حکم لگانا بھی درست نہیں ہوگا، البتہ اگر کسی نے خیانت کر کے یہ عبارت بعد میں شامل کر دی ہو، تو بہتانِ عظیم کا حکم اسی پر عائد ہوگا، تاہم مولانا سندھی صاحب کی جو دوسری کئی باتیں اوپر کی عبارت میں مذکور ہیں، ان میں مولانا سندھی صاحب کے دماغی انقلاب واختلال کے مظاہر واضح ہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اس قسم کی گفتگو کرے، تو اس کو بھی شائستگی کے خلاف قرار دیا جاتا ہے، چہ جائے کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ جیسا انسان یہ ادنیٰ درجہ کی گفتگو کرے، اور وہ بھی شیخ العرب والعجم جیسی عظیم ہستی سے، لہٰذا تسلیم کر لینا چاہیے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مسلسل صدمات نے مولانا سندھی رحمہ اللہ کے دماغ کو ایسے شدید جھٹکے دیے، جس کے سبب ان کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہ سکا۔ [1]

ان کی اسی کیفیت کا حضرت رحمہ اللہ نے مختلف اوقات میں ذکر فرمایا ہوگا، جیسا کہ مولانا لغاری کے مذکورہ بالا حوالے میں ''ہمیشہ'' کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے، آگے چل کر مولانا لغاری نے اس کی صراحت بھی کی ہے۔ اگرچہ یہاں مخالفت کے لفظ سے ذکر کیا ہے، جو تعبیر کی غلطی ہے، حضرت رحمہ اللہ سے مولانا سندھی رحمہ اللہ کی یہ گفتگو محولہ کتاب کے ص ۲۰۵ پر بھی تحریر کی گئی ہے، آگے چل کر مزید تحریر ہے۔

''..... آپ کے ہمراہی مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ بے گناہ مولانا جوہر کے ساتھ کراچی میں سزایاب ہوگئے، حالانکہ وہ انقلابی نہ تھے، صرف خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوگئے تھے، اگر یہ سب لوگ سیتہ گرہ قانون کے پابند نہ ہوتے، تو اپیل کرنے پر سب بری ہو جاتے''۔ (ایضاً، ص ۲۳۹)

یہ چند حوالے درج کر دیے ہیں، ان کی روشنی میں آپ بہ سہولت کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

مولانا لغاری صاحب مولانا سندھی رحمہ اللہ کے مخصوص افکار و خیالات کے

---

[1] مولانا عبداللہ لغاری کی مذکورہ عبارت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مولانا سندھی صاحب کی بعض باتیں خلافِ واقعہ اور متضاد بھی ہیں، حضرت مدنی نے بھی اپنی تحریر میں متضاد و متنازع باتیں کرنے کا ذکر کیا ہے۔
لہٰذا متضاد و متخالف اور خلافِ واقعہ باتوں کا مولانا سندھی صاحب سے صادر ہونا، حضرت مدنی کے بیان کی رُو سے درست ہے۔ مگر حیرت ہے کہ بعض لوگ متضاد ہونے کی بنیاد پر ہی ان باتوں کے مولانا سندھی صاحب سے منسوب ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

بارے میں لکھتے ہیں۔

''اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار و خیالات کا اظہار کرنے لگے، عقیدت مندوں کا یہ جھمگٹا ہٹتا گیا، اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیت العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا، جہاں تک مجھے یاد ہے، مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیۃ العلمائے صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس، اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی، اور عام شاہ راہوں سے الگ ہو گئے، مولانا جوشیلے مجسمۂ انقلاب تو تھے ہی ''چراغِ سحری'' کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا کر دی تھی، اور ہر اس نظام کو فوراً توڑ دینے کے حق میں تھے، جو ان کے خیال اور ان کے مطالعہ کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لیے مفید نہ تھا، وہ کانگریس کی مذہبی قیادت اور دیگر اسلامی جماعتوں کی ''قدامت پسندی'' سے نالاں تو تھے ہی، خاکسار تنظیم کی حمایت، سر سکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشترا کی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا، اور مولانا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولانا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابلِ قبول ہیں، جب اصولِ دین سے ان کی مطابقت مسلم ہو جائے''۔

(مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل، ص ۱۷)

مولانا لغاری صاحب خود تسلیم کر رہے ہیں کہ مولانا سندھی نے اپنی الگ راہ لی، اور ان کے انتہائی مخلص دوستوں نے بھی ان سے کنارا کشی اختیار کر لی تھی، اور ان

کے مزاج میں عمر کے آخری حصہ میں عجلت اور بے صبری پیدا ہوگئی تھی، یہی کیفیت جب بہت بڑھ جائے، تو دماغی حالت ویسی ہی ہو جاتی ہے، جس کا تذکرہ حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے اس تاریخی مضمون میں فرمایا، جو ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں بحوالہ اخبار ''مدینہ، بجنور'' 1945ء شائع کیا گیا۔ [1]

مولانا سندھی کی آخری عمر کے حالات کا جگہ بے جگہ ذکر کرنا ضروری بھی نہیں تھا، بتقاضہ دینی مصلحت ایک آدھ بار ذکر کر دینا یا تحریر میں لے آنا بس کافی ہوتا ہے، سو حضرت مدنی رحمہ اللہ نے کر دیا۔ [2]

ورنہ تو جیسا کہ پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں، وہ ان کی خدمات کے معترف اور بہت بڑے مداح تھے۔ [3]

ان کی دماغی تکلیف پر ان کو لاریب دکھ اور رنج ہی ہوگا۔ [4]

وہ بدخواہ تو نہ تھے کہ خوش ہوتے اور چرچا کرتے۔

اسی طرح ہیٹ نیکر اور رومن رسم الخط جو کہ کفار بالخصوص نصاریٰ کا خاص لباس اور شناخت تھی کا پرچار ایک ایسا فعل ہے، جس کا تصور ایک عام مسلمان بھی نہیں

---

[1] مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں حضرت مدنی کا مضمون ''اخبار مدینہ، بجنور'' کے حوالے سے شائع کیا گیا، خود سے کوئی بات اس میں خیانت کر کے داخل نہیں کی گئی۔ محمد رضوان

[2] اس طرح کے واقعے پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مدنی نے یہ بیان بھی اس وقت جاری کیا، جب مولانا سندھی صاحب کے متعلق پریس میں مختلف قسم کے مضامین شائع ہو رہے تھے، جس کا حضرت مدنی نے اپنے مضمون کے آغاز میں ہی ذکر فرمایا ہے۔ محمد رضوان۔

[3] اسی وجہ سے جہاں ضرورت پیش نہ آئی، اور دینی مصلحت کا تقاضا نہ ہوا، وہاں حضرت مدنی نے مولانا سندھی صاحب کے آخری عمر کے حالات کے بجائے، ان کی سابقہ اور اصل زندگی کے قیمتی سرمائے کے کارناموں کے ذکر پر اکتفا فرمایا، جیسا کہ نقشِ حیات میں، اور ایک مبلّغ کے لیے حکمت یہی ہوتی ہے کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے کلام کرے، جس کا ہم نے پہلے بھی ذکر کیا۔ محمد رضوان

[4] بلکہ یقیناً دکھ ہوا، اسی لیے حضرت مدنی نے اپنے بیان و مضمون میں ان کے مصائب و تکالیفِ لامتناہیہ جھیلنے کا پرسوز انداز میں ذکر فرمایا۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

کرسکتا، یہ ممکن ہے کہ کفار سے تشبہ کو کسی وقتی اور دینی مصلحت کی بنا پر اسلاف نے نظر انداز کیا ہو، مگر نظر انداز کرنا اور چیز ہے، اور پرچار کرنا اور چیز ہے، جو اسلاف میں کبھی رَوا نہیں رہا، اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، پرچار کو عربی میں ترغیب کہا جاتا ہے، جو تبلیغ سے بھی آگے کا درجہ ہے، تو ترہیب کے بجائے ترغیب، یہ قلبِ موضوع ہوگیا، کسی عاقل بالغ کی جانب سے اس قسم کے ''پرچار'' پر مفتیانِ اسلام کا کیا فتویٰ ہے، ہر ذی فہم انسان اس کو خوب سمجھتا ہے۔

لہٰذا ہم سب کی عافیت اسی میں ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ زندگی کے آخری حصے میں دماغی اعتبار سے غیر مکلّف اور مرفوع القلم ہوچکے تھے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ دنیا میں مواخذہ ہوتا ہے اور نہ آخرت میں۔ [1]

مولانا سندھی رحمہ اللہ کے آخر زمانے کی حالت کا مشاہدہ کرنے والے لوگ ابھی بقید حیات ہیں، ان سے بھی اسی قسم کی غیر متوازن باتیں اور افعال معلوم کیے جاسکتے ہیں، ہمارے جامعہ کے مدرس اور میرے استاذ حضرت مولانا ظہور الحق صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ کی سختی اور طبیعت کی غضب ناکی کا میں نے خود مشاہدہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں لاہور میں ایک اجلاس میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خطبۂ صدارت پڑھ رہے تھے، حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور اس وقت کے اکابر اسٹیج پر موجود تھے کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ دورانِ اجلاس

---

[1] مطلب واضح ہے کہ مولانا سندھی صاحب سے جو افکار اس خاص حالت میں صادر ہوئے اور وہ دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف یا مسلکِ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے خلاف تھے، وہ قابلِ قبول نہیں ہوں گے، جیسا کہ مولانا سندھی صاحب سے درج بالا باتیں بڑے مجمع نے سن کر ان سے بے زاری کا ہی اظہار کیا، وہ الگ بات ہے کہ مولانا سندھی صاحب خاص عوارض کی بناء پر عنداللہ معذور ہوں۔

مولانا سندھی صاحب کے ساتھ حسنِ ظن اور صحیح خیر خواہی اسی تاویل میں ہے، اگرچہ حقیقت شناسی سے ناواقف کوئی شخص اس کو حسنِ ظن اور صحیح خیر خواہی میں داخل نہ سمجھے، جس کی مزید تفصیل آگے آتی ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

فرمانے لگے ''میرے استاذ کے یہ جانشین نہیں بن سکتے''۔

اس پر حضرت لاہوری رحمہ اللہ ترکیب کے ساتھ ان کو اجلاس سے لے گئے۔

اس کے علاوہ اور بھی واقعات ہیں، جو دین پور شریف کے حضرات بیان کرتے ہیں۔

حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے مولانا عبدالرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود رشید بھائی صاحب کو مولانا سندھی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ سنایا کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ آخر عمر میں جب سندھ تشریف لائے، تو ایک عالمِ دین ان سے تفسیری نکات پڑھنے کے لیے آنے لگے، ایک دن اچانک مولانا نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی، بہت برا بھلا کہا، اور کہا تم منافق ہو، وغیرہ وغیرہ اور ان کو نکال دیا، وہ چلے گئے اور پھر نہ آئے، تین چار روز بعد مولانا سندھی رحمہ اللہ نے ان کو خود ہی بلوایا، اور کہا کہ بھائی مجھے کبھی دماغی دورہ پڑ جاتا ہے، تو میں ایسی باتیں کردیتا ہوں، جن کا مجھے پتہ بھی نہیں چلتا، لہٰذا تم مجھے معاف کردو۔ [1]

نیز مولانا سندھی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''الھام الرحمان فی تفسیر القرآن'' میں ''اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک. الخ'' کے تحت فرماتے ہیں، یعنی ممیتک تجھے مارنے والا ہوں، یہ جو حیات عیسیٰ لوگوں میں مشہور ہے، یہ یہودی کہانی ہے، نیز صابی من گھڑت کہانی ہے، مسلمانوں میں فتنۂ عثمان کے بعد

---

[1] مندرجہ بالا واقعات اور خود مولانا سندھی صاحب کے اعتراف سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کی طبیعت ودماغ میں ایسا عارضہ واقع ہوگیا تھا، جس کی بنا پر بعض اوقات ان سے غیر معتدل باتوں اور حرکات کا صدور ہوجاتا تھا، اور ان کو خود بھی بعض چیزوں کا پتہ نہیں چلتا تھا، اب اگر کوئی ان واقعات کو نہ مانے، تو اس کی وجہ سے اصل حقیقت پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مولانا سید محمود میاں صاحب نے براہِ راست سنے ہوئے واقعات کا ذکر فرمادیا، جن سے حضرت مدنی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

بواسطہ انصار بنی ہاشم، یہ بات پھیلی اور یہ صابی اور یہودی تھے.....

آپ ہی بتلایے کیا یہ علمائے اہلِ سنت والجماعت دیوبند کا مسلک ہے! [1]

آپ نے نمبر ۳ شق (ب) میں لکھا ہے، انھیں متدیّن صاحب الرائے اور صاحبِ علم وتقویٰ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ مجھے ان کے ایمان کے بارے میں شک ہے، اس کا حوالہ درکار ہے، تاکید ہے۔ [2]

اگر بالفرض میرے جد امجد حضرت مولانا السید محمد میاں صاحب اور والد ماجد رحمہما اللہ نے مولانا سندھی رحمہ اللہ کے بارے میں کچھ تحریر نہیں فرمایا، تو اس سے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مذکورہ عقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہے، لیکن مولانا سندھی صاحب کی تفسیر میں اس کا ذکر ہے، لہٰذا اس عقیدے کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا، خواہ اس کا سبب مولانا سندھی صاحب کے ذہنی ودماغی عارضے کو کیوں نہ قرار دیا جائے، جس میں ان سے متنازع ومتضاد امور جاری ہوئے تھے۔

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (لاہور) اپنے ایک تفصیلی مضمون میں فرماتے ہیں:

تنظیم فکر ولی اللّٰہی والے یہ اجمالی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عقائد وہی ہیں، جو اہل سنت کے ہیں اور اگرچہ تنظیم کے مفتی عبدالقدیر صاحب نے تفسیر المقام المحمود میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے، لیکن مولانا سندھی کے اس مضمون کو انھوں نے بغیر کسی انکار کے شائع کیا ہے، بلکہ یہاں تو عنوان ہی یہ قائم کیا گیا ہے ''عیسیٰ کے اٹھائے جانے کی حقیقت اور اس کی تاریخی مثال'' غرض تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی والوں نے مولانا سندھی کے اس خیال وعقیدے کو بلا انکار لیا ہے اور وہ واضح طور پر مولانا سندھی کی اس مسئلہ میں تغلیط بھی نہیں کرتے۔

تنظیم والے اگر یہ کہیں کہ مولانا عبدالحمید سواتی نے شرح سطعات کے قلمی نسخے سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا سندھی کا ایسا عقیدہ نہیں تھا، لہٰذا ہمارا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرح سطعات والا مضمون امام مہدی سے متعلق ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نہیں۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۰۹، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

علاوہ ازیں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ''افادات وملفوظات'' میں حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی قیامت سے قبل آمد کے انکار کا بھی ذکر ہے، جس کی باحوالہ تفصیل فصل نمبر 5 میں آئے گی۔ محمد رضوان

[2] ہم بھی اس حوالے کے منتظر ہیں، اور ہم نے حضرت مدنی اور علامہ عثمانی کے مابین باہمی احترام وخوش گوار تعلقات کے متعلق تصریحات تمہید میں ذکر کردی ہیں، جن سے اس قسم کے الزامات کی تردید ہوتی ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کسی خاص معاملے میں سکوت یا تحریر نہ فرمانا، واقعے کی نفی اور عدم کو مستلزم نہیں ہوا کرتا۔ [1]

میرا ارادہ تو یہی تھا کہ آپ کے خط کا بالکل مختصر جواب تحریر کردوں، مگر بے ارادہ خط اتنا طول پکڑ گیا کہ مجھ اختصار پسند کو خود اس پر تعجب ہو رہا ہے۔

آخر میں پھر یہ بات دہرادوں کہ میرے نزدیک حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی تحریر محاکمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

لہٰذا حضرت رحمہ اللہ کے اخبار مدینہ بجنور کے مضمون پر بندے کو اطمینان ہے، مزید بحث میں الجھنا نہیں چاہتا، اگر اس سلسلے میں آپ مزید کچھ تحریر کرنا چاہتے ہیں، تو خوشی سے کریں، مگر بندہ مزید سوال و جواب سے پیشگی معذرت خواہ ہے۔ [2]

قاری صاحب مدظلہم اپنے والد صاحب اور دیگر پرسانِ احوال کی خدمت میں سلام اور دعا کی درخواست''۔

والسلام

سید محمود میاں

10 شعبان 1418 ہجری/ 11 دسمبر 1997ء

(ماہنامہ ''انوارِ مدینہ لاہور، پاکستان''، جنوری 1998، رمضان المبارک 1418 ہجری، ص ۵۱ تا ۵۸)

مولانا سید محمود میاں صاحب نے جو مذکورہ مضمون میں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے

---

[1] یہ شریعت کا اہم قاعدہ واصول ہے، جس سے اہلِ علم واقف ہیں، چنانچہ قرآن وسنت میں بعض احکامات کا بیان اس طرح ہوا ہے کہ وہاں ان کی کسی خاص صورت ونوعیت کا متعدد مقامات پر ذکر نہیں کیا گیا، لیکن کسی مخصوص موقع پر اس کا ذکر کردیا گیا، اس کے باوجود اس خاص صورت کو بھی مجموعی احکام میں ملحوظ رکھا گیا۔ محمد رضوان

[2] جس کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ مولانا سید محمود میاں صاحب کو اپنے موقف پر شرح صدر ہے، اور انھیں جذباتی وضدی مخاطب سے مزید گفتگو میں فائدہ محسوس نہیں ہوتا۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

متعلق تشریح وتوضیح کی، وہ حضرت مدنی کے بیان کی صحیح ترجمانی ہے، لیکن جناب فاضل ناقد اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اسی لیے انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' میں اس مضمون پر تنقید کی ہے۔

فاضل ناقد اپنے اُس خط کے متعلق، جو انھوں نے مولانا سید محمود میاں صاحب کو تحریر کیا، اس میں لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ میرا خط بہت تُند وتیز تحریر میں تھا، لیکن میں اس کے مندرجات سے اور طرزِ تحریر سے الحمدللہ آج بھی مطمئن ہوں''۔ (''یادگارِ اکابر''، صفحہ ۱۲)

فاضل ناقد اپنے ایک دوسرے مضمون ''جماعت دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' میں لکھتے ہیں:

''یہی مضمون حضرت شیخ الاسلام کے متوسلین نے ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور میں چھاپا۔ اس وقت راقم الحروف نے اس عمل اشاعت پر سخت ردعمل کے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا جو کہ ''انوار مدینہ'' کے مدیر محترم کی مہربانی سے ''انوار مدینہ'' میں شائع ہوگیا تھا، ساتھ ہی مدیر محترم کا جواب بھی شائع ہوا تھا، جو میرے ردعمل سے مطمئن نہیں تھے اور شاید آج بھی نہ ہوں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں اس ردعمل سے اب تک مطمئن ہوں۔ اس میں میں نے لکھا تھا کہ:

"حضرت شیخ الاسلام کی یہ تحریر اگر تسلیم کرلی جائے تو نقش حیات جو حضرت نے 1950ء کے بعد تحریر فرمائی ہے اس میں حضرت سندھی کی عظمت پر قلم توڑ دیے ان کی عظمت وخدمات کو خوب خوب تحریر فرمایا ہے جو ستر صفحات سے زائد پر مشتمل ہے۔ تو پہلی تحریر کا اعتبار نہیں رہا، وہ منسوخ سمجھی جائے''۔

ہماری رائے میں حضرت مدنی کی تحریر اور بیان کے معتمد ہونے کے ساتھ اس کی تشریح وتوضیح کو ملاحظہ کرنے کے نتیجے میں اس کو منسوخ قرار دینے کا کوئی مطلب نہیں بنتا، کیونکہ حضرت مدنی نے تو اس مضمون میں بھی مولانا سندھی صاحب کی تعریف وتوصیف اعلیٰ درجے کی بیان کی ہے، ساتھ ہی آخری دور کی خاص کیفیات کا بھی ذکر کردیا ہے، جس طرح اس تحریر کے

دونوں حصوں میں تعارض نہیں، اسی طرح اس کا اگر صرف ایک حصہ کہیں بیان کیا جائے، اور بہ مصلحت دوسرے حصہ سے سکوت اختیار کیا جائے، اس میں بھی تعارض نہ ہوگا۔

مولانا سید محمود میاں صاحب کے مضمون پر ایک یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ مولانا سید محمود میاں صاحب نے مولانا سندھی صاحب کو آخری دور میں غیر مکلّف اور مرفوع القلم قرار دیا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تحریر میں لکھا:

''ہم سب کی عافیت اسی میں ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ زندگی کے آخری حصے میں دماغی اعتبار سے غیر مکلّف اور مرفوع القلم ہو چکے تھے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ دنیا میں مواخذہ ہوتا ہے اور نہ آخرت میں۔

مولانا سندھی رحمہ اللہ کے آخر زمانے کی حالت کا مشاہدہ کرنے والے لوگ ابھی بقیدِ حیات ہیں، ان سے بھی اسی قسم کی غیر متوازن باتیں اور افعال معلوم کیے جاسکتے ہیں''۔

لیکن مولانا سید محمود میاں صاحب کے مضمون پر یہ اعتراض مناسب معلوم نہ ہوا، کیونکہ انھوں نے حضرت مدنی اور دوسرے مشاہدہ کار حضرات کے بیانات اور واقعات کی روشنی میں یہ موقف اختیار کیا ہے، البتہ اس موقف کی تعبیر کا انداز ہر شخص کا ایک دوسرے سے جدا ہوسکتا ہے۔

حضرت مدنی نے اس کی تعبیر اپنے الفاظ میں فرمائی، چنانچہ حضرت مدنی کے بیان میں درجِ ذیل الفاظ ہیں:

''ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضاد میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے۔.....

ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا''۔

(ماہنامہ ''برہان'' ربیع الثانی 1364 ہجری، مطابق اپریل 1945ء)

حضرت مدنی کے بیان کی مکمل توضیح اسی فصل کے شروع میں گزر چکی ہے، جس میں دماغی توازن کے متاثر ہونے، دماغی توازن کھو بیٹھنے اور اس کے نتیجے میں متخالف ومتضاد باتیں کرنے وغیرہ کا بھی ذکر ہے، اگر کسی کو مولانا سید محمود میاں صاحب کے الفاظ اور تعبیر سے اختلاف ہو، تو اسے حضرت مدنی کے الفاظ وتعبیر کو اختیار کر لینے میں مضائقہ نہیں، مگر اس سے اصل مقصود مختلف نہیں ہوگا۔

## مولانا ظہور احمد بگوی صاحب وغیرہ کی بیان کردہ توضیح

مولانا ظہور احمد بگویؒ (متوفیٰ 1945ء) نے 1936 عیسوی میں سفر حج کے دوران مولانا سندھی صاحب سے مکہ مکرمہ میں ملاقات کی تھی، اور ان کی زندگی میں مولانا سندھی صاحب واپس ہندوستان تشریف لے آئے تھے، اور جب اس دور میں مولانا سندھی صاحب کے متنازع خیالات وافکار پر بحث چل رہی تھی، مولانا ظہور احمد بگوی صاحب نے ایک مختصر مضمون تحریر فرمایا تھا، جس میں انھوں نے یہ بھی تحریر کیا تھا:

مولانا (عبید اللہ سندھی صاحب) کی عمر 72 سال سے زائد ہو چکی ہے۔ 1936 عیسوی میں بہ مقام مکہ مکرمہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت بھی میں نے یہی رائے قائم کی تھی کہ مولانا کا دماغ حوادث دہر کا مقابلہ نہیں کر سکا اور اس میں اختلالِ عظیم واقع ہو چکا ہے۔

کسی زمانے میں مولانا کی قرآن دانی، تدبر وسیاست کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل چکا تھا، مگر اب مولانا کا وجود آثارِ قدیمہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لہٰذا مراق زدہ اور مالی خولیا کے مریض اور فاتر العقل بزرگ کو اپنے مجذوبانہ کلمات کے لیے معذور قرار دینا چاہیے۔

اس میں جمعیت علمائے ہند کے اکابر اور علمائے بنگال کی فہم وفراست پر تعجب ہے کہ وہ مولانا کی گذشتہ اسلامی خدمات کی بنا پر انھیں اپنے جلسوں کی صدارتیں پیش کر کے ایک نئے فتنے کو ہوا دے رہے ہیں۔

حالانکہ مولانا کی حقیقی خیر خواہی اس میں ہے کہ دماغ کے بہترین معالجوں کو جمع کر کے اُن کی صحت کا جائزہ لیا جائے اور کچھ عرصہ اُنھیں صحت بخش ادارہ میں رکھ کر اپنے دماغ کا علاج اور مکمل آرام کرنے کا موقع بہم پہنچایا جائے''۔(ماخوذ از: ماہنامہ ''البُرہان'' لاہور، اکتوبر 2015ء)

معلوم ہوا کہ حضرت مدنی کے علاوہ، مولانا سندھی صاحب کے آخری دور میں خاص ذہنی ودماغی انقلاب واختلال کے کئی دوسرے مشاہدہ کار حضرات وافراد موجود ہیں۔

مولانا ظہور احمد بگوی صاحب نے اپنے مشاہدہ کی رُو سے مولانا سندھی کو آخری عمر میں ''مراق زدہ'' اور ''مالی خولیا کا مریض'' اور ''فاتر العقل'' قرار دیا ہے، یہ سب دماغی امراض کی صورتیں ہیں، حضرت مدنی نے اس کی تعبیر اپنے انداز میں فرمائی۔

مگر حیرت ہے کہ بعد کے بعض حضرات نے اس چیز کو نظر انداز کر کے، مولانا سندھی صاحب کے اسی دور کے افکار کو قابلِ اتباع وقابلِ تبلیغ سمجھ لیا۔

علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب اپنے مضمون ''طلوعِ اسلام'' مولانا سندھی اور شاہ ولی اللہ'' میں فرماتے ہیں:

''اب سے کوئی تین برس پہلے، جب (مولانا سندھی) شروع شروع میں

ہندوستان آئے تھے، تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد جمعیت علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبۂ صدارت میں، آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کو یورپین طرزِ معاشرت، یورپین رسم الخط اور یورپین نیشنلزم اختیار کر لینے کا جب مشورہ دیا تھا، تو ادارۂ طلوعِ اسلام نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف کے متعلق، جو رائے ظاہر کی تھی، اس کا حاصل یہی تھا کہ ادارۂ طلوعِ اسلام کے نزدیک وہ گویا اربابِ عقل وہوش میں سے بھی نہیں ہیں۔

مگر اللہ کی شان کہ دسمبر 1941ء کے ''طلوع'' میں وہی ادارہ، موصوف کے افکار سے اپنے مسلک کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اب مولانا موصوف کو سرٹیفکیٹ دیتا ہے کہ ''وہ متاخرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں''۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۶۳، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

## مشہور مؤرخ صاحبِ ''موجِ کوثر'' کی بیان کردہ توضیح

مشہور مؤرخ جناب شیخ محمد اکرام صاحب ''موجِ کوثر'' میں لکھتے ہیں:

''(وطن واپسی کے بعد) علماء نے مولانا عبیداللہ کا بڑے جوش اور تپاک سے استقبال کیا تھا، لیکن جلد ہی اس جوش پر ٹھنڈی اوس پڑنی شروع ہوگئی، ان بزرگوں کا خیال تھا کہ مولانا ملک کے سب سے پرانے علماء میں سے ہیں، انھوں نے اس صدی کی بہترین ہستیوں سے فیض حاصل کیا ہے، اور اپنے معتقدات کے لیے عظیم الشان قربانیاں دی ہیں، وہ واپس آئیں گے، تو محفلِ علماء کے صدر نشین بنیں گے، اور جس وضع پر یہاں کے علماء جا رہے ہیں، اسے قائم رکھیں گے، بلکہ ترقی دیں گے۔

لیکن مولانا نے آتے ہی اپنی تقاریر میں ایسی باتیں کہنی شروع کردیں، جنھیں سن کر علماء چوکنے ہوگئے، سب سے بڑھ کر انھیں حیرت اس بات پر تھی کہ ایک ایسا مذہبی عالم، جس نے حضرت شیخ الہند کی صحبت سے برسوں فیض حاصل کیا ہے، اور صحرا نورد درویشوں کی زندگی بسر کی ہے، نہ صرف یورپ کی مادی ترقی کو لائق استہزا و قابلِ نفرین نہیں سمجھتا، بلکہ اس مادی ترقی کے حصول کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیتا ہے، اور اس کے حصول کے لیے وہی راستہ اختیار کرتا ہے، جو مصطفیٰ کمال پاشا نے دکھایا ہے! [1]

مولانا کی ان ابتدائی تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ ان کی آمد پر طبقۂ علماء کی طرف سے خوشی اور خیر مقدم کے جو جذبات ظاہر کیے گئے تھے، وہ پہلے حیرت اور استعجاب اور پھر اختلاف و مخالفت میں بدل گئے، لیکن مولانا پر اس کا کیا اثر ہوسکتا تھا، ان کے خیالات اور معتقدات لوگوں کو خوش کرنے کے لیے بدلے نہ جاسکتے تھے۔

چنانچہ انھوں نے جامعہ میں بیت الحکمت کھول کر اپنے خیالات کی اشاعت شروع کردی، وہ یہاں درس دیتے اور گاہے گاہے ان کے قلم سے ملک کے موقر رسائل میں کوئی مضمون شائع ہوتا۔ [2]

ان کا پہلا طویل علمی مقالہ جو ہماری نظر سے گزرا ''الفرقان بریلی'' کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' میں تھا، عنوان تھا: ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف''، اس کے بعد لاہور سے آپ کی ایک کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' کے نام سے شائع ہوئی، اور اب حال میں مولانا محمد سرور نے آپ کے حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار کو بڑے سلیقے سے ''مولانا عبیداللہ سندھی'' نامی ایک

---

[1] اور سیاست و معاشرت میں یورپ اور روس و ترکی کی تقلید کو ضروری قرار دیتا ہے، جیسا کہ دیگر حضرات نے اس کی تصریح کی ہے، اور باحوالہ دوسرے مقام پر ذکر کردیا گیا۔

[2] اسی زمانہ میں مولانا سندھی صاحب سے علماء اور عوام میں دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔

www.idaraghufran.org

کتاب میں ترتیب دیا ہے۔ [1]

مولانا عبیداللہ سندھی کی بعض باتوں سے اختلاف کرنا دشوار نہیں، وہ صرف مذہبی معاملات ہی میں نہیں، بلکہ سیاسی امور میں بھی، ولی اللّٰہی طریقے کو اپنا اساسِ کار بتاتے ہیں، اور ''مجاہدینِ بالاکوٹ'' کے اختلافات کو ''ٹراٹسکی'' اور ''سٹالن'' کے اختلاف کی روشنی میں دیکھتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات وافکار میں بسا اوقات تکلف نظر آتا ہے، اور ان کی تصانیف میں ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں، جنھیں آپ بوڑھوں کی بہکی بہکی باتیں کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے کئی نظریے محلِ نظر ہیں، اور ان کے چند ایک بیانات کی صحت میں بھی شبہ نہیں۔

اس کے علاوہ ''صادق پوری پارٹی'' کے متعلق انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں بھی وہ کسی حد تک جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگئے ہیں، لیکن اگر ان کے ارشادات کی تہہ کو پہنچیں، تو مولانا کے مخالف کو بھی ان کے عمیق تفکر، ان کے تبحّر علمی اور ان کے ذہنی قوتِ استخراج کی داد دینی پڑتی ہے''۔ (موجِ کوثر، ص ۳۴۸، ۳۴۹، بعنوان: مولانا عبیداللہ سندھی دیوبندی، مطبوعہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سنِ طباعت: جون 2003ء)

حضرت مدنی نے بھی مولانا سندھی صاحب سے متعلق اپنے بیان میں مندرجہ بالا کئی باتوں کی صراحت فرمائی ہے، انھوں نے بوڑھوں کی بہکی بہکی باتوں کے بجائے، دماغی توازن کے متاثر ہونے کو بنیاد بتلایا ہے، جو ظاہر ہے کہ بعض لوگوں کے بڑھاپے میں ہوجایا کرتا ہے۔

---

[1] آخری دور کے ان تمام مضامین ومقالات سے اختلاف کیا گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔
اگرچہ مولانا سندھی صاحب کی طرف سے ایک طبقے نے تاویلات بھی کیں، لیکن ان تاویلات میں زیادہ وزن ثابت نہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار کی تردید کی ضرورت برقرار رہی، اور اپنے، پرائے اہلِ علم و اہلِ قلم کی طرف سے تردید وتنقید کا سلسلہ جاری رہا۔

www.idaraghufran.org

جہاں تک مولانا سید محمود میاں صاحب کے مضمون پر اس اعتراض کا تعلق ہے کہ مولانا سید محمود میاں صاحب نے تفسیر الہام الرحمٰن کے حوالے سے حیاتِ عیسیٰ سے متعلق عبارت نقل کر کے یہ فرمایا ہے:

''آپ ہی بتلایئے کیا یہ علمائے اہلِ سنت والجماعت دیوبند کا مسلک ہے''۔

تو بہ نظرِ انصاف غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں ہوگا کہ مولانا سید محمود میاں صاحب کا اس سے مقصود یہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب کا دماغی عوارض میں مبتلا ہونے سے قبل بنیادی تعلق اہلُ السنۃ والجماعۃ دیوبند کے مسلک سے تھا، لیکن ان کی طرف بعد از ہجرت کے منسوب مواد میں اس قسم کے افکار پائے جاتے ہیں، جو اہلُ السنۃ والجماعۃ دیوبند کا ہرگز مسلک نہیں کہلائے جاسکتے، لہٰذا ان کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کی طرف سے اس قسم کے افکار، دماغی اختلال کی بنا پر صادِر ہوئے، جس کے بارے میں مولانا سید محمود میاں صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ:

''ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ دنیا میں مواخذہ ہوتا ہے اور نہ آخرت میں''۔

مولانا سید محمود میاں صاحب نے مولانا سندھی صاحب کے غلط افکار وخیالات کی تردید کی ہے، لیکن خود مولانا سندھی کو معذور قرار دیا ہے۔

اور اگر پھر بھی کوئی مولانا سندھی صاحب کو اس سلسلے میں معذور قرار دیے جانے پر اعتراض کرے، تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ وہ مولانا سندھی صاحب کو اُن افکار وخیالات کی بنا پر، جو دین کے مسلمہ اصولوں یا کم از کم اہلُ السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہیں، مسلکِ اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج اور آخرت میں قابلِ مواخذہ قرار دیتا ہے، اگرچہ وہ اپنے آپ کو مولانا سندھی صاحب کا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتا ہو، کیونکہ مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متعدد افکار وخیالات کے غلط ہونے پر ان کا وہ کلام اور تقاریر جن کو مستند اور

اہلِ ثقہ واہلِ علم حضرات نے اپنے کانوں سے سنا، جن میں مولانا سندھی صاحب کے عقیدت مند وقابلِ اعتماد تلامذہ اور مولانا لاہوری جیسے حضرات بھی داخل ہیں، اور انھوں نے ان چیزوں کو آگے نقل کیا، اور مولانا سندھی صاحب کے وہ مضامین وتحریرات، جن کو خود مولانا سندھی صاحب کے انتہائی معتمد اور تربیت یافتہ افراد وحضرات نے املا ونقل کیا، دلالت کرتے ہیں، اور کسی کے حق میں اس طرح کی باتوں کے قضاءً ثبوت کے لیے یہ ذرائع کافی ہوتے ہیں۔

پس مولانا سندھی صاحب کے ساتھ اس قسم کی خیر خواہی اور ہم دردی کا دعویٰ کرنے والے حضرات کی مثال اُس بوڑھی عورت کی طرح ہوگی، جس نے شاہی باز کے ٹیڑھے میڑھے پنجوں اور چونچ کو اپنی طرف سے خیر خواہی سمجھتے ہوئے اس لیے کاٹ دیا تھا کہ باز کو ٹیڑھے میڑھے پنجوں اور چونچ سے کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں مشکل پیش آتی ہوگی، جس کے نتیجہ میں وہ باز پوری طرح ہی معذور ہوگیا تھا۔

جس طرح سے ایک ریچھ نے اپنے مالک کے منہ پر بار بار بیٹھنے اور تنگ کرنے والی مکھی کو ہلاک کرنے اور اپنے مالک کو اس تنگی اور الجھن سے بچانے کے لیے ایک زوردار پتھر اٹھا کر اپنے مالک کے منہ پر دے مارا تھا، تاکہ اس کا مالک اس مکھی کے بار بار تنگ کرنے سے محفوظ ہوجائے، لیکن مکھی تو پتھر لگنے سے پہلے ہی اڑ کر فرار ہوگئی، مگر اس کے مالک کا سر کھِیل ہوگیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو حضرات مولانا سندھی صاحب کو مصائب وعوارض کی وجہ سے آخری دور میں دماغی وقلبی اعتبار سے کسی درجے میں معذور قرار دینے کی تاویل کرتے ہیں، وہ مذکورہ تاویل کی بنا پر درحقیقت مولانا سندھی صاحب کے لیے اپنی طرف سے خیر خواہی وہم دردی کے متلاشی اور ان کے ساتھ دیانتاً حسنِ ظن رکھنے کے خواہاں ہیں، اگرچہ کوئی اُن کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ اپنے تئیں اور ظاہری طور پر یا صورتاً خیر خواہی وہم دردی کرنے یا حسنِ ظن رکھنے والوں کے درجے میں شامل کرنے کے لیے تیار نہ ہو، کیونکہ بہ

ہر حال آخری دور میں غلط اور شاذ و متضاد افکار و خیالات کے مولانا سندھی صاحب سے صدور کا انکار درست نہیں کہلا سکتا۔

جو حضرات مولانا سندھی صاحب کو آخری دور تک دماغی و قلبی اعتبار سے ہر طرح عاقل اور غیر معذور قرار دینے کے درپے ہیں، وہ مولانا سندھی صاحب کے ساتھ اپنے تئیں اور بظاہر صورتاً تو خیر خواہی و ہم دردی اور حسنِ ظن اختیار کر رہے ہیں، لیکن حقیقتاً ان کو خیر خواہی و ہم دردی کرنے اور حسنِ ظن رکھنے والوں کے درجے میں شامل کرنا مشکل ہے۔

اور جہاں تک بعض حضرات کی طرف سے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل'' کتاب میں بعض باتیں جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب نے داخل کر دی تھیں، اس لیے اس کا حوالہ معتبر نہیں، تو اس کا جواب پہلے فصل نمبر 1 میں گزر چکا ہے۔

## مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی بیان کردہ توضیح

فاضل ناقد، حضرت مدنی کا ماہنامہ ''برہان'' کے حوالہ سے بیان نقل کرنے کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں:

> ''اگر اسے حضرت مدنی رحمہ اللہ کا (مضمون و بیان) تسلیم کر لیا جائے، تو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے، اس سے بہتر تبصرہ اور توجیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی، حضرت مفتی صاحب کا تبصرہ اگلے صفحات میں آ رہا ہے''۔ (''یادگارِ اکابر''، صفحہ ۹۲۹)

فاضل ناقد نے حضرت مدنی کے مضمون و بیان میں مذکورہ تصریحات اور اس بیان کے متعلق متعدد مستند اصحابِ علم و اہلِ قلم حضرات کی توضیحات، تائیدات و توثیقات کو نظر انداز کر کے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے تبصرے کو اپنے موقف کا ترجمان سمجھ کر یہ فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے کہ ''اس سے بہتر تبصرہ اور توجیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی''۔

www.idaraghufran.org

چونکہ ماہنامہ ''برہان'' بنیادی طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا، اور مولانا سعید صاحب اپنے دور میں وہ شخص تھے، جنھوں نے دوسرے اصحابِ علم کے برعکس، مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے افکار میں کچھ تاویلات کر کے، مولانا سندھی صاحب کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی، اور اس کا اثر ماہنامہ ''برہان'' کے مضامین میں بھی نظر آتا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر باحوالہ مفصل ذکر کر دیا گیا ہے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں سرسید احمد خان کا بھی دفاع کیا ہے۔

جب کہ مولانا سندھی صاحب نے اپنے آپ کو سرسید احمد خان کا مثنیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ [1]

اس لیے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی وہ مفصل تحریر ملاحظہ کی جائے، جس کا فاضل ناقد نے حوالہ دیا ہے، جس کے بعد اس مفصل تحریر کے چند مندرجات پر ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ کلام کیا جائے گا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب اپنی مذکورہ مفصل تحریر میں فرماتے ہیں:

> اس اشاعت میں مولانا سندھی کے متعلق حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا ایک بیان قارئینِ کرام کی نظر سے گزرے گا، جو بعض اخبارات میں بھی

---

[1] جناب ضیاء الدین لاہوری صاحب، اپنے مضمون ''سرسید، مفتی عتیق الرحمان عثمانی کی نظر میں'' میں لکھتے ہیں:
دار العلوم دیوبند کے مجلّہ کا ایک پرانا شمارہ فروری 1979ء مطالعے میں آیا۔ اس میں مفتی عتیق الرحمان عثمانی صاحب کا ایک مضمون "" سرسید میری نظر میں "" پڑھا تو صاحبِ مضمون کے ایک عجیب انکشاف پر چونک پڑا۔ جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے، اس میں مفتی صاحب سرسیدی حضرات سے بھی کئی قدم آگے دکھائی دے رہے ہیں، کیونکہ انھوں نے وقت کے حالات کو جواز بنا کر سرسید کے دینی خیالات کا نہایت دل فریب انداز میں بھرپور دفاع کیا ہے۔ ان کی بیان کردہ بہت سی باتیں غیر مصدقہ ہی نہیں بلکہ دلائل سے غلط ثابت ہوتی ہیں۔ (ماہنامہ الحق اکتوبر 2002ء، ص ۴۶)
سرسید احمد خان صاحب کی خدمات اور ان کے متنازع وشاذ افکار پر کلام آگے فصل نمبر 5 میں آتا ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

شائع ہو چکا ہے، مولانا سندھی اور مولانا مدنی دونوں ایک ہی مادر درس گاہ کے فرزندانِ جلیل اور ایک ہی استاد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے خاص الخاص تلامذہ ہیں، پھر مولانا مدنی کی نسبت ہر موافق ومخالف کو یہ تسلیم ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی ادنیٰ درجے کی مداہنت یا رواداری کو بھی برداشت نہیں کر سکتے، اس بنا پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مدنی سے زیادہ کسی اور کو یہ حق نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ غالب کے لفظوں میں اس کا اعلان کرتے۔

ہم پیشہ وہم مشرب وہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

مولانا سندھی کی حیاتِ جدوجہد کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو وہ تین ادوار پر مشتمل نظر آئے گی، پہلا دور دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی سے شروع ہو کر ہندوستان میں قیام تک پر منتہی ہو جاتا ہے، دوسرا دور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ایما سے افغانستان کے لیے روانگی سے شروع ہوتا ہے، اور قیامِ حجاز پر ختم ہوتا ہے، تیسرا دور آخری دور ہے، جو ایک عرصۂ دراز کی جلاوطنی کے بعد ورودِ ہندوستان سے شروع ہوتا ہے، اور مولانا کی زندگی کے ساتھ وہ بھی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، ان میں سے پہلے دو دوروں کی نسبت مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر جامع، مکمل اور بصیرت افروز ہے کہ ہمارے خیال میں کسی اور کے لیے اس سے زیادہ کہنا مشکل ہے، بیان کے اس حصے میں مولانا مدنی نے مولانا سندھی کی ذہانت وفطانت، بلند کیرکٹر، اعلیٰ نصب العین زندگی، اس نصب العین کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہ کرنا، خلوص وللّٰہیت، بے غرضی اور بے نفسی، حق کے لیے انتہائی جرأت ودلیری، ذہنی اور دماغی بلندی، روحانی اور اخلاقی کمالات، غرض یہ ہے کہ ایک ایک چیز کی نسبت مولانا نے پورے انشراحِ خاطر اور اطمینانِ

قلب کے ساتھ اپنے مشاہدات ومحسوسات کو بیان کیا ہے۔

اس سے ان لوگوں کی کھلی تردید ہوتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مولانا سندھی سے تو اربابِ دیوبند، ان کے خیالات کی وجہ سے اسی وقت کھٹک گئے تھے، جب کہ مولانا ابھی دیوبند میں ہی تشریف رکھتے تھے۔

ساتھ ہی ان کی بھی تردید ہوتی ہے، جو فرماتے ہیں کہ مولانا کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ یا اسلام کی سربلندی نہیں، بلکہ ان کی تمام جدوجہد کا مقصد قومیت پرستی اور وطن پرستی تھا، بیان کے اس حصے میں مولانا نے مولانا سندھی کے کارنامہ ہائے عزیمت وجہاد کی داد اُسی کشادہ دلی سے دی ہے، جیسا کہ ایک منصف سپاہی اپنے دوسرے شریکِ جنگ سپاہی کو اس کی بہادری کی داد دیتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب جھیلی ہیں، مگر مولانا عبیداللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں، اگر غور کیا جائے، تو پہاڑ اور ذرہ کا فرق پایا جائے گا''۔

اس موقع پر ہم ایک اور شہادت بہم پہنچانا چاہتے ہیں، 1928ء میں جب کہ مولانا سندھی حجاز میں مقیم تھے، ہمارے رفیقِ کار مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی حج کے لیے روانہ ہونے لگے، اور حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں رخصت ہونے کے لیے حاضر ہوئے، تو حضرت شاہ صاحب نے آبدیدہ ہوکر رقت آمیز آواز سے فرمایا:

''بھئی! مکہ میں مولانا عبیداللہ صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا، اور یہ پیام پہنچا دینا کہ آپ کے قیامِ دیوبند کے زمانہ میں، میں آپ کے لیے باعثِ تکلیف بنا، اس وقت مجھ کو اصل حالات کا احساس نہیں ہوسکا تھا، اب احساس ہوا ہے، اور

اصل حقیقت معلوم ہوئی ہے، تو مجھ کو بڑی ندامت اور انفعال ہے، اب میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی ملال نہیں ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ میری جانب سے کوئی تکدّر نہ رکھیں گے''۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس آنے تک مولانا سندھی کے متعلق جماعتِ دیوبند کے اکابر کس درجے پر از عظمت جذباتِ احترام وعقیدت رکھتے تھے۔ [1]

---

[1] یہ بات ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری کا وصال، مولانا سندھی صاحب کے ہندوستان واپس تشریف لانے سے پہلے ہو چکا تھا، جیسا کہ آگے آتا ہے، اور جب انہدامِ قبب کے موقع پر 1344 ہجری میں علمائے ہند کا وفد موتمر میں شریک ہوا، اس وقت مولانا سندھی صاحب ترکی میں تھے، حجاز نہیں پہنچے تھے، وہ اس کے کچھ ماہ بعد 1345 ہجری میں حجاز پہنچے۔

خود مولانا عبید اللہ سندھی صاحب لکھتے ہیں:

سن 1344 ہجری، موسمِ حج پر مکہ معظّمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی، میرے تمام دوست اس میں آرہے تھے، میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستہ سے مکہ معظّمہ پہنچنے کی کوشش کی، مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر 1345 ہجری میں پہنچا، میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا، میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا، اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہو گیا، اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی، تو حکومت نے اسے پورا کر دیا، میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیائے امور حارج نہیں ہوئے، اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں، جزاہم اللہ خیرا۔ (ذاتی ڈائری، صفحہ ۲۴ و ۲۵، ناشر: ادبستان، بیرون موچی دروازہ، لاہور، بارِ اول: اکتوبر 1946 عیسوی)

اور جناب ظفر حسن ایبک صاحب لکھتے ہیں:

1926 عیسوی کے موسمِ بہار میں ہندوستانی اخبارات سے جو ہمیں استانبول کے اخبار ''وقت'' کے دفتر سے مل جایا کرتے تھے، معلوم ہوا کہ موتمر اسلامی اس سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والی ہے، جس میں دنیائے اسلام کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے بھی شریک ہونے کی توقع ہے، قبلہ مولانا (سندھی) نے سوچا کہ اگر کسی طرح اس سال حج کے کے موقع پر حجاز پہنچ جائیں، تو حج کے لیے آنے والے لوگوں سے مل کر، ان کے ذریعے اپنے ہندوستانی دوستوں اور لیڈروں کو اپنے پروگرام کے متعلق پیغام بھیج سکیں گے۔

لیکن یہاں سے ان کا حجاز جانا ناممکن تھا، کیونکہ اس زمانے میں کوئی ترکی یا غیر ملکی جہاز استنبول سے براہِ

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

اب رہا مولانا سندھی کی زندگی کا تیسرا دور تو اس کے متعلق مولانا مدنی نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کا حاصل دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ مصائب و آلامِ پیہم کا شکار ہونے کے باعث مولانا کا مزاج اور دل و دماغ غیر متوازن ہوگئے تھے، اور دوسرے یہ کہ مولانا نے لوگوں سے درخواست کی ہے کہ وہ مولانا سندھی کے افکار کو اس وقت تک قبول نہ کریں، جب تک وہ انھیں قرآن و حدیث اور سلف صالحین کے مسلکِ قویم پر نہ پرکھ لیں۔

جہاں تک دوسری چیز کا تعلق ہے، ممکن ہے وہ کسی کو ناگوار ہو، مگر واقع یہ ہے کہ اول تو اس میں مولانا سندھی کی ہی کیا خصوصیت ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا ولی اللہ بھی کوئی ایسا نہیں ہے، جس کی بات محض اس لیے قابلِ قبول ہو کہ وہ اس کی زبان سے نکلی ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

پھر مولانا سندھی کا معاملہ تو یہ ہے کہ مولانا نے خود اپنے قلم سے بہت کم لکھا ہے، جو چیزیں آج ان کے نام سے شائع ہو رہی ہیں، وہ زیادہ تر وہی ہیں، جو مولانا نے املا کرائی ہیں، یا جو لوگوں نے مولانا کی تقریر سن کر خود قلم بند کی ہیں، پھر ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسا کہ مولانا حسین احمد صاحب فرماتے ہیں:

''ان کے قابل اور غیر معمولی دماغ سے اس آخری دور میں بھی جب کہ وہ

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

راست حجاز نہ جاتا تھا.....ان (یعنی مولانا سندھی) کو راستے میں اتنی دیر لگ گئی کہ وہ 1926 عیسوی کے حج کے موقع پر حجاز نہ پہنچ سکے، اور مؤتمر میں شریک نہ ہو سکے، ہندوستانی حاجی اس وقت ہندوستان لوٹ چکے تھے، اس لیے ان کو ان لوگوں کے ذریعے اپنا پیغام ہندوستان بھیجنے کا اس سال کوئی موقع نہ ملا۔ (خاطرات ''آپ بیتی''، صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴، باب سترہواں، مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی''، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

مؤتمر کے اس اجلاس کی کچھ تفصیل ہم نے اپنی دوسری تالیف ''متبرک مقامات و آثار کے فضائل واحکام'' سے متعلق بعض رسائل میں ذکر کر دی ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا، برس ہا برس کی جدوجہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق ظہور پذیر ہوتے رہے، جو اہلِ فکر کے لیے دعوتِ فکر ونظر کا سامان تھے، ان سے اصحابِ فہم حضرات اصولی طور پر پرکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں''۔

مولانا کے افکار نہایت بلند ہوتے تھے، مگر افسوس ہے کہ افکار جتنے بلند تھے، اس کے مطابق مولانا تحریر اور تقریر پر قدرت نہ رکھتے تھے، ان وجوہ کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ مولانا نے کہا کچھ اور ہو، اور مستملی حضرات نے اس کا کچھ اور مطلب سمجھ کر اسے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہو، بہ ہر حال ان چیزوں کے پیشِ نظر مولانا مدنی کے لیے یہ کہنے کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا کہ مولانا سندھی کے بلند نصب العین اور ان کی بلند شخصیت کا کماحقہٗ احترام کرتے ہوئے اربابِ فہم کو چاہیے کہ ہر وہ چیز جو مولانا سے منسوب ہو کر شائع ہو، اس کو یونہی قبول نہ کر لیں، بلکہ اس کو قرآن و حدیث اور سلفِ صالحین کے مسلکِ قویم پر پرکھنے کے بعد قبول کریں، علاوہ بریں واقعہ یہ بھی ہے کہ اب تک جو چیزیں مولانا سندھی کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، انھیں پر بس نہیں ہے، بلکہ مولانا کی تحریروں، تقریروں اور افادات و امالی کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اور لوگوں کے پاس محفوظ ہے، جو تدریجی طور پر شائع ہوتا رہے گا، اس بنا پر مولانا مدنی کیا کوئی شخص بھی اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتا کہ اب تک مولانا سندھی کے نام سے جو چیزیں چھپ چکی ہیں، یا آیندہ چھپتی رہیں گی، وہ سب برحق ہیں، اور ان کو تنقید کے بغیر من وعن قبول کر لیا جائے، اس طرح کا ذمہ تو مولانا سندھی کیا دنیا کے بڑے سے بڑے ولی کامل کی نسبت بھی نہیں لیا جا سکتا، اس بنا پر مولانا سندھی کے آخری دور سے متعلق مولانا مدنی نے یہ جو کچھ فرمایا ہے، ہمارے خیال میں بالکل مناسب اور معقول ہے، اس

پر کسی مخالف یا موافق کو برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب رہی دماغ اور دل کے عدمِ توازن کی بات، تو اس پر کسی کو اچھنبا نہیں ہونا چاہیے، علامہ ابنِ حزم ظاہری، جن کے کلام میں بے انتہا شدت اور تیز بیانی پائی جاتی ہے، ان کے متعلق بھی ان کے سوانح نگاروں نے لکھ دیا ہے کہ ان کا جگر خراب تھا، اس لیے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا، پس جیسا کہ مولانا مدنی فرماتے ہیں، اگر مولانا سندھی کے مزاج میں بھی پیہم آلام ومصائب کے باعث تغیّر وتبدّل پیدا ہو گیا، اور ان کی سنجیدگی ومتانت تیز طبعی، اور حدتِ مزاجی سے بدل گئی، تو اس سے ان کی بلند شخصیت اور اعلیٰ کیرکٹر پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جس کا خود مولانا مدنی نے بھی اعتراف کیا ہے۔

(ماہنامہ ''برہان'' ندوۃ المصنفین، دہلی، جلد چہاردہم، شمارہ ۴، ربیع الثانی 1364 ہجری، مطابق اپریل 1945ء صفحہ نمبر ۱۹۴ تا ۱۹۸)

یہ تھا مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا وہ تبصرہ، جس کو فاضل ناقد نے سب سے بہتر توجیہہ پر مشتمل قرار دیا ہے۔

لیکن اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، حضرت مدنی کے اس مضمون کو سچا اور سب سے معتمد قرار دے رہے ہیں۔

فاضل ناقد اس مضمون کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، تو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بنیادی موقف سے ہی فاضل ناقد کا اختلاف ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، حضرت مدنی کے مضمون کے پیشِ نظر یہ تسلیم فرماتے ہیں:

''مصائب وآلامِ پیہم کا شکار ہونے کے باعث مولانا کا مزاج اور دل ودماغ غیر متوازن ہو گئے تھے''۔

www.idaraghufran.org

فاضل ناقد، مولانا سندھی صاحب کو آخری دور تک دماغ کے توازن کو درست قرار دینے پر مصر ہیں، اور انھیں حضرت مدنی کی طرف سے بیان کردہ، مولانا سندھی صاحب کے دماغی توازن کھو بیٹھنے کے فیصلے سے اتفاق نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب، حضرت مدنی کے قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مولانا سندھی کے افکار کو اس وقت تک قبول نہ کریں، جب تک وہ انھیں قرآن وحدیث اور سلفِ صالحین کے مسلکِ قویم پر پرکھ نہ لیں''۔

لیکن فاضل ناقد کو ان ہی حضرات سے شدید اختلاف ہے، جنھوں نے حضرت مدنی کے اتباع میں یہ عمل کیا، بلکہ فاضل ناقد، ان کو مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ظلم کا مرتکب قرار دیتے ہیں۔

البتہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی توضیح وتوجیہہ میں چند باتیں قابلِ تامل معلوم ہوئیں، جن پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی حیاتِ جدوجہد کو تین ادوار پر مشتمل قرار دیا ہے۔

پہلا دور دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی سے شروع ہو کر ہندوستان میں قیام تک۔

دوسرا دور افغانستان کے لیے روانگی سے شروع ہو کر قیامِ حجاز تک۔

تیسرا دور عرصۂ دراز کی جلاوطنی کے بعد ورودِ ہندوستان سے شروع ہو کر مولانا کی زندگی کی انتہا تک۔

اسی بنیاد پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے افکار کی تعیین وتشریح کی ہے، اور حضرت مدنی کے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متضاد افکار

سے متعلق بیان کو تیسرے دور پر محمول فرمایا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ حضرت مدنی نے اپنے بیان میں جو اپنا مشاہدہ بیان فرمایا، وہ دوسرے دور کے متعلق بھی ہے، چنانچہ حضرت مدنی اپنے اس بیان میں فرماتے ہیں:

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور وطرز ہوتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضاد میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے۔

(ماہنامہ ''برہان'' ربیع الثانی 1364 ہجری، مطابق اپریل 1945ء)

اب حضرت مدنی تو اپنی تحریر میں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے قیامِ حجاز کے زمانے میں اپنے مشاہدہ کو تعجّب وتحیّر کی انتہا پر ہونا بیان فرما رہے ہیں، اور ہندوستان تشریف لانے کے بعد احوالِ متضادّہ میں کمی کے بجائے اضافہ کا حکم بیان فرما رہے ہیں۔

جس سے ظاہر ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات اور مزاج میں ہندوستان سے واپسی سے قبل ہی تغیر پیدا ہو گیا تھا، تو حضرت مدنی کے بیان کی تشریح وتوضیح میں پہلے اور دوسرے دور کے حالات وافکار کو تیسرے دور سے الگ کر کے حکم بیان کرنا حضرت مدنی کے بیان کی تصریح سے کیسے میل کھا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متعدد حضرات جو مولانا سندھی صاحب کے قیامِ حجاز کے زمانے میں ان سے ملاقات کر کے واپس آتے تھے، وہ بھی مولانا سندھی صاحب کے مختلف افکار وخیالات سے بدظن ہوتے تھے، جس کا مشاہدہ کار حضرات کے مضامین میں ذکر ہے، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔

نیز مولانا سندھی صاحب کے معتمد تلامذہ نے جن افکار وخیالات کو روس اور حجاز کے زمانہ میں قلم بند اور املا کیا ہے، اور خود اس عرصے میں مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات میں غیر معمولی تغیّر کا ذکر کیا ہے، وہ بھی ہندوستان واپسی سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہیں، وہ الگ بات ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے ان افکار وخیالات کا اکثر حضرات کو علم اس وقت ہوا، جب مولانا سندھی صاحب واپس ہندوستان تشریف لائے، اور ان کے سامنے مولانا سندھی صاحب نے اپنے افکار وخیالات کا اظہار کیا۔

جہاں تک آخری دور کے متعلق مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی طرف سے حضرت مدنی کے بیان کی توضیح کا تعلق ہے، جس سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا سندھی صاحب کے صرف مزاج اور طبیعت میں عدمِ توازن پیدا ہو گیا تھا، تو اس سے بھی علی الاطلاق اتفاق مشکل ہے، کیونکہ حضرت مدنی نے اپنی تحریر میں دماغی انقلاب کے علمی و مذہبی امور میں بھی متجاوز ہونے کا صاف حکم فرمایا ہے، اور اس کی بنیاد پر مولانا سندھی صاحب کی تحریر وکلام میں مذکور افکار کو کسوٹی پر پرکھ لینے کا حکم فرمایا ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مدنی کی تحریر کے الفاظ درج ذیل ہیں:

> ''ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال واستقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شیون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔
>
> چنانچہ یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔.....

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔

(ماہنامہ ''برہان'' ربیع الثانی 1364 ہجری، مطابق اپریل 1945ء)

مذکورہ بالا عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت مدنی کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کی علمی ومذہبی تقاریر وتحریرات میں بھی دماغی وقلبی انقلاب واختلال متجاوز ہوا۔

اصل محلِ کلام، علمی ومذہبی تقاریر وتحریرات میں پائے جانے والا انقلاب واختلال ہی ہے۔

جہاں تک مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی اس بات کا تعلق ہے:

''اس سے ان لوگوں کی کھلی تردید ہوتی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مولانا سندھی سے تو اربابِ دیوبند، ان کے خیالات کی وجہ سے اسی وقت کھٹک گئے تھے، جب کہ مولانا ابھی دیوبند میں ہی تشریف رکھتے تھے''۔

جس کی بنیاد پر بعض لوگ یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ مولانا سندھی صاحب کے خیالات سے اربابِ دیوبند کو، دیوبند کے قیام کے زمانے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

تو اس بات سے بھی علی الاطلاق اتفاق مشکل ہے، البتہ اس میں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے متعلق جماعتِ دیوبند کے اکابر کی عظمت واحترام پر تو گفتگو بعد میں کی جائے گی، پہلے مولانا سندھی صاحب کے دیوبند میں ہونے کے وقت اربابِ دیوبند کے اختلاف سے متعلق چند عبارات وحولہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:

مولانا سندھی کے افکار وخیالات کی بوالعجبی کا پتہ اہلِ دیوبند کو تو 1912 عیسوی ہی میں مل گیا تھا، جب وہ مؤتمر الانصار کی دعوت لے کر اٹھے تھے، اور آخر وہ مؤتمر سے دست کش ہو کر دلی میں مسجد فتح پوری کے اندر نظارۃُ المعارف القرآنیہ بنا کر بیٹھے، اور چند انگریزی وعربی کے فارغ التحصیل اور نیم فارغ التحصیل طلبہ کو قرآن کا درس دینے لگے۔ ان کے اس درس کا منشا یہ تھا کہ پورے قرآن کو جہاد وسیاست ثابت کیا جائے، اور تمام احکام کو اس جنگی رنگ میں پیش کیا جائے۔

(مقدمہ ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر''، دار الدعوۃ السّلفیہ، شیش محل روڈ لاہور، تاریخِ اشاعت، صفر، ۱۴۰۶ھ، نومبر ۱۹۸۵ء)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی کے بعض افکار وخیالات، اہلِ دیوبند حضرات کو 1912 عیسوی میں ہی عجیب محسوس ہو گئے تھے، اگرچہ وہ افکار وخیالات اس نوعیت کے نہ ہوں، جس نوعیت کے بعد از ہجرت سامنے آئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی تصنیف ''احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں لکھتے ہیں:

خاکسار جس زمانہ میں پڑھنے کے لیے دارُ العلوم (دیوبند) میں داخل ہوا، یہ وہ زمانہ تھا، جب مولانا سندھی اور دارُ العلوم کے اربابِ حل وعقد کے درمیان تلخیاں بڑھتی ہوئی اس حد تک پہنچ چکی تھیں، کہ دیوبند سے کنارا کش ہو کر دلی کو مولانا سندھی نے اپنا مستقر بنا لیا تھا، اور نظارۃُ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک خاص نوعیت کا تعلیمی ادارہ قائم کر کے چند مخصوص طلبا کو قرآن کا درس اپنے ایک خاص نقطۂ نظر سے دے رہے تھے۔ (احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، صفحہ ۱۳۶، باب نمبر ۱۰، ترتیب: مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، تاریخِ اشاعت: ۱۴۲۵ھ)

www.idaraghufran.org

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی اسی مذکورہ کتاب میں دارُالعلوم دیوبند میں منعقدہ ایک آنکھوں دیکھی نشست میں اکابرِ دیوبند کے مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کے قضیے کا حال بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

دیکھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم غصہ میں ان (مولانا سندھی) کے خیال پر تنقید فرمارہے ہیں، ان کی تقریر تو یاد نہ رہی، ان کے بعد مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر کی تھی، ان کی تقریر کا یہ فقرہ بھولا نہیں جاتا، کہا تھا کہ ''یہ مولوی عبیداللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے ایک فرد ہیں، لیکن جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے، تو کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح ہماری جماعت سے یہ الگ کردیے گئے''، قریب قریب کچھ اسی نوعیت کے الفاظ تھے۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۸)

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے تفصیلی مضمون میں فرماتے ہیں:

''سرور صاحب کا جو بیان ہے کہ علمائے دیوبند جنھیں انھوں نے ''مشائخِ دیوبند'' کے نام سے موسوم کیا ہے، ان ''علماء'' یا ''مشائخِ دیوبند'' سے مولوی عبیدُاللہ صاحب کو کافر کا لقب بھی ملا''۔ (صفحہ ۲۲)

ان مشائخ اور علماء میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مفتی عزیزُ الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم، مولانا حبیبُ الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی وغیرہم حضرات کے سوا اور کون کون سے حضرات تھے؟ کیونکہ یہ سارے واقعات خاکسار کے سامنے گزرے ہیں، جب دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت ایک طالب علم کے فقیر شریک تھا۔ وہ مسئلہ کیا تھا، اور بالآخر مولوی عبیداللہ صاحب کو یہ فیصلہ کرنا پڑا، جیسا کہ ان ہی کے الراوی یہ سرور صاحب راوی ہیں:

''وہ (یعنی مولوی عبیداللہ صاحب) جان گئے کہ اسلام وہ نہیں ہے جس کے ٹھیکے دار یہ لوگ ہیں''۔ (صفحہ ۲۲) ''یہ لوگ'' یعنی مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی عزیزُ الرحمٰن

صاحب، مولانا حبیبُ الرحمٰن اور مولانا شبیر احمد صاحب وغیرہم حضرات جس اسلام کے ٹھیکے دار ہیں، مولوی عبیدُ اللہ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سرے سے وہ اسلام ہی نہیں ہے''۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۱۷ و ۱۱۸، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب اہلِ دیوبند میں ایک ذمہ دار شخصیت ہیں، وہ ایک عرصے تک دیوبند کے ترجمان ''القاسم'' کے رئیس التحریر بھی رہے۔

انھوں نے اپنے مشاہدہ کی روشنی میں مولانا سندھی صاحب سے دیوبند کے قیام کے زمانہ میں متعدد مشائخ وعلمائے دیوبند کے اختلاف کی تصریح کی ہے۔

ہفت روزہ ''صدق'' کے مبصر فرماتے ہیں:

مولانا سندھی کے ساتھ راقم الحروف کو بھی کافی زمانے تک عقیدت رہی ہے، اور جب تک وہ جلاوطن رہے، مراسلت بھی رہی۔ اور میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ مولانا سندھی سے صرف ایک مسئلہ میں اجتہادی غلطی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اکابر دارُالعلوم دیوبند نے ان کا تعلق دارُالعلوم سے منقطع کر دیا تھا۔ لیکن جس وقت میں ان سے مکہ معظّمہ میں حاضر ہو کر ملا، اور وہاں کئی ماہ کے قیام میں بیش تر مواقع ملاقات ومجالست کے پیش آئے، اور ان کے نئے نئے خیالات وآرا سے واقف ہوا، تو میں نے اور میرے ساتھ دوسرے رفقا نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ مولانا سندھی نے اپنی طویل جلاوطنی اور غیر جنس صحبتوں کے ناخوش گوار اثرات کے ماتحت، دارُالعلوم دیوبند کی زندگی کے بہتر وخوش گوار اثرات کو ایک ایک کر کے فنا کر دیا ہے۔ (ہفت روزہ ''صدق'' ۲۰ نومبر ۱۹۴۴ء) (ماخوذ از: بیسویں صدی کے اسلامیت کے، ممتاز شارح، ان کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۱۸۵، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ، سال اشاعت، جولائی ۲۰۰۵ء)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب سے بعض مسائل میں اکابر دارالعلوم دیوبند کو پہلے بھی اختلاف تھا، وہ الگ بات ہے کہ بعد کا اختلاف اس پہلے اختلاف سے زیادہ شدید تھا۔

سید محبوب رضوی صاحب اپنی مفصل و مدلل تالیف ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' میں فرماتے ہیں:

> آپ دارالعلوم کو سیاسی انداز سے ملی تنظیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے، جس کا پہلا نقش جمعیۃُ الانصار کا قیام تھا، اسی دوران میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ کے مابین بعض علمی مسائل میں شدید اختلاف رونما ہوگیا، جس کے سبب سے اُن کو دیوبند چھوڑنا پڑا، حضرت شیخ الہند نے اُن کو دہلی بھیج دیا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۲ ص ۶۵، بابِ چہارم، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی، سنِ اشاعت: صفر المظفر 1426ہجری، 2005عیسوی)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کی جلاوطنی سے پہلے بھی مولانا سندھی اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ کے مابین بعض مسائل میں شدید اختلاف تھا، جس کے سبب ان کو دیوبند چھوڑنا پڑا تھا۔

نیز سید محبوب رضوی صاحب مزید فرماتے ہیں:

> مولانا سندھی عصرِ حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کے سب سے بڑے داعی اور علم بردار تھے، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں شاہ صاحب نے جو تجدید فرمائی ہے، مولانا سندھی اس کے ایک عظیم شارح تھے، ہر چند اُن کے بعض افکار سے اہلِ علم کو اختلاف بھی رہا، مگر اختلافِ رائے کے باوجود اُن کی علمی فضیلت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۲ ص ۶۷، بابِ چہارم، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی، سنِ اشاعت: صفر المظفر 1426ہجری، 2005عیسوی)

اس قسم کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے بعض افکار و خیالات سے

اربابِ دیوبند کو پہلے ہی اختلاف ہو گیا تھا، اگرچہ اس کی نوعیت ایسی نہ ہو، جیسی نوعیت ہجرت کے بعد کے اختلاف کی تھی، اور اس اختلاف کی پوری طرح افہام وتفہیم میں اگرچہ بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

مولانا سندھی صاحب اور دیگر اہلِ علم حضرات کے مابین ایک نو اختلافی مسئلہ غیر مسلم کی نجات کے متعلق بھی تھا۔

جناب مولانا عبداللہ لغاری صاحب اور جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب لکھتے ہیں:

ایک بار نجاتِ غیر مسلم کے بارے میں مولانا سندھی رحمہ اللہ مولانا انور شاہ صاحب سے گفتگو کر رہے تھے، مولانا سندھی نے فرمایا کہ اگر ایک غیر مسلم آدمی جو بااخلاق ہے، اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہے، اور لوگوں میں اصلاح کرتا ہے، اور اس کے اعمال بھی بھلے ہوں، تو وہ قیامت میں نجات کا مستحق ہے، مولانا انور شاہ صاحب نے کہا ''کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی نہ مانے، تو وہ بھی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے؟'' مولانا نے غصے سے کہا بے شک میں یہی سمجھتا ہوں، کیونکہ تمھاری تبلیغ ان کے کانوں میں نہیں پہنچی، اس پر غصہ ہو کر انھوں نے مولانا پر کفر کا فتویٰ صادر کیا، اور اراکینِ مدرسہ کو اطلاع کر دی، انھوں نے کہا اگر ان کا یہ اعتقاد ہے تو وہ کافر ہیں، پھر انھوں نے ایک مجلس میں مولانا سندھی کو بلوایا، اور ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے اور اس کے اخلاق اچھے ہوں، وہ مسلمانوں کی طرح نجات کا مستحق ہے، مولانا سندھی نے کہا کہ بے شک میں نے یہ کلمہ کہا ہے، انھوں نے کہا آپ نے کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہے، آپ پر کفر کا فتویٰ عائد ہوتا ہے، اب آپ اس سے توبہ کریں، تو یہاں رہیں، ورنہ چلے جائیں، مولانا سندھی نے فرمایا کہ میں توبہ کرنے کے لیے تیار ہوں، پھر انھوں نے مولانا کو کلمہ اور آیت

(آمنت۔ناقل) باللہ پڑھائی، اور استغفار اور توبہ کرانے کے بعد کہا۔اب آپ مسلمان ہیں۔

اس جھگڑے اور مخالفت کے زمانے میں مولانا شیخ الہند موجود نہ تھے، وہ گنگوہ کی طرف گئے ہوئے تھے، اور وہاں وہ ہفتہ بھر کے لیے ٹھہر گئے تھے، مولانا سندھی نے جمعیت الانصار کی نظامت کے عہدے سے استعفا لکھ کر اراکینِ مدرسہ کے حوالے کیا، اور اسٹیشن آ کر سہارن پور کا ٹکٹ لیا، سہارن پور کے اسٹیشن پر مولانا شیخ الہند سے ملاقات ہوگئی، ان سے سارا واقعہ بیان کیا، اور اپنے استعفا کا بھی ذکر کر دیا، وہ بہت خوش ہوئے، اور فرمایا آپ نے بہت اچھا کیا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ دیوبند میں رہیں، اب آپ سیدھے دہلی چلے جائیں، اور وہاں کوئی مدرسہ کھولیں، مولانا سندھی نے دہلی پہنچ کر فتح پوری مسجد کے ایک کمرے میں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کی، حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی غرض یہ تھی کہ مولانا دہلی میں رہ کر ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع کریں۔

جب مولانا سندھی مکہ شریف میں تھے، تو مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے ان کی طرف خط لکھا کہ میں غلطی سے آپ کے لیے مشکلات کا باعث بن گیا تھا، اب میرے دل میں آپ کی عزت اور محبت ہے، کوئی کدورت نہیں، اس لیے مہربانی فرما کر آپ بھی مجھے معاف فرما دیں، اور اپنے دل سے کدورت نکال دیں۔

(مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، از مولانا عبداللہ لغاری، مرتبہ: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ص ۷۷ و ۷۸، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار لاہور، سن اشاعت: 1998ء)

جس غیر مسلم کو رسالت کی تبلیغ نہ ہوئی ہو، جس کی وجہ سے وہ رسالت پر ایمان نہ لایا، لیکن وہ موحد ہے، تو کیا وہ نجات کا مستحق ہوگا؟ اس کے متعلق تفصیل ہم نے اپنے دوسرے مضمون ''اہلِ فترۃ و جاہلیت کا حکم'' میں بیان کر دی ہے، خود علامہ کشمیری نے بخاری کی شرح ''فیض

الباری'' میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

ممکن ہے کہ اس مسئلے میں مولانا سندھی صاحب کی بات صحیح طرح نہ سمجھی گئی ہو، یا غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو، جس کی وجہ سے علامہ کشمیری وغیرہ نے مولانا سندھی صاحب کے متعلق سخت موقف اختیار کیا ہو، بعد میں غلط فہمی دور ہونے پر اس کی معذرت کی ہو، یا پھر جو ذاتی تکلیف پہنچی ہو، اس سے معذرت کی ہو، جو کسی سے علمی و دینی اختلاف رہنے کے باوجود ممکن ہے، جس کا مزید ذکر اگلی فصل میں آتا ہے۔

حضرت مدنی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے اربابِ اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقا و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا، 1857ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریز کی پالیسی اُن کے سامنے تھی، انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا، اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے، اسی زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان اختلاف پیدا کرادیا گیا، اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علاحدہ کردیا گیا، چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلبا کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید کردیا تھا، لیکن شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا''۔ (نقشِ حیات، جلد دوم، صفحہ ۵۶۱، درذیل: نظارۃ المعارف دہلی، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مذکورہ عبارت کے حاشیے میں حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظّمہ کے

قیام کے زمانے میں پیغام بھیجا تھا کہ قیامِ دیوبند کے زمانے میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا، اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے، امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے''۔(نقشِ حیات، جلد دوم، حاشیہ صفحہ ۵۶۱، درذیل: نظارۃ المعارف دہلی، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

اور رولٹ رپورٹ کے الفاظ کے ضمن میں حاشیے کے اندر حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

''بعض مسائلِ دینیہ مختلفہ فیہا کو درمیان میں رکھا گیا، اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا، اور اسی اختلاف کی بنا پر مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کیا گیا، ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا، چنانچہ آپ نے مولانا سندھی سے معافی مانگی''۔(نقشِ حیات، جلد دوم، حاشیہ صفحہ ۶۶۱، در ذیل: رولٹ رپورٹ کے الفاظ، اشاعتِ اول، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مذکورہ عبارات وحوالہ جات سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے دارالعلوم دیوبند میں قیام کے زمانے میں چند مسائل میں مولانا سندھی صاحب سے اربابِ دیوبند کا اختلاف تھا، اگرچہ وہ اختلاف ہجرت کے بعد کے اختلافات کی طرح زیادہ شدید نہ ہو، اور مولانا سندھی صاحب کے طرزِ عمل اور سرگرمیوں کو دیوبند کے اربابِ اہتمام مدرسہ کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔

ان دونوں وجوہات کی بنا پر مولانا سندھی صاحب کو دیوبند سے علاحدہ کیا گیا، پھر کسی نے ان میں سے ایک وجہ کو زیادہ اہم سمجھا، اور کسی نے دوسری وجہ کو اہم سمجھا، لیکن دونوں وجوہات کا ہونا معتبر و موثق ذرائع سے ثابت ہے، لہٰذا اربابِ دیوبند کے مولانا سندھی صاحب سے بعض مسائل میں اختلاف ہونے کا بالکلیہ انکار کرنا راجح معلوم نہیں ہوسکا۔

البتہ علمی نوعیت کے اختلاف کی افہام و تفہیم میں کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہوگئیں، یا کردی گئی

ہوں، تو اس کا بھی امکان ہے، جس کی وجہ سے دو بلند پایہ شخصیات کی طرف سے مولانا سندھی صاحب کے متعلق سخت موقف اختیار کیا گیا، تاہم جن کو اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوئی، اور وہ بعد میں اس پر مطلع ہو گئے، انھوں نے مولانا سندھی صاحب سے معذرت وتلافی بھی کی، جو اِن معذرت کنندہ حضرات کے متدین اور صالح ہونے کی دلیل اور مقتضائے شریعت کے مطابق عمل ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بہر حال وہ حضرات تمام افکار وخیالات میں بالخصوص آخری دور کے افکار وخیالات میں مولانا سندھی صاحب سے متفق تھے۔

حضرت مدنی نے ''نقشِ حیات'' میں مذکورہ عبارات میں مولانا سندھی صاحب اور دو بلند پایہ حضرات کے مابین پیدا شدہ غلط فہمی کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی، ممکن ہے کہ اس نوعیت کی غلط فہمی ہو کہ مثلاً مولانا سندھی صاحب تبلیغِ رسالت سے قبل رسالت پر ایمان کے مکلّف نہ ہونے کے قائل ہوں، لیکن بعض حضرات نے یہ سمجھا کہ ہو کہ مولانا سندھی صاحب تبلیغِ رسالت کے بعد بھی کفار کے رسالتِ محمدیہ پر ایمان کے مکلّف نہ ہونے کے قائل ہیں، جس کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عام وتام نہ ہونا وغیرہ لازم آتا ہے، یا اس طرح کی دوسری غلط فہمی ہو۔ واللہ اعلم۔

یہ ظاہر ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے دیوبند قیام کے زمانہ میں بھی اہلِ دیوبند اور بلند پایہ شخصیات کا مولانا سندھی کی سرگرمیوں اور بعض علمی مسائل میں اختلاف تھا، جو مولانا سندھی صاحب کے دیوبند سے علاحدگی کا سبب بنا، تاہم بعض چیزوں میں اختلاف کی شدت کے سلسلے میں غلط فہمی بھی بعض حضرات کو پیدا ہوئی، جس کا احساس ہونے پر انھوں نے مولانا سندھی صاحب سے معذرت کی، جو شرعی تقاضا تھا۔

لیکن اس کو مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع وشاذ افکار سے اتفاق پر محمول کرنا درست نہیں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے وصال سے ایک سال قبل علامہ

شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے نام دیوبند سے 10 شوال 1362 ہجری بمطابق 1943 عیسوی کو جو خط لکھا، اس میں بھی مولانا سندھی صاحب کے افکار سے اختلاف فرمایا، اور اس پر گہرے دکھ کا اظہار فرمایا، یہ خط پہلی فصل میں گزر چکا ہے۔

اس کے بعد مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنی تحریر میں حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری صاحب کی معذرت کا ذکر کر کے جو یہ تحریر کیا ہے:

''اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس آنے تک مولانا سندھی کے متعلق جماعتِ دیوبند کے اکابر کس درجے پر از عظمت جذباتِ احترام وعقیدت رکھتے تھے''۔

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ جن حضرات کو جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس آنے سے پہلے مولانا سندھی صاحب کے بعض افکار وخیالات میں اختلال کا احساس ہوا، انھوں نے ضرورت پڑنے پر اسی وقت اس کا اظہار کیا، اور جن کو بعد میں محسوس ہوا، اور وہ حضرات اس وقت حیات تھے، انھوں نے ضرورت پڑنے پر اس وقت ہی اس کا اظہار کیا۔

علامہ انور شاہ کشمیری کا وصال چونکہ 28 مئی 1933 عیسوی (2 صفر 1352 ہجری) میں ہو چکا تھا، اور اس وقت تک مولانا سندھی صاحب واپس ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے، اور ان کے آخری دور کے متنازع ومتضاد افکار کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی تھی، اس لیے علامہ کشمیری کی طرف سے اس دور کے افکار پر تبصرہ نہیں ملتا، البتہ علامہ شبیر احمد عثمانی بعد تک حیات رہے، ان کی طرف سے تبصرہ ملتا ہے، جیسا کہ گزرا۔

حضرت مدنی کو مولانا سندھی صاحب کے ہندوستان واپس آنے سے پہلے حجاز میں ملاقات کے وقت اس کا احساس ہو گیا تھا، جس کا حضرت مدنی نے درج ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

''مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچے، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجّب اور تحیّر کی کوئی انتہا نہ

رہی، الخ''۔

البتہ مولانا سندھی صاحب کے افکار میں خلل کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں آرا مختلف رہیں۔

بعض حضرات کو مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے افکار میں خلل کا ہی علم نہ ہوسکا، اور نہ ہی مولانا سندھی صاحب کے آخر دور کے افکار سے متعلق ان کے سامنے کوئی تحریر آسکی، اوران کے سامنے مولانا سندھی صاحب کے پہلے دور کے حالات ہی رہے، اس لیے ان کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر نہیں ہوسکی، جیسا کہ شروع میں گزرا، لیکن بہرحال مولانا سندھی صاحب کی شخصیت اور سابقہ خدمات وقربانیوں کی بدولت ان کا شخصی احترام سب حضرات نے حسبِ موقع قائم رکھا، جو شرعاً محمود ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اس کے ساتھ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنی تحریر میں یہ بھی فرمایا:

''مولانا سندھی کا معاملہ تو یہ ہے کہ مولانا نے خود اپنے قلم سے بہت کم لکھا ہے، جو چیزیں آج ان کے نام سے شائع ہورہی ہیں، وہ زیادہ تر وہی ہیں، جو مولانا نے املا کرائی ہیں، یا جو لوگوں نے مولانا کی تقریر سن کر خود قلم بند کی ہیں۔''

نیز فرمایا:

''مولانا کے افکار نہایت بلند ہوتے تھے، مگر افسوس ہے کہ افکار جتنے بلند تھے، اس کے مطابق مولانا تحریر اور تقریر پر قدرت نہ رکھتے تھے، ان وجوہ کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ مولانا نے کہا کچھ اور ہو، اور مستملی حضرات نے اس کا کچھ اور مطلب سمجھ کر اسے اپنے الفاظ میں پیش کردیا ہو۔

بہرحال ان چیزوں کے پیشِ نظر مولانا مدنی کے لیے یہ کہنے کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا کہ مولانا سندھی کے بلند نصب العین اور ان کی بلند شخصیت کا کماحقہٗ احترام کرتے ہوئے اربابِ فہم کو چاہیے کہ ہر وہ چیز جو مولانا سے منسوب ہوکر

شائع ہو، اس کو یونہی قبول نہ کرلیں، بلکہ اس کو قرآن وحدیث اور سلفِ صالحین کے مسلکِ قویم پر پرکھنے کے بعد قبول کریں، علاوہ بریں واقعہ یہ بھی ہے کہ اب تک جو چیزیں مولانا سندھی کے نام سے شائع ہوچکی ہیں، انھیں پر بس نہیں ہے، بلکہ مولانا کی تحریروں، تقریروں اور افادات وامالی کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اور لوگوں کے پاس محفوظ ہے، جو تدریجی طور پر شائع ہوتا رہے گا''۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جس دور میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے درجِ بالا بات تحریر فرمائی تھی، اس دور میں مولانا سندھی صاحب کی تحریروں وتقریروں اور افادات وامالی کا ایک بڑا حصہ واقعتاً شائع نہیں ہوا تھا، جو کہ بعد میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا، ان میں سے متعدد مضامین کی مولانا سندھی صاحب نے نظرِ ثانی بھی کی ہے، اور ان کی تصدیق بھی کی ہے، اور متعدد املا کرنے والے حضرات خود مولانا سندھی صاحب کے معتمدِ خاص اور تربیت وصحبت یافتہ اور اصحابِ علم بھی تھے، نیز بعض متنازع افکار مولانا سندھی صاحب کی زندگی میں ان کی تصدیق سے بھی شائع ہوئے اور ان پر اسی وقت رَد بھی کیا گیا، اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر اس طرح کے تمام مضامین کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ ان سب املا کرنے والے حضرات نے ایسا غلط مطلب سمجھ کر اپنے الفاظ میں پیش کردیا ہو کہ جو سرے سے اہلِ حق کے بجائے اہلِ باطل کی فکر یا نظریہ بن جائے، اور ان میں دوٹوک ایسی باتیں بھی ہوں، جن میں املا کرنے والے حضرات کی طرف غلط فہمی کی نسبت کو درست قرار دیا جائے، اور متعدد افکارِ شاذہ وزائغہ کے متعلق صرف مولانا سندھی صاحب کو معصوم قرار دینے کی کوشش میں متعدد افراد کو ضلالت وگمراہی کی بھینٹ چڑھایا جائے، بالخصوص جب کہ مولانا سندھی صاحب کے حق میں حسنِ ظن کی تاویل ان کے عقلی طور پر معذور ہونے سے کرنے کی گنجائش بھی پائی جاتی ہو۔

لہٰذا اس بحث سے قطع نظر حضرت مدنی کے بیان ومضمون سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوتا ہے:

''مولانا سندھی کے بلند نصب العین اوران کی بلند شخصیت کا کماحقہٗ احترام کرتے ہوئے اربابِ فہم کو چاہے کہ ہر وہ چیز جو مولانا سے منسوب ہوکر شائع ہو، اس کو یونہی قبول نہ کرلیں''۔

ہم اسی موقف کے حامل ہیں، اور مولانا سندھی صاحب کا ذاتی وشخصی احترام کرتے ہوئے مولانا سندھی صاحب سے منسوب ہوکر جو افکار شائع ہوئے یا ہورہے ہیں، ان کو حضرت مدنی کی بیان کردہ کسوٹی پر پرکھ کر غلط افکار کی تردید کے قائل ہیں، خواہ وہ افکار مولانا سندھی صاحب سے باہوش وحواس صادر ہوئے ہوں، یا کسی مغلوب الحال کیفیت میں صادِر ہوئے ہوں، تردید کے لحاظ سے ان کا مسئلہ اپنی جگہ بحالہٖ باقی رہتا ہے، اور کسی کی ذاتی کیفیت سے ختم نہیں ہوتا، البتہ ذاتی کیفیت کی بنا پر مولانا سندھی صاحب کی شخصی تاویل اور اس کی ضرورت ایک الگ معاملہ ہے، جس کے متعلق پہلے واضح کیا جاچکا ہے۔

اس کے بعد مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے جو یہ فرمایا:

''اب رہی دماغ اور دل کے عدمِ توازن کی بات، تو اس پر کسی کو اچھنبا نہیں ہونا چاہیے، علامہ ابنِ حزم ظاہری، جن کے کلام میں بے انتہا شدت اور تیز بیانی پائی جاتی ہے، ان کے متعلق بھی ان کے سوانح نگاروں نے لکھ دیا ہے کہ ان کا جگر خراب تھا، اس لیے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا تھا، پس جیسا کہ مولانا مدنی فرماتے ہیں، اگر مولانا سندھی کے مزاج میں بھی پیہم آلام ومصائب کے باعث تغیّر وتبدّل پیدا ہوگیا، اوران کی سنجیدگی ومتانت تیز طبعی، اور حدتِ مزاجی سے بدل گئی، تو اس سے ان کی بلند شخصیت اور اعلیٰ کیرکٹر پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جس کا خود مولانا مدنی نے بھی اعتراف کیا ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ حضرت مدنی کے بقول مولانا سندھی صاحب کے قلب و ماغ میں عدمِ توازن پیدا ہو گیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ حضرت مدنی نے یہ بھی فرمایا ہے:

''یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا''۔

جس سے ظاہر ہے کہ مولانا سندھی صاحب کی علمی و مذہبی تقاریر اور تحریرات میں بھی دماغی انقلاب اور عدمِ توازن متجاوز ہوا، یعنی ان کی علمی و مذہبی تقاریر اور تحریرات میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر حضرت مدنی نے اپنا یہ بیان و مضمون شائع فرمایا، جس میں مولانا سندھی صاحب کے شخصی احترام کو بھی پوری طرح باقی و ملحوظ رکھا۔

پس مولانا سندھی صاحب کی علمی و مذہبی تقاریر اور تحریرات میں جو چیزیں غیر معتدل پائی جائیں، ان کی مولانا سندھی صاحب کی طرف نسبت کا انکار کرنے اور ان کو صرف املا یا نقل کرنے والوں کی طرف منسوب کرنے سے اتفاق مشکل ہے۔

ایک عرصے سے بعض طبقات مولانا سندھی صاحب کے اسی حالت میں صادر شدہ غیر معتدل افکار کی تبلیغ و تشہیر میں مصروف ہیں، جن کی تردید بہ ہر حال ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن جن شخصیات سے بھی کسی زمانہ میں غلط افکار صادر ہوئے، ہر دور میں اہلِ حق حضرات نے ان کی تردید کی، بلکہ غلط افکار کا کسی سے صدور ہی عقل و دماغ میں کسی نقص و کم زوری کا نتیجہ ہوتا ہے، ورنہ قلبِ سلیم اور دماغ صحیح ہو، تو اس سے صحیح افکار کا ہی صدور ہوتا ہے، البتہ بعض اوقات عقل کے فتور و خلل میں انسان مکلّف ہوتا ہے، اور بعض اوقات مکلّف نہیں ہوتا، یہ فی الجملہ امرِ باطن و امرِ مخفی ہے، جس کا اصل فیصلہ تو آخرت میں ہی ہوگا، تاہم بعض اوقات کوئی اس کے ظاہری آثار پر مطلع بھی ہو جاتا ہے، اور ان کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت مدنی نے ذکر فرمایا۔

لیکن شریعت کا انتظام بہ ہر حال اسی میں ہے کہ غلط افکار کی تردید کی جائے، اور کسی کی شخصی تاویل کو ثانوی درجے میں رکھا جائے، اسی کے مطابق ہر دور میں عمل ہوتا رہا۔

لیکن افسوس کہ غلط افکار وخیالات کی تردید کے بجائے بعض حضرات کا زورِ قلم مولانا سندھی صاحب کو اختیاری کے ساتھ دماغی عوارض جیسی غیر اختیاری کمزوریوں سے پاکیزہ ومقدس قرار دینے پر صرف ہو رہا ہے۔

## اختلاف کے باوجود، شخصی احترام کی وجہ

آخر میں یہ بھی عرض ہے کہ خواہ پہلے دور کا معاملہ ہو، یا آخری دور کا معاملہ، مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کرنے والے حق پرست حضرات واہلِ علم واہلِ قلم نے مولانا سندھی صاحب کے ذاتی وشخصی احترام کو ملحوظ رکھا، اور اختلاف برائے اختلاف یا اختلاف کی وجہ سے مخالفت کا طرزِ عمل اختیار نہیں فرمایا۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص، پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اور ان کا پوری طرح شخصی احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اور اذیتیں اٹھا اٹھا کر ان کا دماغ چل گیا ہے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعت میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

خاص طور پر اکابر ومشائخ کے باہمی اختلافات کی صورت میں ایک دوسرے کے احترام کے چند نمونے شروع تمہید میں ذکر کر دیے گئے ہیں۔

کسی بڑی شخصیت کا بالخصوص جب کہ وہ کسی قوم وجماعت کا سربراہ یا مقتدا بھی ہو، اس کا شخصی

احترام ملحوظ رکھنا شرعاً بھی مطلوب یا کم از کم محمود ضرور ہے، خواہ اس سے بعض امور میں ذاتی یا علمی و دینی نوعیت کا اختلاف ہی کیوں نہ ہو، اور اس سے بڑھ کر اس کے علمی و دینی اختلاف کو عنداللہ معذوری پر محمول کیا جائے، جو کہ بقول پروفیسر سرور صاحب ''دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے''۔

اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث ملاحظہ فرمایے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا . (سنن الترمذی، رقم الحديث ۱۹۱۹، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الصبيان) [1]

ترجمہ: وہ شخص ہم میں سے نہیں، جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے۔ (ترمذی)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيُجِلَّ كَبِيْرَنَا، فَلَيْسَ مِنَّا (الادب المفرد للبخاری، رقم الحديث ۳۵۶، باب فضل الكبير) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔ (الادب المفرد)

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا

---

[1] قال الترمذی:
وفی الباب عن عبد الله بن عمرو، وأبی هريرة، وابن عباس، وأبی أمامة، :هذا حديث غريب وزربی له أحاديث مناكير عن أنس بن مالک وغيره.

[2] قال الألبانی: حسن صحيح (حاشية الادب المفرد)

www.idaraghufran.org

وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا. (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۱۹۲۰، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الصبیان) [۱]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کے مرتبے کو نہ پہچانے۔ (ترمذی)

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی سند سے ہی روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا. (مسند احمد، رقم الحدیث ۶۷۳۳) [۲]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑے کا حق نہ جانے۔ (مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا، فَلَيْسَ مِنَّا. (الادب المفرد للبخاری، رقم الحدیث ۳۵۳، باب فضل الکبیر) [۳]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کا حق نہ جانے، وہ ہم میں سے نہیں۔ (الادب المفرد)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَيْسَ مِنْ أُمَّتِي مَنْ لَّمْ يُجِلَّ

---

[۱] قال الترمذی:
حدثنا هناد قال: حدثنا عبدة، عن محمد بن إسحاق، نحوه، إلا أنه قال: ويعرف حق كبيرنا.

[۲] قال شعيب الارنؤوط:
حديث صحيح (حاشية مسند احمد)

[۳] قال الألبانی: صحيح (حاشية الادب المفرد)

www.idaraghufran.org

كَبِيْرَنَا، وَيَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيَعْرِفْ لِعَالِمِنَا . (مسند احمد، رقم الحديث ۲۲۷۵۵) [۱]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص میری امت میں سے نہیں، جو ہم ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے عالموں کو نہ پہچانے۔ (مسند احمد)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يُوَقِّرِ الْكَبِيْرَ، وَيَرْحَمِ الصَّغِيْرَ وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ، وَيَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ .(مسند احمد، رقم الحديث ۲۳۲۹) [۲]

ترجمہ: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو بڑے کی عزت نہ کرے، اور چھوٹے پر رحم نہ کرے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے۔ (مسند احمد)

مذکورہ روایت کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اس کی عزت یا رحم کرنے کے خلاف نہیں۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أَتَاكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ، فَأَكْرِمُوْهُ . (سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث ۳۷۱۲، ابواب الادب، باب إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه) [۳]

---

[۱] قال شعيب الارنؤوط:
صحيح لغيره، دون قوله: " ويعرف لعالمنا"، وإسناد هذا الحديث رجاله ثقات إلا أن أبا قبيل –وهو حيى بن هانىء بن ناضر– لم يسمع من عبادة.(حاشية مسند احمد)

[۲] قال شعيب الارنؤوط:
صحيح لغيره، وهذا إسناد ضعيف لضعف ليث بن أبى سليم (حاشية مسند احمد)

[۳] قال شعيب الارنؤوط:
حديث حسن وهذا إسناد ضعيف لضعف سعيد بن مسلمة.....وأصح شىء فى الباب

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمھارے پاس کسی قوم کا کوئی معزز شخص آئے، تو تم اس کا اکرام کرو۔ (ابنِ ماجہ)

حضرت شعبی سے مرسلاً روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أَتَاكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَأَكْرِمُوْهُ

(المراسیل، لابی داود، رقم الحدیث ۵۱۱، باب الادب)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی معزز شخص آئے، تو تم اس کا اکرام کرو۔ (مراسیل ابوداود)

لہٰذا مولانا سندھی صاحب کے اوصاف وکمالات اوران کے اکرام کا جن حضرات کی طرف سے ثبوت پایا جاتا ہے، ان کا مولانا سندھی صاحب کے جملہ افکار سے اتفاق ہونا لازم نہیں آتا۔

کیونکہ احادیث اور روایات سے معلوم ہو چکا کہ کسی بزرگ اور بڑی شخصیت سے اختلاف اس کے اکرام واحترام کے منافی نہیں۔ [1]

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

ما روی عن الشعبی مرسلًا عند أبی داود فی "المراسیل" (511)، ورجاله ثقات.
وقال الحافظ السخاوی فی "المقاصد الحسنة "ص 34بعد أن ذکر طرقه وأعلها: وبهذه الطرق یقوی الحدیث، وإن کانت مفرداتها کما أشرنا إلیه ضعیفة، ولذا انتقد شیخنا وشیخه رحمهما الله الحکم علیه بالوضع. (حاشیة مسند احمد)

[1] (لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویوقر کبیرنا) الواو بمعنی أو فالتحذیر من کل منهما وحده فیتعین أن یعامل کلا منهما بما یلیق به فیعطی الصغیر حقه من الرفق به والرحمة والشفقة علیه ویعطی الکبیر حقه من الشرف والتوقیر قال الحافظ العراقی: فیه التوسعة للقادم علی أهل المجلس إذا أمکن توسعهم له سیما إن کان ممن أمر بإکرامه من الشیوخ شیبا أو علما أو کونه کبیر قوم کما فی حدیث جریر المار إذا أتاکم کریم قوم فأکرموه. (فیض القدیر للمناوی، تحت رقم الحدیث ۷۶۹۱)

(لیس منا) أی لیس مثلنا (من لم یرحم صغیرنا) لعجزه وبرائته عن قبائح الأعمال وقد یکون صغیرا فی المعنی مع تقدم سنه لجهله وغباوته وخرقه وغفلته فیرحم بالتعلیم والإرشاد والشفقة (ویوقر

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

اور جو ایسا سمجھتا ہے، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے، جس کی وجہ سے کئی قسم کی ''بناءُ الفاسد علی الفاسد'' لازم آ رہی ہیں۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی أَعْلَمُ . وَعِلْمُہٗ أَصْوَبُ.

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

كبيرنا) لما خص به من السبق فى الوجود وتجربة الأمور (ويأمر بالمعروف وينهى عن المنكر) بحسب وسعه بيده أو بلسانه أو بقلبه بشروطه المعروفة قال تعالى }أنجينا الذين ينهون عن السوء{ فجعل النجاة للناهين والهلكة للتاركين.(فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ٧٦٩٣)

ليس منا من لم يرحم صغيرنا، ويوقر كبيرنا، ويأمر بالمعروف وينه عن المنكر .(حم ت) عن ابن عباس (ح) ."(ليس منا من لم يرحم صغيرنا، ويوقر كبيرنا ويأمر بالمعروف وينهى عن المنكر) قرن هذين بذينك مشعر بوجوبهما كإيجاب الأخيرين وإن كانت دلالة الاقتران فيها مقال إلا أنه لا كلام فى تأكده.(التنوير شرح الجامع الصغير للصنعانى، تحت رقم الحديث ٧٦٧٤)

من لم يرحم صغيرنا ويعرف حق كبيرنا فليس منا.(خد د) عن ابن عمرو (صح).

(من لم يرحم صغيرنا) أهل الإسلام أو أهل البيت والأول أوضح (ويعرف حق كبيرنا) سنا وعلما ورئاسة (فليس منا) إذ خلق أهل الإسلام رحمة الصغير ومعرفة الحق الكبير.(التنوير شرح الجامع الصغير للصنعانى، تحت رقم الحديث ٩٠٠٧)

(إذا أتاكم كريم قوم) أى رئيسهم المطاع فيهم المعهود منهم بإكثار الإعظام وإكثار الاحترام (فأكرموه) برفع مجلسه واجزال عطيته ونحو ذلك مما يليق به لأن الله تعالى عوده منه ذلك ابتلاء منه له فمن استعمل معه غيره فقد استهان به وجفاه وأفسد عليه دينه فإن ذلك يورث فى قلبه الغل والحقد والبغضاء والعداوة وذاك يجر إلى سفك الدماء وفى إكرامه إتقاء شره وإبقاء دينه فإنه قد تعزز بدنياه وتكبر وتاه وعظم فى نفسه فإذا حقرته فقد أهلكته من حيث الدين والدنيا وبه عرف أنه ليس المراد بكريم القوم عالمهم أو صالحهم كما وهم البعض ألا ترى أنه لم ينسبه فى الحديث إلى علم ولا إلى دين؟ ومن هذا السياق انكشف أن استثناء الكافر والفاسق كما وقع لبعضهم منشؤه الغفلة عما تقرر من أن الاكرام منوط بخوف محذور دينى أو دنيوى أو لحوق ضرر للفاعل أو للمفعول معه فمتى خيف شىء من ذلك شرع إكرامه بل قد يجب فمن قدم عليه بعض الولاة الظلمة الفسقة فأقصى مجلسه وعامله معاملة الرعية فقد عرض نفسه وماله للبلاء فإن أوذى ولم يصبر فقد خسر الدنيا والآخرة وقد قيل :دارهم ما دمت فى دارهم . . .وحيهم ما دمت فى حيهم.(فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ٣٤٥)

www.idaraghufran.org

## (فصل نمبر 4)

# حضرت لاہوری کے اختلاف سے متعلق الزام

فاضل ناقد اپنے مضمون ''جماعتِ دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سندھی اپنے داماد، شاگرد اور سوتیلے بیٹے حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے نام مکتوب میں فرماتے ہیں:" میں مسلمان ہوں اور شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کا متبع۔ غلطی جب سمجھ میں آجائے، اس سے رجوع کرسکتا ہوں۔ (مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی، ص :۱۴)

مندرجہ بالا حوالہ جس مکتوب کے جوابی مکتوب میں ہے، اسے ہمارے راولپنڈی والے مفتی صاحب نے بھی دیکھا ہوگا؟ اس لیے کہ موصوف نے وہ مکتوب جس کا یہ جواب ہے اپنی مطلب برآری کے لیے اپنی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ" میں نقل کیا ہے اور یہ مکتوب انھوں نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی تالیف "مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی " سے اخذ کیا ہے، تو اس کے جواب میں مولانا کے یہ کلمے ان کی نگاہ سے گزرے ضرور ہوں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو مفتی صاحب اپنے فتوے سے اس پر فقہی انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں کہ مدعی یہ کہتا ہے تو کیا وہ مسلمان ہے یا اب بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے؟ دیوبندی دیوبندیت سے خارج ہے؟''

اس موقع پر پہلی بات یہ تو سمجھ لینا چاہیے کہ فاضل ناقد نے مولانا سندھی صاحب کے مکتوب کے جو الفاظ نقل کر کے ہمیں دیکھنے کی تلقین فرمائی ہے، وہ الفاظ ہماری کتاب میں شامل ہیں، دوسرے فاضل ناقد نے اس بات کی طرف اپنی توجہ منعطف نہیں فرمائی کہ ہم نے مولانا احمد علی لاہوری کا مکتوب اپنی کتاب میں کس لیے نقل کیا ہے، اگر اس کی سرخی پر ہی بہ نظرِ انصاف

غور کرلیا جائے، تو اس طرح کا اعتراض کرنے کی نوبت نہ آئے۔ ع

شخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجا است

ہم نے اس مکتوب کی سرخی درجِ ذیل الفاظ میں قائم کی ہے:

''مولانا لاہوری کے نام مولانا سندھی کا مکتوب۔''

پھر اس مکتوب کے شروع میں ہم نے درجِ ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں:

''ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے اپنی کتاب ''مکاتیبِ مولانا عبیداللہ سندھی'' میں مولانا سندھی کا مولانا احمد علی لاہوری کے نام ایک مکتوب بھی شامل کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں وہ مکتوب پیش کیا جارہا ہے، جس سے ان اختلافات کی وضاحت ہوتی ہے، جو مولانا لاہوری کو مولانا سندھی سے تھے''۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص۱۰۵، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

اس کے بعد ہم نے وہ مکمل مکتوب نقل کیا ہے، اور اس میں جو مولانا سندھی صاحب کے الفاظ ہیں، ان کو بھی نقل کیا ہے۔

اس بات میں کوئی ابہام نہیں کہ ہم نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کی کتاب ''مکاتیبِ مولانا عبیداللہ سندھی'' کے حوالے سے مولانا لاہوری کے مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کی وجہ کا ذکر کیا ہے، اور اس کے بعد ''مولانا لاہوری کے نام مولانا سندھی کا مکتوب''، نقل کیا ہے، اور اس میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی زائد بات داخل نہیں کی۔

## مولانا لاہوری کے اختلاف سے متعلق مولانا سندھی کا مکتوب

اگر پھر بھی کوئی ابہام محسوس ہو، تو ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کی کتاب کی پوری عبارت تسلسل کے ساتھ ملاحظہ فرمالینی چاہیے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا احمد علی لاہوری کی تعلیم وتربیت میں حضرت امام سندھی نے خاص توجہ فرمائی تھی۔ دارُالرشاد (پیر جھنڈا) جمعیتُ الانصار دیوبند، نظارۃُ المعارف القرآنیہ، دہلی میں انھیں اپنے ساتھ رکھا، اپنی بیٹی کو ان کے حبالۂ عقد میں دے کر اپنے دل وجان کا حصہ بنالیا، نظارۃُ المعارف، دہلی میں انھیں مدرس بنایا اور جب حضرت امام سندھی کابل روانہ ہوئے تو انھیں کو نظارۃ کا ناظم بنایا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں قرآنِ حکیم کی انقلابی روح سے آشنا کیا۔ درس واشاعتِ کتاب وحکمت کے پروگرام کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اسی ذوق و انہماک کی بدولت تمام دیوبندی مکتبہ فکر میں انھیں شیخ التفسیر کے معزز لقب سے ملقب کیا گیا۔

لیکن بہ قول حضرت سندھی ان کے بیرون ملک جانے کے بعد وہ رجعت پسندوں میں پھنس کر قرآن حکیم کی انقلابی فکر سے دور ہوگئے۔ مولانا لاہوری کو اپنے استاد و مربی سے شکایت پیدا ہوگئی کہ انھوں نے گویا حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی اتباع سے روگردانی کی اور بعض مسائل میں اپنی تحقیق کی راہ الگ نکالی۔ یہ مولانا لاہوری کے نزدیک ان کا ناقابلِ معافی گناہ تھا، انھوں نے ایک خط میں حضرت سندھی پر سات اعتراض کیے۔ میرے سامنے مولانا لاہوری کے ترجمہ قرآن پر حضرت سندھی کی ایک شدید تنقید ہے۔ مولانا لاہوری نے حضرت سندھی سے علاحدگی کا اعلان فرمادیا اور حضرت سندھی نے انھیں اپنے ساتھ رشتہ انسلاک سے آزاد کردیا۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں حضرت سندھی اپنے بعض بزرگوں اور دوستوں کے ستم کا نشانہ بنے تھے، اب آخری عمر میں اپنے عزیز وشاگرد کی سادگی کے قتیل ہوئے۔ مولانا لاہوری کا خط محفوظ نہیں، حضرت سندھی کا جواب بہ توسط

ثناء اللہ سومرو، مولانا عبدالمجید امجد سندھی کے شکریے کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔(ا۔س۔ش)

**''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!**

سلام مسنون!

آپ کا رجسٹری شدہ خط ملا کہ آپ کو میرے ''مذہبی خیالات'' میں تبدیلی کا علم ہو چکا ہے۔ اس لیے آپ مجھ سے وہ تعلق جو پہلے تھا، نہیں رکھ سکتے۔ کیوں کہ ''ضروریاتِ دین'' کا انکار برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے میں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک متبع شاگرد تھا، اب مولانا شیخ الہند کے مسلک کا مخالف ہوں، اس لیے مجھ سے وہ تعلق کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ [1]

کاش! یہ امور تم کبھی علاحدگی میں ذکر کر کے پہلے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ میں نے جس قدر تبدیلی کی ہے، وہ شیخ الہند کے ساتھ اصولی نہیں۔ شیخ الہند مولانا محمد قاسم وحضرتُ الامام ولی اللہ کے متبع ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی کتابیں سمجھنے پڑھنے کا شوق اتباعِ شیخُ الہند سے مرتفع ہو چکا ہے ''کفار قبل از تبلیغِ تام اصحابُ الاعراف میں شمار ہوتے ہیں'' حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور تھا۔ میں نے محمد علی شاہ کو بتلایا۔ اس کا مولانا انور شاہ سے بھی ذکر کیا تھا۔ انھوں نے جھٹ منکر ضروریاتِ دین قرار دے کر مجھ پر کفر کا فتویٰ لکھا۔ جسے مولانا شیخ الہند کے زور سے وہ شائع نہیں کر سکے۔ اب

---

[1] اس عبارت اور خود مولانا سندھی صاحب کی طرف سے بیان کردہ تصریح سے ظاہر ہے کہ مولانا لاہوری کو مولانا سندھی صاحب کے مذہبی خیالات میں تبدیلی کا علم ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے مولانا سندھی صاحب سے وہ تعلق قائم و باقی رکھنے سے عذر پیش کیا، جو پہلے تھا، اس اختلاف کی شدت کا اندازہ ''ضروریاتِ دین کا انکار برداشت نہیں کیا جا سکتا'' کے الفاظ سے ہو سکتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مولانا لاہوری کی نظر میں مولانا سندھی صاحب، پہلے شیخ الہند کے متبع تھے، بعد میں ان کے مسلک کے مخالف ہو گئے تھے، اپنے مکتوب میں بھی مولانا لاہوری نے اسی قسم کے الفاظ لکھے ہیں، یہ مکتوب دوسرے مقام پر ذکر کر دیا گیا ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

''البدور البازغۃ'' میں وہی مسئلہ نہایت صراحت سے موجود ہے۔ [1]

[1] ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی نہ تو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں وہ موقف دستیاب ہوسکا، جس کا مولانا سندھی صاحب نے اوپر ذکر کیا ہے، اور نہ ہی ''البدورُ البازغۃ'' میں یہ موقف دستیاب ہوسکا، بلکہ اس کے برخلاف موقف دستیاب ہوا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ ''حجۃُ اللہ البالغۃ'' میں فرماتے ہیں:

**قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم " :والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی أحد من ھذہ الأمۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی أرسلت بہ إلا کان من أصحاب النار.**

**أقول :یعنی من بلغتہ الدعوۃ، ثم أصر علی الکفر حتی مات دخل النار، لأنہ ناقض تدبیر اللہ تعالی لعبادہ، ومکن من نفسہ لعنۃ اللہ والملائکۃ المقربین، وأخطأ الطریق الکاسب للنجاۃ(حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۱، ص ۲۸۰، القسم الثانی، فی بیان أسرار ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفصیلا)**

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اس امت کا جو شخص بھی، خواہ یہودی ہو یا نصرانی، جو مجھے سن لے گا، اور پھر وہ اس حال میں فوت ہوجائے گا کہ وہ اس چیز پر ایمان نہیں لائے گا، جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے، تو وہ صرف اور صرف اہلِ جہنم میں سے ہی ہوگا۔

میں کہتا ہوں، یعنی جس کو (نبی کی) دعوت پہنچ گئی، پھر اس نے کفر پر اصرار کیا، اور اسی حال میں فوت ہوگیا، تو وہ جہنم میں داخل ہوگا، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے مقرر کردہ تدبیر ونظام کا مقابلہ کیا، اور اپنی طرف سے اللہ، اور مقرب فرشتوں کی لعنت کو اختیار کیا، اور نجات دلانے والے راستے سے ہٹ گیا (حجۃُ اللہ البالغۃ)

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ اس کے بھی قائل ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سب اطراف واکنافِ عالم میں پھیل چکی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ ''البدور البازغۃ'' میں فرماتے ہیں:

رسالتِ مآب کی دعوتِ رسالت، سب اطراف واکنافِ عالم میں پھیل گئی (البدور البازغۃ، صفحہ ۳۷۴، تیسرا مقالہ، تیسری فصل، اردو ترجمہ: ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن، مطبوعہ: ادارہ مطبوعات، لاہور، سنِ اشاعت: 2000 عیسوی)

یہ تو بہت بعد کی بات ہے، جبکہ فقہائے کرام نے اس سے صدیوں پہلے اس کا حکم لگا دیا تھا، اور ''بعثۃُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کی دعوت سے محروم رہنے والوں کو ''نادر'' قرار دیا تھا، بعد میں اسلام کی دعوت مزید پھیل گئی، اور آج کے دور میں جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے کونے کونے تک اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

**ولا أعلم أحدا لم تبلغہ الدعوۃ الیوم إلا أن یکون من وراء عدونا الذین یقاتلونا أمۃ من المشرکین فلعل أولئک أن لا تکون الدعوۃ بلغتھم وذلک مثل أن یکونوا خلف الروم أو الترک أو الخزر أمۃ لا نعرفھم(الأم، للشافعی، ج ۴، ص ۲۵۳، کتاب الحکم فی قتال المشرکین ومسألۃ مال الحربی)**

**قال أحمد إن الدعوۃ قد بلغت وانتشرت، ولکن إن جاز أن یکون قوم خلف الروم وخلف الترک، علی ھذہ الصفۃ، لم یجز قتالھم قبل الدعوۃ(المغنی لابن قدامۃ، ج ۹، ص ۲۱۰، کتاب الجھاد، مسألۃ یقاتل أھل الکتاب والمجوس ولا یدعون إلی الإسلام)** ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

کاش! مجھ سے یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ ان تفردات میں میرا مسند امام ولی اللہ اوران کے اتباع کی کون سی چیز ہے؟ اور میرا تفرد اپنی ذاتی رائے سے کیا ہے؟ تو مسئلے کی مشکلات حل ہو جاتیں، مگر یہاں تو حجۃ اللہ علی العالمین امام ولی اللہ (یہ شیخ الہند کے الفاظ ہیں) کا الہام، امام اور تحقیق کسی شمار میں نہیں۔ میں ان لوگوں سے جو امام ولی اللہ کو امام نہیں مان سکتے، افکار و نہج میں توافق ضروری نہیں سمجھتا۔

آپ نے سات مسئلے لکھے ہیں، میں ان کی تشریحات لکھنا نہیں چاہتا۔ کل یہ سات ستّر بن جائیں گے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ قرآن وحدیث وسلف صالحین کے مسلک کی تعیین میں امام ہیں یا نہیں؟ اگر انھیں امام مان لیا جائے تو ان کے کسی مخالف کا قول ماننا ضروری نہیں رہے گا۔ بحث مختصر ہو جائے گی کہ یہ مسائل شاہ ولی اللہ صاحب کے ہاں کہاں اور کس عبارت میں لکھے گئے ہیں اور میں ان کی تشریح کس حجت سے پیش کرتا ہوں؟

مثلاً ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری'' یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ولی اللہ موطأ کو بعد کتاب اللہ اول درجے کی کتاب مانتے ہیں۔ اس کے بعد صحیح البخاری میں غلط روایات ملیں تو قابلِ اعتراض نہیں وہ غلط روایتیں

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ إنما لا يجوز أن يقاتل من لم تبلغه الدعوة فى ابتداء الإسلام أما فى زماننا فلا حاجة إلى الدعوة لأن الإسلام قد فاض واشتهر فما من زمان أو مكان إلا وقد بلغه بعثة النبى -صلى الله عليه وسلم -ودعاؤه إلى الإسلام(الجوهرة النيرة، ج۲، ص۲۵۸، كتاب السير)

قالوا :كان هذا فى ابتداء الإسلام حين لم ينتشر الإسلام ولم يستفض وأما بعد ما استفاض وعرف كل مشترك إلى ماذا يدعى يحل القتال قبلها ويقام ظهورها مقامها، كذا فى المحيط قال الشارح: وهذا صحيح ظاهر(النهر الفائق شرح كنز الدقائق، ج۳، ص۲۰۳، كتاب الجهاد)

اس مسئلہ کی تفصیل ہم نے اپنے دوسرے مضمون ''اہلِ فترۃ وجاہلیت کا حکم'' میں بیان کردی ہے، جس میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا موقف بھی بیان کردیا گیا ہے، جو کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے موقف کے مطابق ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

محققین اہلُ السنۃ کی تصریح سے مانی جائیں گی، یہ مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں بجسدہٖ السموات پر پہنچے۔اس کی تشریح امام ولی اللہ نے جو حجۃُ اللہ البالغہ میں لکھی اور دوسری کتابوں میں اسے محقق بنایا۔ جمہور اہلِ علم شاید اسے تسلیم نہیں کریں گے، مگر میں اپنا ایمان اس سے مضبوط کرتا ہوں۔ [1]

تمھیں شاہ ولی اللہ کے سمجھنے اور ماننے کا یہ درجہ تو نہ ہم نے پڑھایا اور نہ اس کا کوئی موقعہ ہمیں پہلے زمانے میں ملا۔

شاہ ولی اللہ کی کتابیں مکہ معظّمہ میں جمع کر کے کس قدر میرا تو شغل ان کے مطالعے میں رہا ہے، یہ تو غالباً آپ اور آپ کے ساتھی بھی مانتے ہوں گے۔اب مجھ سے سمجھے بغیر جو مجھ پر تمھارے دوست فیصلہ بناتے ہیں وہ میرے نزدیک کہاں تک قابلِ توجہ ہو سکتے ہیں؟

میں ان فیصلوں کا بانی تمھیں نہیں مانتا۔ممکن تھا کہ تم دو چار مہینے شاہ صاحب کی کتابوں میں سے منتخب مقامات کا مطالعہ کرتے تو سمجھ جاتے۔مگر تمھیں اس کا موقع نہیں ملا، اور مولانا انور شاہ وغیرہ غیر محققین کی صحبت میں اب تم ہمارے بفضلہٖ تعالیٰ استاد بن گئے ہو۔تمھیں مبارک ہو!

میں مسلمان ہوں اور شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کا متبع۔غلطی جب سمجھ میں آجائے تو اس سے رجوع کر سکتا ہوں۔مگر ان غیر محققین علماء سے میرا کوئی اور

---

[1] وأسرى به إلى المسجد الأقصى، ثم إلى سدرة المنتهى، وإلى ما شاء الله، وكل ذلك لجسده صلى الله عليه وسلم في اليقظة ولكن ذلك في موطن هو برزخ بين المثال والشهادة جامع لأحكامهما فظهر على الجسد أحكام الروح وتمثل الروح والمعاني الروحية أجسادا، ولذلك بان لكل واقعة من تلك الوقائع تعبير، وقد ظهر لحزقيل .وموسى .وغيرهما عليهما السلام نحو من تلك الوقائع وكذلك لأولياء الأمة ليكون علو درجاتهم عند الله كحالهم في الرؤيا والله أعلم(حجة الله البالغة، ج ٢، ص ٣٢٠، سير النبي صلى الله عليه وسلم)

www.idaraghufran.org

ارتباط قائم نہیں ہوسکتا۔

میں نے تمھاری تصدیق کی کہ تم ابتدائی تعلیم ایک حد تک جاری کرنے میں کامیاب ہوئے، مگر تحقیق پسند لوگوں کو آگے چلایا جائے گا۔ تم آگے چلانے کے منکر یا دشمن معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے ان پچھلے چھ مہینے میں تمھارے معاملات میں تعمق کرنا پڑا۔ ممکن ہے ہماری بعض رائیں غلط ہوں، مگر حیرانی ہوتی ہے کہ مولوی احمد علی مجھے اہلُ السنۃ سے نکالتا ہے، مجھ سے آ کے علم سیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ [1]

میں اب آپ کے معاملے میں ایک طرح یک سو ہو چکا ہوں۔ اگر میری بات سمجھنا نہیں چاہتے تو ناحق پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔

کیا تفہیماتِ الٰہیہ، بدورِ بازغہ، تاویلُ الاحادیث یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ انھیں نہ پڑھایا جائے؟ اور جو لوگ یورپ کی مادیت سے متاثر ہو چکے ہیں، انھیں ان کتابوں سے متعارف نہ کرایا جائے، بلکہ انھیں اسلام سے خارج کرنے کی کوششیں ہم کرتے پھریں؟ یہ مسلک، اگر کبھی پہلے ہم اس پر چلے ہیں تو اب قطعاً چھوڑ چکے ہیں۔ واللہ المستعان

عبید اللہ

(مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی صفحہ ۳۹ تا ۴۱، حصہ اول، مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی، مختلف حضرات کے نام، مطبوعہ: مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی، کراچی، پاکستان، اشاعتِ اول ۱۹۹۷ء)

---

[1] مولانا احمد علی لاہوری کے مولانا سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص ہونے میں تو شبہ نہیں، لیکن اس کے باوجود مولانا سندھی صاحب، خود فرما رہے ہیں:

"مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ مولوی احمد علی، مجھے اہل السنۃ سے نکالتا ہے"۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا لاہوری کو مولانا سندھی صاحب کے چند ایسے افکار و خیالات سے اختلاف تھا، جو ان کی نظر میں اہلُ السنۃ والجماعۃ کے نہیں تھے، مولانا لاہوری کا یہ اختلاف ظاہر ہے کہ حضرت مدنی کی بیان کردہ حدیث کی روشنی میں تھا، اور اصل بحث اس قسم کے افکار و خیالات سے ہی ہے، جو اہلُ السنۃ کے نہیں۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اصل مقصود یہ ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری کو مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متعدد افکار سے اختلاف تھا یا نہیں؟ ہمارا جواب اثبات میں ہے، اور خود مولانا سندھی صاحب کا یہ مکتوب جس کے چند جملے نقل کر کے موصوف معلوم نہیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس پر شاہدِ عدل ہے۔

## مولانا سندھی سے اختلاف کے متعلق مولانا لاہوری کا مکتوب

اس کے علاوہ ہم نے اپنی کتاب کے صفحہ 101 پر درج ذیل سرخی قائم کی ہے۔

''مولانا احمد علی لاہوری کا مولانا سندھی سے اختلاف کے متعلق مکتوب''۔

اور اس کے بعد درج ذیل عبارت تحریر کی ہے۔

''مولانا احمد علی لاہوری نے، مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک ذاتی مکتوب میں مولانا عبید اللہ سندھی کے بعد از ہجرت کے خیالات سے اپنے متفق نہ ہونے کا اظہار کیا ہے۔ یہ خط ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کے شمارہ نمبر ۱، جلد ۹۵، میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں مولانا احمد علی لاہوری نے مولانا سید سلیمان ندوی کو متعدد امور تحریر کیے ہیں، جن میں مولانا سندھی کے ان خیالات سے اختلاف بھی شامل ہے، جن کا اظہار مولانا سندھی نے بعد از ہجرت کیا۔ ذیل کی سطور میں خط کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے، جس کا تعلق مولانا سندھی کے افکار سے ہے''۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۰۱، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

پھر ہم نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۲ پر ''ماہنامہ معارفِ اعظم گڑھ'' کے حوالے سے مولانا احمد علی لاہوری کا جو مکتوب نقل کیا ہے، اور وہ مکتوب مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد اور مولانا سندھی صاحب کا مذکورہ جواب ملاحظہ کرنے کے بعد کا ہے، اس میں مولانا احمد علی

لاہوری کی درج ذیل تصریح بھی صاف طور پر مذکور ہے۔

''یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی، اور مسلکِ اسلاف سے نکلنا جرمِ عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انھیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں۔ بعد از ہجرت جو اُن کے خیالات میں مذہباً یا سیاستاً تبدیلی آ گئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لیے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے''.....فقط

احقر الانام احمد علی عفی عنہ

۲۳ جون ۱۹۴۶ء

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، جنوری 1965 عیسوی، رمضان المبارک 1384 ہجری، صفحہ ۶۸، ۶۹، جلد نمبر 95، بعنوان ''مکتوب مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندوی'' درذیل ''آثارِ علمیہ وادبیہ'')

حضرت لاہوری نے اپنے درج بالا مکتوب میں واضح طور پر فرمادیا ہے کہ مولانا سندھی کے قبل از ہجرت کے خیالات خالص کتاب وسنت اور مسلکِ اسلاف کے مطابق تھے، جس سے نکلنے کو مولانا سندھی جرمِ عظیم سمجھتے تھے۔

وہ صرف ان خیالات وافکار سے متاثر ومستفید ہیں، ہجرت کے بعد جن خیالات وافکار میں مذہبی اور سیاسی اعتبار سے تبدیلی آئی، ان سے ہرگز متفق نہیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ مولانا لاہوری جس طرح مولانا سندھی کے سیاسی افکار وخیالات میں تبدیلی کے قائل ہیں، اسی طرح مذہبی افکار وخیالات میں بھی تبدیلی کے قائل ہیں، اور وہ تبدیلی ان کی نظر میں کتاب وسنت اور مسلکِ اسلاف سے نکلنے کی ہے، جس کے لیے ہم خیال بنانے پر مولانا سندھی صاحب نے اصرار کیا، اور وہ تادمِ حیات مولانا لاہوری سے ناراض رہے، اور بہت کچھ بُرا بھلا کہتے رہے۔

www.idaraghufran.org

اب بھی اگر کوئی مولانا لاہوری کے اس اختلاف کو دوسرا رنگ دے، تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟

حضرت لاہوری، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے براہِ راست شاگرد اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھے۔

مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب زید مجدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت سندھی کے تمام تلامذہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد شخصیت شیخ التفسیر حضرت لاہوری کی ہے، جو واقعتاً حضرت سندھی کے حقیقی جانشین تھے، جنھوں نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک حضرت سندھی کی صحبت وتربیت میں رہ کر ان سے علمی وفکری فیض پایا۔ یہی وجہ ہے کہ سفرِ کابل کے موقع پر حضرت سندھی نے اپنی جگہ حضرت لاہوری کو ہی اپنا جانشین مقرر کیا تھا''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی، ص ۸۰، مؤلفہ مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر، فصل دوم، مطبوعہ: حق چار یار اکیڈمی، مدرسہ حیاتُ النبی، گجرات، طبع اول: محرم 1425ھ، مارچ 2004ء)

لیکن ان سب نسبتوں کے باوجود مولانا لاہوری نے مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے خالص کتاب وسنت اور مسلکِ اسلاف کے بالمقابل، مذہبی اور سیاسی افکار وخیالات سے اختلاف کیا، اور ان کا یہ اختلاف مولانا سندھی صاحب کے اس مکتوب کو ملاحظہ کرنے کے بعد بھی قائم رہا، جس میں مولانا سندھی صاحب نے وہ الفاظ تحریر فرمائے، جن کا فاضل ناقد نے ذکر کیا ہے، اور ہمیں ملاحظہ کرنے کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ ہماری کتاب میں پہلے سے یہ الفاظ موجود ہیں۔

ان الفاظ کو ملاحظہ کرنے کے بعد ہمارا اس سلسلے میں موقف وہی ہے، جو مولانا لاہوری نے ملاحظہ کرنے کے بعد اختیار کیا، کیونکہ اس کے اصل مخاطب مولانا لاہوری ہی تھے۔

اس اصل مقصود سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا محض خلطِ مبحث ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متنازع افکار سے مولانا احمد علی لاہوری کا اختلاف

www.idaraghufran.org

کرنے کا ثبوت متعدد ذرائع سے پایا جاتا ہے، جس کو مولانا سندھی صاحب اور مولانا لاہوری صاحب کے علاوہ خود مولانا سندھی صاحب کے دیگر مخصوص تلامذہ ورفقا نے بھی تسلیم کیا ہے۔

## مولانا دین محمد وفائی کا مشاہدہ اور تصریح

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے شاگرد مولانا دین محمد وفائی صاحب، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے آخری چار مہینوں کے حالات کے ضمن میں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دارالرّشاد میں حضرت امام (مولانا عبیداللہ سندھی صاحب) کے ایک شاگرد مولوی بشیر احمد صاحب بی اے لدھیانوی قیام پذیر تھے، حضرت امام نے ان سے سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر سنی، جو کہ وہ کتابی صورت میں ''کتاب الانقلاب'' کے نام سے مرتب کر کے لائے تھے، مولوی بشیر احمد نے حضرت امام کی خدمت میں پیش کی، اور تصحیح کروائی، اس وقت تک شاید یہ کتاب لاہور میں چھپ کر شائع بھی ہوگئی ہو ''ماہنامہ ''توحید'' کراچی، نومبر، دسمبر 1944 عیسوی''۔

(مولانا عبیداللہ سندھی: افکار وخدمات، مضامین: مولانا دین محمد وفائی، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان سندھی وشاہد حسین خان، صفحہ ۶۴، درذیل ''مولانا عبیداللہ سندھی کی زندگی کے آخری چار مہینے'' اشاعت: مئی 1995 عیسوی، الحمود اکیڈمی، اردو بازار، لاہور)

مولانا سندھی صاحب نے، مولانا بشیر احمد صاحب کی مذکورہ کتاب پر جو تاثرات تحریر فرمائے، ان میں مذکورہ افکار کی ذمہ داری بھی مولانا سندھی صاحب نے قبول فرمائی ہے۔ [1]

---

[1] چنانچہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے ایک تفسیری مجموعے کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:
ہم 1939ء میں واپس وطن پہنچے، اس کے بعد جب کبھی لاہور آئے، اور اپنے عزیزوں کی خاطر وہاں رہے۔ مولوی بشیر احمد صاحب بی۔اے لدھیانوی ہم سے قرآن شریف سمجھنے کے لیے مسلسل ملتے رہے۔ وہ ہمارے افکار لکھتے بھی رہتے تھے، اس طرح انھوں نے کئی سو صفحات تیار کر لیے۔ انھوں نے قرآن عظیم کا مطالعہ بہت عرصے پہلے سے مختلف اساتذہ کی صحبت میں جاری رکھا تھا، اس لیے وہ ہمارے طرزِ تفکر کا انقلابی

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

## چند صفحات کے بعد مولانا دین محمد وفائی صاحب لکھتے ہیں:

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

نقطہ تدریجاً سمجھنے کے قابل ہوگئے۔ اب ان کی خواہش ہے کہ ہمارا فکر لوگوں کو پڑھائیں، یا پریس کے ذریعے سے پھیلائیں۔

ہمیں سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ کے متعلق علمی مرکز میں جس کا نام ''محمد قاسم ولی اللہ کالج آف تھیالوجی'' تجویز کیا ہے، ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ ہم نے انھیں اپنے ابتدائی تجارب میں شریک بنالیا ہے۔ انھوں نے اپنے افکار کا نمونہ سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر میں پیش کرنا پسند کیا ہے۔

ہماری تقریریں بہت سے دوستوں نے ضبط کرلی ہیں، مگر آج تک ہم نے کسی کی تصحیح اپنے ذمہ نہیں لی۔ مولوی بشیر احمد اور مولوی خدا بخش کی محنتوں کا ہم پر خاص اثر ہے، اس لیے ہم نے اس رسالے پر نظرِ ثانی منظور کی ہے۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ ان افکار کی ذمہ داری میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ ہم اپنے دوستوں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی یادداشتیں اس طرزِ تفکر کے مطابق بنالیں۔

واللہ المستعان عبید اللہ سندھی

(قرآنی شعور انقلاب، جمع وترتیب: شیخ بشیر احمد وغازی خدا بخش، ص ۳۱، بعنوان ''کلماتِ طیبات'' مطبوعہ: مکی دار الکتب، لاہور، اشاعتِ سوم: مارچ 1999ء)

مذکورہ تحریر میں مولانا سندھی صاحب کے درج ذیل جملے قابلِ غور ہیں:

(1).....''وہ ہمارے افکار لکھتے بھی رہتے تھے، اس طرح انھوں نے کئی سو صفحات تیار کرلیے''۔

(2).....''انھوں نے اپنے افکار کا نمونہ سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر میں پیش کرنا پسند کیا ہے''۔

(3).....''ہم نے اس رسالہ پر نظرِ ثانی منظور کی ہے۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ ان افکار کی ذمہ داری میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہیں''۔

ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی صاحب کو مولانا سندھی صاحب نے اپنی تقریر املا نہیں کرائی تھی، بلکہ انھوں نے خود سے مولانا سندھی کے افکار لکھے تھے، اسی لیے مولانا سندھی صاحب نے یہ تحریر کیا کہ ''انھوں نے اپنے افکار کا نمونہ، الخ''، جس پر مولانا سندھی صاحب نے نظرِ ثانی کی، اور اس کی شہادت دی۔

لہٰذا مولانا سندھی صاحب کی مذکورہ تحریر سے بعض حضرات کا یہ سمجھ لینا کہ مولانا سندھی صاحب نے اس رسالے کے علاوہ، جن حضرات کو اپنی تقاریر املا کرائیں، یا مولانا سندھی صاحب کی اجازت سے ان کی زندگی میں، جو مضامین شائع ہوئے، اور ان میں غلط وشاذ افکار پائے جاتے ہیں، ان کی نسبت مولانا سندھی صاحب کی طرف درست نہیں ہوگی، اس سے اتفاق مشکل ہے، جیسا کہ فصل نمبر 3 میں ذکر کردیا گیا ہے۔ شیخ بشیر احمد لدھیانوی صاحب کے مذکورہ تفسیری مجموعے کی درجِ ذیل عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں:

وتر، مسلمانوں کی خاص جماعت کے لیے ہیں، عوام کے لیے نہیں۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۳۱۹، درذیل عنوان تہجد کی نماز عوام کے لیے نہیں ہے، تفسیر سورہ مزمل، مطبوعہ: مکی دار الکتب، لاہور، اشاعتِ سوم: مارچ ۱۹۹۹ء)

www.idaraghufran.org

مولوی احمد علی صاحب لاہوری، حضرت امام (مولانا عبیداللہ سندھی صاحب) کے آخری وقت میں آپ سے ملاقات کے لیے دین پور تشریف لائے تھے، انھیں آپ نے کچھ وصیت بھی فرمائی تھی، مگر بعد میں انھوں نے اس پر عمل کرنے سے انکار کردیا، بلکہ حضرت امام کی تحریک کا سب سے بڑا مخالف ہی انھیں سمجھا جاتا ہے۔ افسوس! انا للہ وانا الیہ راجعون ''ماہنامہ ''توحید'' کراچی، نومبر، دسمبر 1944 عیسوی''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی: افکار وخدمات، مضامین: مولانا دین محمد وفائی، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان سندھی وشاہد حسین خان، صفحہ ۶۷، درذیل ''مولانا عبیداللہ سندھی کی زندگی آخری چار مہینے'' اشاعت: مئی 1995 عیسوی، الحمود اکیڈمی، اردو بازار، لاہور)

درجِ بالا تحریر مولانا سندھی صاحب کی وفات کے بعد کی ہے، مولانا سندھی صاحب کی وفات 1944 عیسوی میں 21 اگست کو ہوچکی تھی، جس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا لاہوری کو مولانا سندھی کی وفات کے بعد تک بھی اختلاف رہا، جب کہ اس بات کو نقل کرنے والے مولانا دین محمد وفائی صاحب، مولانا سندھی صاحب کے بڑے معتقد تھے۔

چنانچہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب لکھتے ہیں:

مولانا دین محمد وفائی، حضرت سندھی کے بڑے معتقد اور ان کے افکار کے بہت شیدائی تھے، کچھ مدت تک انھوں نے قرآن حکیم کے علوم وافکار میں مولانا سندھی سے استفادہ کیا، اور محض رسمی طور پر نہیں، بلکہ باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔

(مولانا عبیداللہ سندھی: افکار وخدمات، مضامین: مولانا دین محمد وفائی، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان سندھی وشاہد حسین خان، صفحہ ۹، درذیل ''حرفے چند'' اشاعت: مئی 1995 عیسوی، الحمود اکیڈمی، اردو بازار، لاہور)

## مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بیان کردہ توضیح

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے اختلاف کی تفصیل کے سلسلے میں مولانا احمد علی لاہوری کے

www.idaraghufran.org

براہِ راست شاگرد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا احمد علی لاہوری کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

معاصر علماء ومشائخ میں سے ان (یعنی مولانا احمد علی لاہوری) کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی، اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا سا معاملہ کرتے تھے، ایک مولانا حسین احمد مدنی دوسرے مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، ان آنکھوں نے بار بار دیکھا ہے کہ مولانا حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور نہایت ادب کے ساتھ دوزانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے، جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی، تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بہ قدرِ ضرورت جواب دیا، ورنہ خاموش رہے، مولانا سید انور شاہ صاحب کے بھی بڑے معتقد اور مرتبہ شناس تھے، ان کی زندگی میں برابر حاضری دیتے رہے، اور خردی وبزرگی کا معاملہ رکھا۔

مولانا اگرچہ اپنے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی کو اپنا سب سے بڑا محسن ومربی سمجھتے تھے، اور اپنے کو ان کا ساختہ و پرداختہ جانتے تھے، ان سے اخذ کیے ہوئے طرز تفسیر کو انھوں نے پورے طور پر اپنا لیا تھا، اور اس کی اشاعت وتعلیم کو وہ اپنے فرائضِ زندگی میں سمجھتے تھے، لیکن ان کا یہ سارا تعلق دین کے تابع تھا، اور وہ اپنی اس نیاز مندی، وفاداری میں عقیدہ اہلِ سنت اور مسلکِ سلف سے بال برابر ہٹنا بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ جب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے بعض اپنے خیالات وافکار کا اظہار فرمایا جو مولانا کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخُ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار ومسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور ان میں مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت، انفعالیت اور جذباتیت، طویل

مسافرت اور زندگی کی ناکامیوں اور ہمت شکن تجربوں کا اصل دخل تھا، اور ان سے مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تو مولانا نے ان کے خیالات میں متابعت نہیں فرمائی، بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کردیا، جس سے مولانا سندھی کو رنج بھی ہوا، اور شکایت بھی پیدا ہوئی، اس لیے کہ وہ مولانا سے اس کی بالکل توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن مولانا احمد علی صاحب نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اور پوری نیازمندی اور سعادت مندی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہے۔

مولانا (احمد علی لاہوری) بڑے وسیع النظر، وسیع القلب بزرگ تھے، عبادات و احکام میں فقہ حنفی اور مسلکِ دیوبندی کے پابند ہونے کے باوجود جماعت اہلِ حدیث اور اس جماعت کے علماء اور صلحاء سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور وہ ان کا احترام کرتے تھے، وہ عید کی نماز التزاماً مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی کے پیچھے، جو جماعتِ اہلِ حدیث کے امام اور امیر تھے، بادامی باغ کے کھلے میدان میں پڑھتے تھے، اس لیے کہ یہ زیادہ مطابقِ سنت ہے، انھوں نے اپنی الگ عیدین کی نماز قائم کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی، حالانکہ اگر ایسا ہوتا، تو شاید وہ لاہور کی سب سے بڑی جماعت ہوتی، ان کی ایک صاحب زادی بھی ایک اہلِ حدیث عالم کے نکاح میں تھیں، پنجاب اور لاہور کے اہلِ حدیث حضرات، مولانا سے عقیدت و محبت رکھتے تھے، اور برابر آتے جاتے رہتے تھے۔

(''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۱۳۷ و ۱۳۸، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا لاہوری صاحب، علمی و اجتہادی اور فقہی و فروعی مسائل میں تو خاطر خواہ نرمی اور رواداری رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے استاذ و مربی مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے ان افکار و خیالات سے برأت و اختلاف کا صاف اظہار فرمادیا،

جو اِن کے نزدیک، صحیح الخیال علماء اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار اور مسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اور مولانا سندھی صاحب کی تادمِ آخر خفگی وناراضگی قائم رہنے اور برا بھلا کہنے کو بھی گوارا کیا۔

جس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مولانا لاہوری کو مولانا سندھی صاحب سے اختلاف صرف علمی واجتہادی اور فقہی نوعیت کے مسائل وامور سے نہیں تھا، بلکہ وہ امور غیر اجتہادی وغیر فقہی نوعیت کے افکار تھے، جن میں مولانا لاہوری کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کی تصویب ممکن نہ تھی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ مولانا لاہوری نے مولانا سندھی صاحب سے ہجرت کے بعد کے افکار کو خود سنا ہوگا، بلکہ ان پر مذاکرہ بھی ہوا ہوگا، اسی لیے مولانا سندھی ان کو اپنا ہم خیال بنانے پر مصر رہے اور ناراض ہوئے، جیسا کہ مولانا لاہوری کے علاوہ، مولانا دین محمد وفائی صاحب نے بھی صراحت کی ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا لاہوری جنھوں نے مولانا سندھی کے ابتدائی اور آخری دونوں زمانوں کو پایا ہے، انھوں نے مولانا سندھی کے قبل از ہجرت و بعد از ہجرت کے افکار و خیالات میں اختلاف کا مشاہدہ کیا ہے، اور ان کا مولانا سندھی سے اختلاف آخر دم تک رہا۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے افکار میں انقلاب آخری دم تک رہا، اور قبل وبعد از ہجرت کے افکار مختلف رہے۔

مولانا لاہوری کی یہ تصریحات ان لوگوں کے لیے قابلِ توجہ ہیں، جو ان امور کو تسلیم نہیں کرتے۔

مولانا لاہوری کے وسیع النظر، وسیع القلب ہونے کے باوجود یہ طرزِ عمل دین کی خاطر تھا، جو نفسانیت یا ذاتی اختلاف پر مبنی نہیں تھا۔

مذکورہ تفصیل سے ان حضرات کے قول کا بھی مرجوح ہونا معلوم ہوتا ہے، جو یہ فرماتے ہیں کہ

مولانا سندھی صاحب کے افکارِ شاذہ کا تعلق، دینی عقائد ونظریات سے نہیں تھا، بلکہ صرف سیاسی تعبیرات، معاشی توضیحات اور سماجی ترجیحات سے تھا، یا یہ کہ فکرِ جدید کے موجد شاگردوں کو مولانا سندھی صاحب کا ترجمان تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

حالانکہ مولانا لاہوری کے بیان سے واضح ہوا کہ ہجرت کے بعد خود مولانا سندھی صاحب بھی جدید فکر کے ترجمان بنے ہیں، اس لیے اس جدید فکر کی وجہ سے مولانا لاہوری نے ان سے اختلاف کیا، اور مولانا لاہوری نے یہ جدید فکر، مولانا سندھی صاحب ہی کی بیان کی، نہ کہ ان کے شاگردوں کی، البتہ اگر کوئی شاگرد بھی اس فکر کا حامل ہو، تو اس سے اصل مسئلہ پر فرق نہیں پڑتا، کیونکہ استاد کا اثر فطری طور پر، اس کے شاگردوں کی طرف منتقل ہوا کرتا ہے۔

ایسی صورت میں یہ بات تعجب خیز کہلائی جائے گی کہ جس استاد کی فکر سے اس کے متعدد شاگردوں نے اثر لیا ہو اور استاذ ہی سے دینی ذہن سازی ہوئی ہو، ان کو تو موردِ الزام ٹھہرایا جائے، اور اس کے استاذ کو ان تمام چیزوں سے بری الذمہ قرار دے دیا جائے، جب کہ اس طرح کے مواقع پر اہلِ علم حضرات نے بڑے بڑے محدثین سے اختلاط کے دور میں غیر معتدل، شاذ یا منکر روایات کرنے والے شاگردوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا، بلکہ استاذ اور شیخ کے اختلاط کی وجہ سے اس دور کی غیر معتدل، شاذ ومنکر روایات کی تردید کی، اور اسی کے ساتھ حسنِ ظن کی بنا پر استاذ کو معذور ومؤول بھی قرار دیا۔

## مولانا سندھی صاحب کے مکتوب کے ایک جملے کی توضیح

جہاں تک فاضل ناقد کی اس بات کا تعلق ہے:

> مفتی صاحب اپنے فتوے سے اس پر فقہی انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں کہ مدعی یہ کہتا ہے، تو کیا وہ مسلمان ہے یا اب بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے؟ دیوبندی دیوبندیت سے خارج ہے؟

www.idaraghufran.org

ہمارا جواب وہی ہے، جو حضرت لاہوری نے دیا ہے، اور اس کا اعتراف خود مولانا سندھی صاحب نے اپنے مکتوب میں بھی مولانا لاہوری صاحب کو خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا ہے:

''آپ کو میرے ''مذہبی خیالات'' میں تبدیلی کا علم ہو چکا ہے۔ اس لیے آپ مجھ سے وہ تعلق جو پہلے تھا، نہیں رکھ سکتے۔ کیوں کہ ''ضروریاتِ دین'' کا انکار برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے میں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک متبع شاگرد تھا، اب مولانا شیخ الہند کے مسلک کا مخالف ہوں، اس لیے مجھ سے وہ تعلق کیسے قائم رہ سکتا ہے؟''

ظاہر ہے مولانا لاہوری پر اگر مولانا سندھی صاحب کی اس بات کا اثر ہوا ہوتا، اور انھوں نے مولانا سندھی صاحب کی اس بات کو تسلیم کیا ہوتا، تو وہ مولانا سندھی صاحب کی اس بات کو قبول کرتے، مگر جب مخاطب، اور خاص تلمیذ ہونے کے باوجود انھوں نے ہی قبول نہ کیا، تو کوئی دوسرا کیسے قبول کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے اس مکتوب کے باوجود اس کے بعد جب کہ مولانا سندھی صاحب کا 1944 عیسوی کو وصال ہو چکا تھا، 23 جون 1946 عیسوی کے مکتوب میں جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا، مولانا لاہوری صاحب نے خود مولانا سندھی صاحب کے قبل از ہجرت کے قرآن وسنت پر مبنی خیالات سے ہی اتفاق فرمایا، جیسا کہ اس مکتوب کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

حضرت مدنی نے درج ذیل الفاظ میں واضح طور پر فرما دیا ہے:

''یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا.....

بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی

کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں''۔ (ماہنامہ ''برہان'' ربیع الثانی 1364ہجری، مطابق اپریل 1945ء)

ظاہر ہے کہ حضرت مدنی نے یہ پُر زور درخواست اس لیے کی کہ انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے بیان کردہ افکار کی نسبت مذکورہ اکابر کی طرف کرنے کو محسوس کیا۔

حضرت مدنی کی مذکورہ پرزور درخواست کی بنیاد پر، ہم بھی اس طرزِ عمل کو اختیار کرتے ہیں کہ مولانا سندھی صاحب کی کسی بھی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک حتمی رائے قائم نہ کی جائے، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر نہ پرکھ لیا جائے، اور مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھا جائے، جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو نہ کس لیا جائے۔

اگرچہ مولانا سندھی صاحب اپنی کسی فکر کو اہلِ سنت والجماعت یا شاہ ولی اللہ یا اکابرِ دیوبند کا مسلک کیوں نہ قرار دیں۔

مولانا سندھی صاحب کی طرف سے ایک ہی تحریر یا ایک ہی مجلس میں اس طرح کے متضاد و مخالف امور کو حضرت مدنی کے بقول دماغی انقلاب اور دماغی توازن پر کاری اثر پڑنے پر محمول کیا جائے، اور ان کے اس سلسلے میں کسی دعوے کو اصل کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہ کیا جائے۔

ہفت روزہ صدق کے مبصر فرماتے ہیں:

ہمارا اختلاف مولانا عبیداللہ سندھی اور موسیٰ جاراللہ وغیرہ سے صرف یہی ہے کہ وہ تمام امت کے خلاف ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، اور پھر اس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ اکابرِ امت کی طرف منسوب کر کے ملتِ اسلامیہ کو غلط راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارتوں سے ضعیف سے ضعیف اشارے لے کر اپنے نظریات ثابت کرتے ہیں، اور جس چیز کو اپنی عقل ونظر کے موافق نہیں پاتے، خواہ وہ قرآن وحدیث صحیح کی بھی ہو، اس کی کھلی تحریف کر دیتے ہیں۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۶۷، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (لاہور) اپنے ایک تفصیلی مضمون میں فرماتے ہیں:

جناب مفتی عبدالخالق آزاد صاحب نے خوب وضاحت فرمادی کہ یہ سارا فکر مولانا عبیداللہ سندھی کا اپنا تھا۔ اپنے دور کے حالات کا انھوں نے خود مطالعہ کیا، خود غور وفکر کر کے ایک جامع فلسفہ ترتیب دیا، تو اس کو فکر سندھی ہی کہنا موزوں ہوگا، فکرِ ولی اللّٰہی کہنا یقیناً حد سے تجاوز ہوگا۔ اس فلسفے کو پیش کرنے میں مولانا اپنے زمانے کی تعبیرات سے زیادہ متأثر ہیں اور کہیں کہیں وہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

اسی طرح تفسیر میں بھی اگرچہ مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ کی الفوزُ الکبیر اور حجۃُ اللہ البالغہ سے استفادہ کیا، لیکن اس میں جو راہِ عمل انھوں نے اختیار کی، وہ ان کی اپنی حاصل کردہ ہے، شاہ ولی اللہ کی نہیں۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۹۳ و ۲۹۴، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے فتوے میں وہاں کے شیخ الحدیث صاحب کی درجِ ذیل

عبارت بھی قابلِ توجہ ہے:

احقر نے بھی مولانا عبیداللہ سندھی کے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے جس کو وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا فلسفہ قرار دیتے ہیں۔ مگر جب میں نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' لکھی تو مجھے وہ باتیں ''حجۃ اللہ'' میں کہیں نظر نہیں آئیں، یعنی مولانا سندھی نے اپنے نظریات شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نام لگائے ہیں۔ فقط

سعید احمد عفا اللہ عنہ۔ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۲۰ شعبان ۱۴۲۹ھ

(تنظیم فکر ولی اللّٰہی اور اس کی قیادت، حقائق کے آئینہ میں، تالیف مولانا ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری سابق مرکزی کنونیئر جمعیۃ طلبائے اسلام پاکستان، صفحہ ۸۱، سن اشاعت ۲۰۱۴ء، ناشر مکتبہ دیوبند ڈیرہ اسماعیل خان، پاکستان)

پس مولانا سندھی صاحب کے کسی ایسے نظریہ اور فکر کو شاہ ولی اللہ صاحب یا مسلکِ دیوبند اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کی طرف منسوب کرنا، جو چیز اصولیاتِ دین کے خلاف ہو، وہ کسی کی ذاتی یا اختلاطی فکر تو ہوسکتی ہے، اہلُ السنۃ والجماعۃ کی صحیح فکر نہیں ہوسکتی، جیسا کہ حضرت مدنی کے حوالہ سے گزرا۔

www.idaraghufran.org

## (فصل نمبر 5)

# حضرت تھانوی کے اختلاف سے متعلق الزام

فاضل ناقد اپنے مضمون ''جماعتِ دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت سندھی، تھانہ بھون حضرت حکیم الامت کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضرت سندھی سے حضرت حکیم الامۃ کے دینی مراسم تھے، حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں:

"آدمی میں جتنا کمال ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے معاملات میں، مقالات میں سلاست آتی جاتی ہے، اور جب انتہائی کمال حاصل ہوتا ہے تو اس وقت یہی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ عالم بھی ہے یا نہیں؟

اس کی تائید میں مولوی عبید اللہ ناظم مؤتمر الانصار کا ایک مقولہ بیان فرمایا کہ: وہ جب یہاں آئے تو مجھ سے کلید مثنوی کی تکمیل کی فرمائش کی۔ میں نے عذر کیا کہ لیاقت علمی تو کبھی مجھ کو حاصل ہی نہیں ہوئی، مگر اب تو اصطلاحیں وغیرہ بھی سب بھول بھال گئے، وہ لفظی علم بھی غائب ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ علم کا تو وہی وقت ہے جب یہ اصطلاحیں بھی دی جائیں۔

(ملفوظات حکیم الامت ج ۴۷، ص ۲۴، ۱۴۱)

یہ ملفوظ 13 ربیع الاول 1351ھ، 17 جولائی 1932ء (منگل) کا ہے۔

اس ملفوظ کی مزید وضاحت ایک دوسرے ملفوظ سے ہوتی ہے جو 19 جمادی الاولیٰ 1362ھ 24 مئی 1943ء کا ہے یعنی مذکورہ بالا ملفوظ سے بارہ سال دو ماہ بعد کا ہے اور حضرت حکیم الامت کی وفات 16 رجب المرجب 1362ھ، 19 جولائی 1943ء کو ہوئی۔ اس طرح یہ ملفوظ وفات سے ایک ماہ چھبیس دن پہلے کا ہے، اور اس ملفوظ کے راوی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"مولوی عبید اللہ سندھی کا ایک مقولہ مجھے بہت پسند ہے گو وہ اس محل میں درست نہ ہو، جس

کے لیے انھوں نے فرمایا تھا، وہ یہ کہ مولوی صاحب نے مثنوی کی شرح لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے عذر کیا کہ اب تو مجھے اصطلاحات بھی یاد نہیں رہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ علم کا تو وہی وقت ہے جب اصطلاحات سے ذہول ہو جائے۔ فرمایا کہ ذہین آدمی ہیں، یہ مضمون بالکل صحیح ہے، کیونکہ جب تک اصطلاحات یاد ہیں الفاظ کا غلبہ رہتا ہے جب اصطلاحات محو ہو جائیں تو معانی کا غلبہ ہو جاتا ہے (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۹۔۸۳)

حضرت حکیم الامت بڑے آدمی تھے انھوں نے حضرت سندھی سے اختلاف کیا ہوگا تو علمی اختلاف ہوگا، ان کی ذات سے کبھی اختلاف نہیں کیا۔

یہ دوسرا ملفوظ کتنی وضاحت کے ساتھ حضرت سندھی کی عظمت پر دال ہے جو وفات سے چند دن پہلے کا ہے۔ وہ حضرات جو حضرت حکیم الامت اور حضرت سندھی کا اختلاف ذکر کر کے اپنی نفسی خواہشات کو پورا کرتے ہیں، ان کے لیے یہ ملفوظ مشعل راہ ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت حکیم الامت کو حضرت سندھی کی توجہ سے حکیم الہند حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کی کتب دیکھنے اور پھر حضرت شاہ صاحب پر مقالہ لکھنے کا موقع ملا جو جمعیۃ الانصار کے دوسرے جلسے (۱۶ اپریل 1912ء) میں میرٹھ میں پڑھا گیا واضح رہے یہ جلسہ حضرت حکیم الامت ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔ حضرت حکیم الامت نے جو مقالہ پڑھا تھا اس کا نام ''دعاۃ الامۃ وہداۃ الملۃ'' تھا۔ اس کے خاتمے پر حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں:

"اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اس مختصر مضمون میں صرف اجمالی خاکہ ضرورت وحالت دارالعلوم کا کھینچا گیا ہے، اس کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب ناظم جمعیۃ الانصار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ زبانی یا اپنے تحریرات سابقہ یا حال کے ذریعے سے جو کہ اسی مضمون میں لکھی گئی ہوں اس مضمون کی جس قدر مناسب سمجھیں تفصیل فرمادیں کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں، بلکہ میں نے جو کچھ ان پریشان عبارات میں عرض کیا ہے وہ ان (مولانا عبیداللہ) ہی کی توجہ کی برکت ہے اور میں یہ بات براہ تکلف نہیں کہتا بلکہ یہ ایک واقعہ ہے جو مجھ پر گزرا ہے کہ جب مجھ سے مولوی صاحب موصوف نے اس

باب میں کچھ لکھنے کو فرمایا، واقعی میں خالی الذہن تھا۔ ایک صفحے کے لائق بھی ذہن میں مضمون نہ تھا اور مولوی صاحب نے فرمائش کی بیس صفحے کی، میں نے عذر بھی کیا، مگر دوبارہ فرمانے سے قبول کرنا پڑا۔ لیکن متردد تھا کہ کیا لکھوں گا؟ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت کہ وہ بھی مجھ کو مولوی صاحب ہی سے ملی تھی، میرے پاس کل سرمایہ تھا۔ مگر جب لکھنے بیٹھا غالباً پانچ گھنٹے میں یہ بیس صفحے لکھے گئے۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اس فضل خداوندی کے ظاہری دو سبب ہوئے، ایک مدرسۂ دیوبند کی مقبولیت، دوسرا مولوی صاحب کی توجہ کی برکت۔ اس کے چاہے یہ معنی نہ ہوں کہ مولوی صاحب صاحبِ تصرف ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ صاحب خلوص ہیں۔ خلوص کی ایسی تاثیرات متعدیہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (ماہنامہ القاسم دیوبند، ربیع الثانی 1330ھ)''

فاضل ناقد کا جو مضمون ہمارے سامنے ہے، اس کو بعینہٖ نقل کیا گیا ہے، اس مضمون میں پروف ریڈنگ کی متعدد اغلاط ہیں، جو معلوم نہیں کہ بعد میں کتابت کرتے وقت صادر ہوئی ہیں، یا اصل مضمون میں ہی اغلاط ہیں؟

## مولانا تھانوی کا مولانا سندھی سے اختلاف اور حسنِ سلوک

اس موقع پر بیان کردہ مذکورہ بڑے شبہ کا جواب ہم اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے ضمیمہ میں نقل کر چکے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''اولاً تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا جمعیۃ الانصار کا یہ خطبہ اُس دور سے پہلے کا ہے، جب مولانا سندھی نے مدرسہ ''نظارۃُ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے 1913ء میں دہلی میں قائم کیا تھا، اور اس میں ایک خاص طرز پر تفسیر پڑھانا شروع کی تھی، اور اس کے بعد ہی ان کا خاص طرزِ تفسیر منظرِ عام پر آنا شروع ہوا تھا، جس کی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تردید وتنقید فرمائی ہے۔

دوسرے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جمعیۃ الانصار کے اس خطبے میں مولانا سندھی

کو محض صاحبِ خلوص قرار دیا ہے، اور پھر مولانا سندھی صاحب کے 1933 ہجری بمطابق 1915 عیسوی میں ہندوستان سے چلے جانے کے بعد 1344ھ، اور اس کے بعد کے اپنے ملفوظات میں بھی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے مولانا سندھی کے طرزِ تفسیر سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کو سرسید احمد صاحب کی طرح مخلص قرار دیا ہے۔

چنانچہ مولانا تھانوی ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

''مولوی عبیداللہ (سندھی) صاحب مخلص تھے، مگر ایسے ہی تھے جیسے سرسید مخلص تھے، چنانچہ غدر کے بعد کے واقعات ان کے خلوص کے شاہد ہیں''۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۴ص۲۱۰، ۲۱۱، بعنوان ''فیض الخالق وکلمۃ الحق''، ملفوظ نمبر: 260، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ طباعت: 2000ء)

یہ مکمل ملفوظ ہماری مفصل کتاب کے شروع میں شاملِ اشاعت ہے۔

اور ایک دوسرے ملفوظ میں حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

''ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل نیچریت کا غلبہ دین داروں پر بھی کم وبیش ہوگیا ہے، محض دین داروں ہی پر نہیں، جھلک سب میں مارنے لگی ہے، اور جو معدودے چند اپنے بزرگوں کے مسلک اور طرز پر قائم ہیں، ان کو لکیر کا فقیر، جامد الطبع، اور خدا معلوم کیا کیا خطاب دیے گئے ہیں، اور کن کن القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

فلاں مولوی صاحب، جن کو میں مولویوں کا سید احمد خان کہا کرتا ہوں، یہاں آئے تھے، انھوں نے دہلی میں ایک مدرسہ (نظارۃُ المعارف القرآنیہ) جاری کیا تھا، اس میں نئی روشنی کے اصولوں سے بی۔اے والوں کو تفسیر پڑھاتے تھے، یہاں جب آئے میں نے کہا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے، کہنے لگے کہ قدیم طرز

کی تفسیر سے ان لوگوں کو تشفی نہیں ہوتی، اس لئے جدید طرز پر تفسیر پڑھاتا ہوں، اور اس جدید طرز کے متعلق وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہے، یہ محض غلط ہے''۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد ۶ صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷، بعنوان ''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ'' ملفوظ نمبر ۳۱۷، مجلس بعد نمازِ جمعہ: ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے مولانا سندھی صاحب کے ہجرت کے بعد کے اس ملفوظ میں ان کو مخلص یا ذہین تسلیم کرنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان سے اختلاف کا برملا اظہار فرمایا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی مولانا سندھی صاحب کی اس سمجھ کو بھی محض غلط قرار دیا ہے کہ ان کا طرزِ تفسیر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے ماخوذ ہے۔

مگر آج ایک طبقہ مولانا سندھی صاحب کی اس سمجھ کو صحیح قرار دے کر تبلیغ واشاعت میں مصروف ہے۔

حالانکہ اس سے زیادہ اعتدال وانصاف اور کیا ہوسکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود، دوسرے کے اخلاص وقربانیوں اور اس کے ذہین وغیرہ ہونے کو تسلیم کیا جائے''۔

(ملاحظہ ہو: مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۴۹۸، ۴۹۹، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا اشرف علی تھانوی کے 23 ذیقعدہ 1350 ہجری کے ملفوظ میں ہے:

ایک نئے خیال کے مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ یہاں پر آئے تھے، میں نے مہمان سمجھ کر اچھا برتاؤ کیا، وہ کھلے، تو مجھ سے کہا کہ مجھے تنہائی میں کچھ کہنا ہے، میں نے ان کو تنہائی کا وقت دیا، مختلف باتیں ہوتی رہیں، میں نے کہا کہ آپ کو کیا ضرورت ہوئی کہ آپ نے ترجمۂ قرآن پڑھانے کا نیا طرز نکالا

متقدمین کے خلاف، کہنے لگے کہ اب نئے نئے شبہات (پیدا) ہونے لگے ہیں، ان نئے شبہات کا جواب بدون اس طرزِ جدید کے نہیں ہوسکتا، میں نے کہا کہ پرانے طرز کی تفسیروں کو اگر سمجھ کر پڑھ لیا جائے، سب شبہات کا جواب ان میں موجود ہے، الخ (ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد ۲ صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵، بعنوان ''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ'' ملفوظ نمبر ۴۱۰، مجلسِ خاص بوقتِ صبح یومِ جمعہ: ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۵۰ ہجری، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، تاریخِ طبع: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی نے مولانا سندھی صاحب کو نئے خیال کے مولوی صاحب قرار دیا ہے، اور ان کے طرزِ تفسیر سے اختلاف کیا ہے، اور اُن کے اپنے یہاں آنے پر ان کے ساتھ اچھے برتاؤ اور بے تکلفانہ گفتگو کا ذکر کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی کا مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف نہ تھا، البتہ بعض مسائل میں علمی و دینی اختلاف تھا، اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ تھا۔

دوسرے ملفوظات میں بھی مولانا سندھی صاحب کے حضرت تھانوی کے یہاں آنے اور مولانا سندھی صاحب کے طرزِ تفسیر سے حضرت تھانوی کے اختلاف کرنے کا ذکر ہے۔

(ملاحظہ ہو: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد ۲۶ صفحہ ۶۹، وصفحہ ۴۸۴، بعنوان ''الکلام الحسن'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، تاریخِ طبع: ربیع الاول ۱۴۲۵ھ)

حضرت تھانوی کا وصال 1362 ہجری، 1943ء میں ہوا، جب کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا وصال 1944ء میں ہوا۔

اور اگر حضرت تھانوی کا کوئی ملفوظ مذکورہ واقعے کے بعد کا بھی ہو، جس میں مولانا سندھی صاحب کے کسی واقعے یا بات کا ذکر کیا گیا ہو، جیسا کہ حضرت تھانوی نے ایک ملفوظ میں جس کو فاضل ناقد نے بھی اپنی نقل کردہ اوپر کی عبارت میں ذکر کیا ہے، اور حضرت تھانوی نے مولانا سندھی صاحب کو ''ذہین آدمی'' کہا ہے، اور ان کی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ:

''جب تک اصطلاحات یاد ہیں الفاظ کا غلبہ رہتا ہے، جب اصطلاحات محو ہو جائیں، تو معانی کا غلبہ ہو جاتا ہے''۔

تو اس سے کسی دوسرے واقعہ یا دوسری چیز میں نہ تو اختلاف کی نفی ہوتی، اور نہ ہی باہم فکری اتفاق کا ثبوت ہوتا، کیونکہ ان کا باہم کوئی ذاتی اختلاف تو نہیں تھا، جیسا کہ فاضل ناقد نے خود بھی اوپر کی عبارت میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے، حضرت تھانوی کا خصوصی ذوق یہی تھا۔

حضرت تھانوی خود فرماتے ہیں:

کسی کے ساتھ اختلاف وغیرہ کچھ ہو، مگر ادب یعنی حفظ حدود کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے، الحمدللہ میں اس کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ امر حق بیان بھی ہو جائے اور کسی کی اہانت بلاضرورت نہ ہو (امت کے باہمی اختلافات اور ان کا حل، ص ۱۸۵، افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ انتخاب وترتیب: محمد زید مظاہری ندوی۔ ناشر: ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگا، ہردوئی روڈ، لکھنؤ)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

واقعی بزرگوں کا ادب ہے بھی، بہت ضروری عمل، مگر اللہ اللہ کرنے والے ہوں، خواہ وہ کسی بھی مشرب کے ہوں، حتیٰ کہ اگر کسی غلطی میں بھی مبتلا ہوں، اس حالت میں بھی ان کا اتباع تو نہ کرے، لیکن ان کی شان میں کوئی گستاخی بھی نہ کرے۔

(امت کے باہمی اختلافات اور ان کا حل، ص ۱۸۹، افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ انتخاب وترتیب: محمد زید مظاہری ندوی۔ ناشر: ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگا، ہردوئی روڈ، لکھنؤ)

اور فرماتے ہیں:

ہمارے اندر یہی باتیں تو نہیں رہیں، بلکہ اس کے بجائے تحزّب اور گروہ بندی کا

مرض آ گیا ہے۔( امت کے باہمی اختلافات اوران کا حل، ص۱۹۱، افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔انتخاب وترتیب: محمد زید مظاہری ندوی۔ناشر: ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگا، ہردوئی روڈ، لکھنؤ)

اس لیے حضرت تھانوی کے کسی ایک ملفوظ کو جھوٹا اور کسی دوسرے کو سچا قرار دینے کی کوئی حقیقت نہیں۔

اسی طرح ایک کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ قرار دینے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ ناسخ ومنسوخ کا تعلق ایک قضیے اور ایک حکم سے ہوتا ہے، جبکہ یہاں صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ فافترقا۔

## مولانا تھانوی کا مولانا سندھی کو سرسید احمد کی طرح مخلص کہنا

ہم نے اپنی مفصل کتاب کے شروع میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے دو ملفوظات نقل کیے تھے، جن کو بغور ملاحظہ کرنے سے مولانا سندھی صاحب کی شخصیت اوران کے افکار کو سمجھنے میں مدد حاصل کی جاسکتی تھی، لیکن اس کے بجائے خود حضرت تھانوی کے ان ملفوظات کو ہی نظر انداز بلکہ منسوخ ومردود قرار دینے کی کوشش کی گئی، جس کی وجہ سے مجبور ہوکر حضرت تھانوی کے ان ملفوظات کی روشنی میں بادلِ ناخواستہ ایسی چیزوں کو واضح کرنا پڑ رہا ہے، جو شاید بعض حضرات کے لیے تکلیف کا باعث ہوں، لیکن ہم اس کی توضیح پر مجبور اور ساتھ ہی پیشگی معذرت خواہ ہیں، جبکہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مخصوص دماغی عارضے کے پہلو کا ذکر دوسرے مقامات پر مفصلاً کیا جاچکا، یہاں اس کے اعادے کی گنجائش وضرورت نہیں۔

تو جاننا چاہیے کہ مولانا تھانوی نے مولانا سندھی کو مولویوں کا سرسید احمد اور سرسید احمد کی طرح مخلص قرار دیا ہے، اوران کی تعریف وتوصیف فرمائی ہے، لیکن ان کے بعض افکار سے

اختلاف کیا ہے۔

چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے مولانا سندھی صاحب کے متعلق ایک مقام پر یہ فرمایا ہے:

''مولوی عبیداللہ (سندھی) صاحب مخلص تھے، مگر ایسے ہی تھے، جیسے سرسید مخلص تھے۔ چنانچہ غدر کے بعد کے واقعات ان کے خلوص کے شاہد ہیں۔ ایک پادری نے وہابی کی اخبار میں وہ علامات لکھی تھیں، جو سننِ نبویہ ہیں، اور گورنمنٹ کو ان سے احتیاط کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ سرسید نے بڑے بڑے لوگوں کے جن کی وفاداری پر گورنمنٹ کو اطمینان تھا، دستخط سے ایک محضر نامہ لکھوایا کہ ہم سب وہابی ہیں، گورنمنٹ ہماری نگرانی کرے۔ حقیقت میں وہ قوم پر فدا تھے، اور اس باب میں مخلص تھے، اور اخلاق میں یکتا، مگر عقائد خراب تھے۔ اخلاق اور چیز ہے، اور عقائد اور چیز۔ عقائد مثل سر کے ہیں، اور اخلاق مثل جوارح (اعضا) کے، عقائد پر نجات موقوف ہے، اخلاق پر نہیں۔ اخلاق بلا عقائد کا ثمرہ (نتیجہ) محض دنیاوی ہے، اور عقائد کا ثمرہ (نتیجہ) اخروی۔ اعتقادِ فاسدہ مانعِ نجات (یعنی عقائد کی خرابی نجات میں رُکاوٹ ہے) خواہ کیسا ہی خوش اخلاق ہو۔ ایک شخص نے جو کالج علی گڑھ میں پرنسپل کے پیش کار تھے، مجھ سے کہا کہ کالج کے لڑکے ایسے برے نہیں جیسی شہرت ہے۔ میں نے کہا تم شفیق باپ کی طرح نہیں ہو، تم نے پھوڑے پھنسیاں دیکھی ہیں، جو زیادہ خطرناک نہیں، سرسام (یعنی دماغ کے اندر کی خطرناک بیماری) پر غور نہیں کیا، جو مہلک ہے۔ ہم شفیق باپ کی طرح ہیں، مرضِ مہلک یعنی سرسام پر نظر رکھتے ہیں، گو تمام بدن سالم ہو۔

اسی سلسلے میں فرمایا: میں تو کہا کرتا ہوں کہ مولوی عبیدُ اللہ صاحب، سرسید احمد تھے، مگر مولوی صاحب میں قوتِ عملی نہ تھی، صرف رائے رائے تھی''۔ (کلمۃ الحق، یعنی

www.idaraghufran.org

ملفوظاتِ اشرفیہ، قسط ہشتم، ص ۱۲۹ تا ۱۳۱، مجلس ۷ شوال المکرّم، ۱۳۴۴ھ، مطبوعہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ، تھانہ بھون، ہندوستان، وملفوظات حکیم الامت ج ۱۴ ص ۲۱۰، ملفوظ نمبر ۲۶۰، فیوض الخالق وکلمۃ الحق، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان)

دوسرے مقام پر فرمایا:

آج کل نیچریت کا غلبہ دین داروں پر بھی کم وبیش ہوگیا ہے، محض دین داروں ہی پر نہیں، جھلک سب میں مارنے لگی ہے، اور جو معدودے چند اپنے بزرگوں کے مسلک اور طرز پر قائم ہیں، ان کو لکیر کا فقیر، جامد الطبع، اور خدا معلوم کیا کیا خطاب دیے گئے ہیں، اور کن کن القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

فلاں مولوی صاحب، جن کو میں مولویوں کا سید احمد خان کہا کرتا ہوں، یہاں آئے تھے، انھوں نے دہلی میں ایک مدرسہ (نظارۃُ المعارف القرآنیہ) جاری کیا تھا، اس میں نئی روشنی کے اصولوں سے بی۔اے والوں کو تفسیر پڑھاتے تھے، یہاں جب آئے میں نے کہا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے، کہنے لگے کہ قدیم طرز کی تفسیر سے ان لوگوں کو تشفی نہیں ہوتی، اس لیے جدید طرز پر تفسیر پڑھاتا ہوں، اور اس جدید طرز کے متعلق وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہے، یہ محض غلط ہے''۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد ۶ صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷، بعنوان ''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ'' ملفوظ نمبر ۳۱۷، مجلس بعد نمازِ جمعہ: ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی مذکورہ عبارات وملفوظات میں مندرجہ ذیل جملے قابلِ غور ہیں:

(1).....مولوی عبید اللہ صاحب مخلص تھے، مگر ایسے ہی تھے، جیسے سرسید مخلص تھے۔

www.idaraghufran.org

(2)..... مولوی عبیدُ اللہ صاحب، سرسید احمد تھے۔

(3).....آج کل نیچریت کا غلبہ دینداروں پر بھی کم وبیش ہوگیا ہے۔

(4).....میں مولوی عبید اللہ صاحب کو، مولویوں کا سید احمد خان کہا کرتا ہوں۔

اسلام میں چونکہ بے جا تعصّب وتحزّب اور گروہ بندی کے جواز کی گنجائش نہیں، اس لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ہر قسم کے بے جا تعصّب وتحزّب اور گروہ بندی سے بچتے ہوئے، مولانا سندھی صاحب کے متعلق حفظ حدود کا خیال رکھتے ہوئے، بے تکلف انداز میں اپنی دینی رائے ظاہر فرمادی۔

آج کل جو متعصّبین کا طرزِ عمل ہے کہ وہ کسی شخصیت سے دینی اختلاف یا اتفاق ظاہر کرنے سے پہلے اس کے اپنے یا اپنی مخصوص جماعت کے ساتھ تعلق کو دیکھتے ہیں، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اس طرزِ عمل سے پاک ہوکر مولانا سندھی صاحب اور سرسید احمد خان کا ذکر فرمایا۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے مذکورہ ملفوظات میں جناب سرسید احمد خان صاحب کو مخلص، قوم پر فدا، اور اخلاق میں یکتا قرار دینے کے ساتھ ساتھ، ان کے عقائد خراب ہونے کا حکم لگایا ہے، اور مولانا سندھی صاحب کو سرسید احمد خان صاحب کی طرح مخلص اور نیچریت سے متاثر قرار دیا ہے، اور مولانا سندھی صاحب کو مولویوں کا سرسید احمد خان قرار دیا ہے، کیونکہ مولانا سندھی صاحب کی نسبت مدارس کے علماء سے تھی، جب کہ سرسید صاحب کا تعلق، مدارس کے بجائے، کالج سے تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو جس طرح سرسید احمد خان صاحب کے اخلاص اور قوم کے لیے قربانی کے جذبے کا اعتراف، مگر اُن کے متعدد عقائد ونظریات سے اختلاف تھا، اسی طرح مولانا سندھی صاحب کے اخلاص اور قربانیوں کا اعتراف، مگر ان کے متعدد عقائد ونظریات سے اختلاف تھا۔

اور ہم یہ پہلے تفصیل کے ساتھ لکھ آئے ہیں کہ ہمیں مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار سے

اختلاف کے باوجود اُن کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں سے انکار نہیں، اسی طرح ہمیں سرسید احمد خان صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف کے باوجود اُن کی متعدد اعلیٰ صفات اور قربانیوں سے بھی انکار نہیں، اور ہمارے نزدیک جس طرح سرسید احمد خان صاحب کے متعدد افکار کے باعث بہت سے مسلمانوں میں بے راہ روی پھیلی، اسی طرح ان کے بعد مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار کے باعث بھی بہت سے مسلمانوں میں بے راہ روی پھیلی۔

جس طرح سرسید احمد خان صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف کی بنا پر ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کا انکار کرنا، یا ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کی وجہ سے ان کے غلط افکار کو قبول کرنا یا ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کی بنا پر ان کو غلط افکار سے پاکیزہ قرار دینا اور اس سلسلے میں بے جا تعصّب وتحزّب اختیار کرنا درست اور انصاف پر مبنی نہیں۔

اسی طرح مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف کی بنا پر ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کا انکار کرنا، یا ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کی وجہ سے ان کے غلط افکار کو قبول کرنا یا ان کی اعلیٰ صفات اور قربانیوں کی بنا پر ان کو غلط افکار یا دماغی اختلال وغیرہ سے پاکیزہ قرار دینا اور اس سلسلے میں بے جا تعصّب وتحزّب اختیار کرنا بھی درست نہیں۔

کیونکہ ان دونوں شخصیات سے اختلاف یا اتفاق کی بنیاد شخصی وذاتی نہیں، بلکہ اس کی بنیاد علمی ودینی ہے۔

لیکن مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے بقول بعض حضرات اس بوالعجمی کا شکار ہیں۔

چنانچہ سید سلیمان ندوی صاحب اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

> حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کے ان ہی خیالات کی اس تشریح کو اگر سرسید اور شبلی کا قلم بیان کرے، تو بے دینی، اور اگر فضلائے دیوبند لکھیں، تو عین دین۔ ع
> بسوخت عقل از حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست (مکاتیب سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ، صفحہ ۱۸۷، مکتوب نمبر 108، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول: مئی 1954 عیسوی)

www.idaraghufran.org

آگے آتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے سرسید احمد خان صاحب کی فکر سے توافق ظاہر کیا ہے، اور اپنے آپ کو سرسید احمد خان کا ثنیٰ قرار دیا ہے۔

لیکن آج تعصّب وتحزّب میں مبتلا بعض حضرات سید سلیمان ندوی صاحب کے اسی تاثر کا مظہر ہیں، جس سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ جیسی شخصیات، بحمداللہ تعالیٰ بری ہیں کہ جنھوں نے جس سے جتنا اختلاف پایا، اس کا کسی تحزّب وتعصّب میں مبتلا ہوئے بغیر کلی یا جزوی طور پر اظہار کیا، خواہ وہ سرسید احمد خان کی شخصیت ہو، یا شبلی نعمانی صاحب کی، یا پھر مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی۔

ہم بھی دین کے معاملے میں اسی اصول کی اتباع کو ترجیح دیتے اور پسند کرتے ہیں، خواہ کسی کو یہ طرزِ عمل ناگوار یا کسی کی ذات کے لیے نقصان دہ کیوں نہ محسوس ہوتا ہو، کیونکہ دین کی سلامتی کا معاملہ، کسی کی ذات سے زیادہ اہم ہے۔

## سرسید احمد خان کے متعلق، حضرت تھانوی وغیرہ کی رائے

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے سرسید احمد خان کے افکار واوصاف کے متعلق اپنے دوسرے ملفوظات وارشادات میں اظہارِ خیال کیا ہے، جس سے سرسید احمد خان کے افکار واوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ مولانا تھانوی صاحب کے مذکورہ اصولی نوعیت کے موقف کی تائید وتوثیق میں خود مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے افادات وملفوظات کو بھی ذکر کیا جائے گا۔

تاکہ اس کی روشنی میں مولانا تھانوی صاحب کے بیان کردہ ''مولویوں کے سرسید احمد خان'' کی حقیقت وتفصیل کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

www.idaraghufran.org

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اپنے ''ملفوظات'' میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

سر سید احمد خان کی ہجو (یعنی برائی) کسی نے نظم میں لکھی، اور مدرستہ العلوم کے خاص دوازہ، چوکھٹ پر کھڑے ہو کر وہ پڑھی گئی، سر سید احمد خان نے مکان سے نکل کر کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میری قوم مجھے یاد تو کرتی ہے، اور پچیس روپے ان صاحب کو دئے۔

پھر فرمایا کہ وہ صاحب بھی کمال کے تھے، وہ روپے لے لیے۔

پھر فرمایا کہ اس سے سر سید احمد خان کا متحمل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۱۸، ص ۴۱، حسن العزیز، جلد دوم، بعنوان: سر سید احمد کا تحمل، ملفوظ نمبر: ۳۸، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1425 ہجری)

اس ملفوظ میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے سر سید احمد خان کے تحمل پر مبنی حسنِ اخلاق کا ایک نمونہ ذکر فرمایا ہے، جس سے سر سید احمد خان کے مخصوص اخلاق کی تعریف وتوصیف مقصود ہے، لیکن اس کے باوجود مولانا تھانوی کو سر سید احمد خان صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف تھا، جس کا ذکر دوسرے ''ملفوظات'' میں ہے، اور ان دونوں قسم کے ملفوظات میں درحقیقت کوئی ٹکراؤ نہیں، جس طرح مولانا سندھی صاحب کے متعلق دونوں قسم کے ملفوظات میں بھی درحقیقت کوئی ٹکراؤ نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ''ملفوظات'' میں ایک مقام پر ہے:

سید احمد بڑے حوصلے کا آدمی تھا، مگر انھوں نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر، اپنے آپ کو بدنام کیا، ورنہ ان کو تو لوگ دنیا کا تو ضرور ہی پیشوا بنا لیتے، بڑے محبّ قوم تھے۔

دین میں رخنہ اندازی کرنے کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے، اسی سے نقصان ہوا۔

ان کے حوصلے کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص لیفٹنٹ گورنر کے پاس گیا، اور یہ کہا کہ سرسید کا داماد ہوں، آپ مجھے کوئی جگہ دے دیجیے۔

لیفٹنٹ گورنر نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں، اور کبھی کبھی مجھ سے ملتے رہیں۔

اس کے بعد لیفٹنٹ گورنر نے سرسید احمد کو خفیہ تار دیا کہ ایک شخص جس کا یہ نام ہے، ہمارے پاس آیا ہے، اور یہ کہتا ہے۔

آپ اس میں کیا کہتے ہیں؟ سرسید احمد نے جواب دیا کہ واقعی وہ جیسے کہتا ہے، صحیح ہے، میرا ہی داماد ہے، آپ جس قدر اس کے ساتھ احسان کریں گے، وہ میرے ہی ساتھ ہوگا۔

اس جواب کے آنے کے بعد لیفٹنٹ گورنر نے اس کو نوکری دے دی۔

ایک دن باتوں باتوں میں لیفٹنٹ گورنر اس شخص سے کہنے لگا کہ ہم نے تمھارے خسر سرسید احمد سے یہ پوچھا تھا، انھوں نے یہ جواب دیا۔

یہ سن کر بہت پریشان ہوا، اور یہ چھٹی کا موقع دیکھتا رہا کہ جب چھٹی ملے، تو ان سے جا کر معذرت کروں۔

جب ان کو اتفاق سے چھٹی ملی تو سرسید احمد کے پاس گئے، اور قدموں میں گر گئے۔

سرسید احمد نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ میں وہی نالائق ہوں، جس نے لیفٹنٹ گورنر سے آپ کی نسبت ایسے ایسے کہا، میں کیا کروں میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا، اس مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا۔

سرسید احمد نے کہا کہ نہیں نہیں آپ گھبرایئے نہیں۔

داماد ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کوئی میری بیٹی ہوتی، اور وہ آپ سے منسوب ہوتی۔

اب یہ ہوسکتا ہے کہ جو آپ کی منکوحہ ہے، اسے میں بیٹی بنالوں، چنانچہ اس کی

منکوحہ کو بلایا، اور جہیز وغیرہ دے کر نہایت خوشی واحترام سے رخصت کیا۔

فرمایا کہ ایک رئیس پنجاب سے آرہے تھے، راستے میں علی گڑھ کا سٹیشن آیا، اور وہاں سرسید احمد بھی سوار ہوئے، گاڑی ہی میں ان رئیس صاحب کا ان سے تعارف ہوا، مختلف باتیں ہوتی رہیں، اسی میں انھوں نے پوچھا ''یہ کون سا سٹیشن ہے''؟ سرسید احمد نے کہا کہ علی گڑھ ہے۔

رئیس صاحب نے کہا کہ یہ وہ ہی علی گڑھ ہے، جس میں ایک سرسید احمد خبیث رہتا ہے، اس نے دین میں بڑی تخریب کی ہے، اور اس کے سوا بہت کچھ کہتا رہا۔

سرسید احمد نے کہا کہ یہ وہی علی گڑھ ہے، جس میں وہ خبیث رہتا ہے، اور وہ تو اس سے زیادہ بدتر ہے۔

پھر ان رئیس صاحب نے کھانا نکالا کہ آیئے کھانا کھا لیجیے، انھوں نے عذر کیا۔

جب انھوں نے اصرار کیا، تو سرسید احمد نے کہا کہ مجھے ایسا عذر ہے کہ اگر آپ کو خبر ہو جائے، تو آپ میرا اس گاڑی میں بیٹھنا بھی گوارا نہ کریں۔

انھوں نے کہا، خدانخواستہ ایسا کیوں ہونے لگا۔

کہا کہ میں وہی سرسید احمد ہوں، جس کی آپ تعریف کر رہے تھے۔

بس کیا تھا، یہ رئیس صاحب قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے، کس کم بخت نے آپ کو بدنام کیا ہے، آپ تو بڑے وسیع الاخلاق ہیں۔

بس پھر تو وہ مرید ہی ہو گیا۔

ہمارے حضرت نے فرمایا کہ یہ جو مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا، یہ غلط ہے، بلکہ بڑا دانش مند تھا، یہ سمجھتا تھا کہ انگریز برسر حکومت ہیں، ان سے بگاڑ کر کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے، ان سے مل کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک انگریز جو جج تھا، فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔

سرسید احمد بھی سٹیشن علی گڑھ پر سوار ہوئے، جو انگریز کو نا گوار ہوا۔

یہ کسی ضرورت سے گاڑی سے دور ہو گئے، تو اس نے اپنے خانساماں سے ان کا اسباب گاڑی سے باہر پھینکوا دیا، جب یہ آئے، تو وقت کے منتظر رہے، وہ اتفاق سے ہوٹل میں گیا۔

انھوں نے اپنے نوکر سے اپنا اسباب رکھوالیا، اور اس (انگریز) کا اسباب پھینکوا دیا۔

وہ (انگریز) آ کر بڑا خفا ہوا کہ یہ اسباب کس نے نکلوایا ہے۔

سرسید نے جواب دیا کہ جس کا تم نے نکلوایا تھا۔

جج نے کہا تم نہیں جانتے ہم کون ہیں۔

انھوں نے کہا کہ تم نہیں جانتے ہم کون ہیں۔

اس نے کہا ہم جج ہیں۔

سرسید احمد نے کہا کہ ہم جج کے باپ ہیں۔

انگریز نے کہا کہ گالی دیتے ہو؟

انھوں نے کہا کہ سید محمود ہائی کورٹ کا جج نہیں ہے، ہم اس کے باپ ہیں۔

پھر وہ انگریز معذرت کرنے لگا کہ اخاہ! سید صاحب ہیں۔

سرسید نے کہا تم لوگ بڑے بے حیا ہو، تہذیب کا دعویٰ کرتے ہو، اور تہذیب خاک بھی نہیں۔

فرمایا کہ ایک دفعہ سرسید احمد کا لڑکا ''حامد'' جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، سفر کر رہا تھا، اور ان کے کوئی دوست سب جج بھی اسی گاڑی میں دوسرے درجے میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔

سب جج صاحب فرسٹ کلاس میں بیٹھے تھے، اور اس میں ایک فوجی انگریز تھا،

بعض انگریز چونکہ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے ہیں، اسے برا معلوم ہوا، اور کمر لگا کر بیٹھ گیا، اور بید سے ان سب جج صاحب کو اشارہ کیا کہ (ہوں) یعنی پاؤں دباؤ۔

جب عذر کیا، تو بید لے کر کھڑا ہو گیا، چونکہ یہ (سب جج صاحب) بے چارے کمزور جسم کے تھے، مجبوراً پاؤں دبانے لگے۔

ایک سٹیشن آ گیا، تو گلاس ان کے ہاتھ میں دے دیا کہ لیمنڈ اور برف لاؤ۔

غرضِ کہ بے چارے کو خدمت گار بنالیا۔

برف گاڑی ڈھونڈتے پریشان پھرتے تھے، کہیں حامد کی بھی ان پر نظر پڑ گئی۔

اس نے آواز دی، انھوں نے پریشانی میں نہیں سنا۔

پھر مکرر کئی آوازوں پر وہ خود آئے، اور سب قصہ سنا۔

چونکہ حامد بڑا قوی ہیکل جوان تھا، اس نے کہا کہ تم اپنا ٹکٹ مجھے دو اور تم یہاں بیٹھو۔

یہ اس درجے میں پہنچے، انگریز نے دیکھا کہ اب کے یہ کیا بلا آئی۔

جب گاڑی چلی یہ بھی اسی طرح کمر لگا کر بیٹھے، اور اس انگریز کو بید سے اشارہ کیا کہ (ہوں) یعنی ہمارے پاؤں دباؤ۔

اس نے انکار کیا تو یہ بید لے کر کھڑے ہو گئے، وہ ان سے چونکہ کم زور تھا، اس لیے پاؤں دبانا پڑے۔

جب سٹیشن آیا، تو گلاس اس کے ہاتھ میں دیا کہ لیمنڈ اور برف لاؤ، پھر تو وہ جان بچا کر کسی تیسرے درجے میں جا کر چھپ گیا۔

ایسے ہی اس (سرسید احمد خان کے) خاندان کے بہت سے واقعات عجیب و غریب ہیں۔

یہ (سرسید احمد اور ان کے خاندان کے افراد) انگریزوں کو اچھا نہ سمجھتے تھے، مصلحت

کی بنا پر ان سے ملتے تھے کہ ان کی موافقت میں بہت مفاسد سے حفاظت ہے۔

اور اب تو اگر سو، راج ہوا، تو ہندوؤں کا ہوگا، اور مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوں گے، سب دیکھیں گے، (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۱، ص ۲۶۷ تا ۲۷۰، جدید ملفوظات، جمع کردہ: مولانا محمد نبیہ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ اشاعت: 2001)

مذکورہ ملفوظات میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے سر سید احمد خان اور ان کے بیٹوں اور خاندان کی اچھی صفات اور اچھے اخلاق کا ذکر فرمایا ہے، ساتھ ہی سر سید احمد خان کے دینی غیر معتدل افکار سے اختلاف کا اظہار بھی فرمایا ہے، نہ تو دینی اختلاف کی وجہ سے ان کی اچھی صفات و اخلاق کا انکار کیا، اور نہ اچھی صفات و اخلاق کی وجہ سے ان کے دینی غیر معتدل افکار سے اتفاق کیا۔

یہی عدل و انصاف ہے کہ جس میں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے:

(ایک سوال کے جواب میں) قادیانی کی بابت تو میں نے لکھا ''مبتلائے اوہام'' (یہ ملفوظ اس وقت کا ہے جب مرزا قادیانی نے ابھی نبوت وغیرہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا، 12 منہ از ہر) اور سید احمد خاں کی نسبت لکھا ''نادان دوست'' کہ لوگوں کی خیر خواہی تو کی، اس میں شک نہیں، لیکن اپنی نادانی سے لوگوں کو ضرر پہنچایا۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۳، ص ۸۶، ملفوظ نمبر: ۱۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر میں سر سید احمد خان کی حیثیت نادان دوست کی طرح تھی کہ وہ ہم درد اور خیر خواہ تو تھے، لیکن ہم درد اور خیر خواہ ہونے کے باوجود اپنی کم فہمی، یا نادانی کی وجہ سے لوگوں کو ضرر و نقصان پہنچانے کا سبب بنے، اور ضرر و نقصان دینی بھی ہو سکتا ہے، اور دنیاوی بھی۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے ''ملفوظات'' میں ایک مقام پر ہے:

سرسید کی نیت تو بری نہ تھی، مسلمانوں کا ہم درد، مگر عقل و دین کی کمی کی وجہ سے جو راہ مسلمانوں کی فلاح اور بہبودی کے لیے نکالی، وہ مضر ثابت ہوئی۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۲، ص ۲۴۸، انفاسِ عیسیٰ، حصہ دوم، بعنوان: سرسید کے متعلق حضرت والا کی رائے، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، اشاعتِ اول 1422ہجری)

بانیِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے بھی سرسید احمد خان صاحب کی نیت اچھی ہونے کے باوجود، ان کی عقل کے کافی نہ ہونے کا حکم لگایا ہے، ان کی خود سرسید احمد خان صاحب سے مکاتبت بھی ہوئی تھی، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اپنے ایک اور ملفوظ میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

آج کل اسی نیچریت نے لوگوں کو زیادہ بداعتقاد بنا دیا، ہر بات کو عقل پر جانچتے ہیں، بیچاری عقل بھی مخلوق ہی ہے، یہ کہاں تک تیر لگائے گی اور کیا خالق کے احکام کا احاطہ کرسکتی ہے، اس کا مبلغ پرواز ایک حد تک ہے، اس سے آگے وہ معطل ہے، احکام کے راز اسرار کو عقل سے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے، مثلاً جبر وقدر ہی کے مسئلہ کو دیکھ لیجئے، وہاں تک کسی کی عقل کی رسائی نہیں ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں خوض و بحث سے روک دیا ہے، کسی ایسے ہی مسئلہ کے متعلق کسی نے ایک بزرگ سے دریافت کیا تھا، کیا خوب فرمایا کہ۔ ع

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان، بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ وہ حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہیں، جو کچھ کرتے ہیں اسی میں بندہ کے لئے مصلحت ہوتی ہے (ملفوظات حکیم الامت، بسلسلہ: الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ" جلد۳، ص۲۹۹، ملفوظ نمبر: ۵۳۱، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: ۱۴۲۳ہجری)

اپنے ایک اور ملفوظ میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

www.idaraghufran.org

یہ سب انگریزی تعلیم اور نیچریت کی نحوست ہے کہ لوگوں کے عقائد، اعمال، صورت، سیرت سب بدل گئے، اور دین بالکل تباہ و برباد ہوگیا، ان کی رفتار، گفتار نشست و برخاست، خورد و نوش سب میں دہریت و نیچریت والحاد کا رنگ جھلکتا ہے، اور ہندوستان میں اس نیچریت کا بیج سرسید کا بویا ہوا ہے، جس وقت سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی، تو اپنے ایک مصاحب سے کہا کہ تم گنگوہ جاؤ، اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے بعد سلام مسنون میری جانب سے عرض کرو کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دن بدن تنزل کی طرف جارہی ہے، ان کے مقابل دوسری قومیں غیر مسلم ترقی کررہی ہیں، اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ایک کالج کی بنیاد انگریزی تعلیم کے لیے ڈالی ہے، اگر آپ بھی اس میں شرکت فرماویں، اور ہاتھ بٹائیں، تو بہت جلد کامیابی حاصل ہوجاوے۔

یہ مصاحب پیر جی محمد عارف صاحب انبیٹھہ والے تھے۔ [1]

یہ مصاحب گنگوہ حاضر ہوئے، حضرت سے عرض کیا کہ وہ سرسید کے بھیجے ہوئے ہیں، اور حضرت سے سرسید کا سلام اور پیام عرض کرنا چاہتے ہیں، حضرت نے اجازت دی، انھوں نے سرسید کا پیام حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے ایک کالج کی بنیاد ڈال رہا ہوں، اگر آپ بھی اس میں شرکت فرمالیں، اور ہاتھ بٹالیں، تو بہت جلد کامیابی کی صورت پیدا ہوجائے گی۔

حضرت نے پیام سن کر فرمایا کہ میری تو ساری عمر ''قال اللّٰہ و قال رسول اللّٰہ'' میں گزری ہے، مجھ کو ان چیزوں میں زیادہ تجربہ نہیں، ہاں مولانا محمد قاسم صاحب کو ان چیزوں میں زیادہ بصیرت ہے، ان سے اس کو بیان کیجیے، وہ اگر

---

[1] مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی جو مکاتبت اس سلسلے میں سرسید احمد خان صاحب سے ہوئی، اور وہ ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے شائع ہوئی، جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس میں بھی ''پیر جی محمد عارف صاحب'' کا ذکر ہے۔
محمد رضوان

www.idaraghufran.org

شرکت کو قبول فرمالیں گے، تو ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔

یہ بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے آ کر فرمایا کہ السلام علیکم یہ حضرت کی تشریف آوری اتفاقی تھی، پیر جی صاحب نے سرسید کا پیام ان کو پہنچایا، حضرت مولانا نے سن کر فرمایا کہ پیر جی صاحب تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک تو وہ شخص ہے کہ ''جس کی نیت تو اچھی ہے، مگر عقل نہیں'' اور ایک وہ شخص ہے کہ ''اس میں عقل ہے، مگر نیت اچھی نہیں'' اور ایک وہ شخص ہے کہ ''اس کی نہ نیت اچھی نہ عقل''۔

تو یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ''سرسید کی نیت اچھی نہیں'' کیا خبر ہے، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ''ان کو عقل کافی نہیں''، اس لیے کہ جس زینے سے وہ مسلمانوں کو معراجِ ترقی پر لے جانا چاہتا ہے، وہی سبب ان کے تنزل کا ہوگا، اور وہی سبب تباہی اور بربادی کا بنے گا۔

پیر جی صاحب نے عرض کیا کہ جس چیز کی کمی حضرت نے سرسید میں فرمائی ہے، اسی کو پورا کرنے کے لیے تو آپ حضرات کی شرکت کی ضرورت ہے، تاکہ یہ کمی پوری ہو کر کام انجام کو پہنچ جائے۔

یہ ایسا جواب تھا کہ غیر عارف اس کا جواب دے نہیں سکتا تھا، مگر حضرت مولانا نے فی البدیہہ فرمایا کہ جی ہاں یہ تو صحیح ہے، لیکن جس قسم کا بانی کسی چیز کی بنیاد ڈالتا ہے، اس کے جذبات اور نیت کے آثار اس چیز میں پیوست ہو جاتے ہیں، اور اس سے منفک نہیں ہوتے، اور اس شخص کے تعلق رہتے ہوئے اس بنا کی اصلاح صرف مشکل ہی نہیں، بلکہ عادتاً محال ہے، اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک تلخ درخت بویا جاوے، اور ایک بزرگ کو شربت کا مٹکا دے کر اس کی جڑ میں بٹھلا کر عرض کیا جائے کہ اس کو بیٹھے ہوئے اس شربت سے سینچا کرو، مگر جس وقت وہ

درخت برگ و بار پھول پھل لائے گا، سب تلخ ہوں گے، اسی طرح یہاں بھی، کسی عالم اور بزرگ کو شریک کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے، تب بھی یہ کمی پوری نہیں ہوسکتی، یہ ممکن ہے کہ خود شرکت کرنے والے میں اس کے الٹے آثار پیدا ہو جائیں۔

چنانچہ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں جب یہ لوگ علی گڑھ کالج کو ختم کرنے، اور بند کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ پہنچے، اور جلسہ قرار دیا، تو یہی کہا کہ یہ سب نقصانات اس کالج کی اور اس کی تعلیمات کی بدولت مسلمانوں کو پہنچے، اس نے ہندوستان میں انگریزیت، عیسائیت (اور) دہریت پھیلائی۔

یہ کہنے والے بڑے بڑے لیڈر مسلمان تھے، جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

میں نے سن کر کہا کہ یہ لوگ تو آج پچاس برس کے تجربے کے بعد اس بات کو سمجھے، اور ہمارے ایک مبصر یہی بات اس کی بنیاد پڑنے کے وقت کہہ گئے تھے کہ اس کے یہ نتائج ہوں گے۔

مبصر اور غیر مبصر میں یہی تو فرق ہوتا ہے، اس لیے ناقص کا کامل کو اپنے اوپر قیاس کرنا سخت جہل ہے۔

ایک شخص کی فراست اور عقل میں نور ہے، دوسرے میں نہیں اور وہ نور طاعت کا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت، بسلسلہ: الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ" جلد ۸، ص ۱۳۳، ۱۳۴، ملفوظ نمبر: ۱۳۶، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: صفر 1425 ہجری)

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے سرسید احمد خان صاحب کی نیت کو تو غلط یا خراب قرار دینے سے اجتناب کیا، لیکن "عقل کافی نہ ہونے" کا فیصلہ کرنے میں تامل نہ کیا۔

مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے متعلق ان کے دیرینہ رفیق و مصاحب حضرت مدنی نے بھی نیت درست ہونے اور مخلص قرار دینے کے ساتھ ساتھ عقل کے متاثر ہونے کا صاف

فیصلہ فرمایا ہے، جو عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

لیکن بعض حضرات کو سرسید صاحب کے متعلق تو مولانا نانوتوی اور حضرت تھانوی کا فیصلہ منظور ہے، کیونکہ ان کا شمار علمائے دیوبند میں نہیں ہوتا، مگر مولانا سندھی صاحب کے متعلق حضرت تھانوی اور حضرت مدنی کا فیصلہ منظور نہیں، کیونکہ ان کا شمار علمائے دیوبند میں ہوتا ہے، اور حضرت تھانوی کے بقول ''وہ مولویوں کے سرسید ہیں''

اس کو اگر کوئی بے جا تعصّب وتحزّب سے تعبیر کردے، تو اس میں کیا برائی ہے۔

حضرت تھانوی کے ملفوظات میں ہی ایک جگہ ہے کہ:

> ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ زیادہ تر سرسید ہی نے ہندوستان میں نیچریت کی بنیاد ڈالی تھی، گو اس سے پہلے بھی اس خیال کے لوگ تھے، مگر بہت کم، اس وقت یہ بات نہ تھی جو کالج علی گڑھ کی بنیاد پڑنے کے بعد پیدا ہوگئی اور اس وقت یہ علماء ہی پر الزام تھا کہ یہ سرسید کے اس فعل کو بری نظروں سے دیکھتے ہیں اور ترقی کے مانع ہیں، مگر اس تحریکِ خلافت کے بعد خود وہاں ہی کے تعلیم یافتہ جو آج کل بڑے لیڈر اور عقلا کہلاتے ہیں، ان سب نے یہ تسلیم کرلیا کہ یہ انگریزیت اور دہریت اور نیچریت اس علی گڑھ کالج کی بدولت ہندوستان میں پھیلی ہے، اسی کی بدولت لوگوں کے دین وایمان برباد ہوئے۔

اور یہ اس وقت کہا گیا، جب کہ وہاں پر ایک جلسہ قرار پایا تھا، اور اس میں حضرت مولانا دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا، ان مہربانوں نے اپنے اغراضِ دنیاوی کی وجہ سے حالتِ مرض میں بھی حضرت مولانا کو آرام نہیں کرنے دیا، حکومت اور جاہ کا ایسا بھوت گردن پر سوار ہوا تھا، اسی زمانے میں بعض ثقہ صورت حضرات کے نام سے بعض مضامین حضرت مولانا کی طرف نسبت کر کے شائع کیے گئے تھے، جس کی مولانا کو بھی خبر نہیں، اوپر ہی اوپر گھڑ مڑ کر حضرت کی طرف

منسوب کر کے شائع کر دیا گیا، جس کے جعلی ہونے کا اسی جماعت کے بعض حضرات نے بعد میں اقرار کیا۔ (ملاحظہ ہو: اشرف السوانح، باب بست و چہارم کا مضمون سادس)..... [1]

(سرسید احمد خان) نصوص اور احادیث کا انکار، حضور کی معراجِ جسمانی کا انکار (کرتے ہیں) اور کثرت سے خرافات ہانکتے ہیں، اس پر بھی معتقدین کہتے ہیں کہ (سرسید احمد خان) اسلام اور مسلمان کا خیر خواہ اور ہم درد تھا، نہ معلوم وہ خیر خواہی اور ہم دردی کون سی قسم کے مسلمانوں اور کون سے اسلام کی تھی۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۵ ص ۱۶۵ تا ۱۶۸، بسلسلہ: الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ" ملفوظ نمبر: ۱۶۶، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان) [2]

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے "ملفوظات" میں ایک مقام پر ہے:

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ سرسید احمد خاں کی وجہ سے بڑی گمراہی پھیلی، یہ "نیچریت" زینہ ہے، اور جڑ ہے "الحاد" کی، اس سے پھر شاخیں چلی ہیں، یہ قادیانی اس نیچریت ہی کا اول شکار ہوا، آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ استاد یعنی سرسید احمد سے بھی بازی لے گیا کہ نبوت کا مدعی بن بیٹھا، غلام احمد ایسا بچہ نہ تھا، قصداً ایسا کیا، شروع میں گو ممکن ہے کہ دھوکا ہو، لیکن آخر میں تو اپنی بات کی پچ اور اس پر ہٹ اور ضد ہو گئی تھی، غرضِ کہ ہے یہ، نیچریت ہی سے ناشی۔

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا، اور بنیاد پڑی، تو سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ کیا ہوگا، اور دو چار "قل اعوذ یے" بڑھ جائیں گے، یہ معلوم نہ تھا کہ تمھارے جادو کو موسیٰ علیہ السلام کی طرح "ھباء منثورا" کرنے والی

---

[1] ملاحظہ ہو: اشرف السوانح، ج ۳، صفحہ ۱۹۵، باب بست و چہارم، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سن طباعت: 1414 ہجری۔

[2] یعنی اپنے غلط افکار کی بنا پر ان کی ہم دردی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

جماعت یہی ہوگی۔

واقعی اگر ہندوستان میں حق تعالیٰ اس جماعت کو پیدا نہ فرماتے، تو چہار طرف سے الحاد اور دہریت کے چشمے ہندوستان میں ابل پڑتے، اور ابھی ابلنے میں کون سی کسر رہ گئی، لیکن قانونِ قدرت کے مطابق ''ہر فرعونے راموسیٰ'' کا مصداق یہ جماعت ہوگئی، جس کے متعلق مخبرِ صادق جناب رسول اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں ''**لا یزال طایفة من امتی منصورین علی الحق لا یضرهم من خذلهم**''۔ ورنہ ان کا مکر اور ان کی چالاکیاں ایسی تھیں، جیسے ارشاد ہے ''**وان کان مکرهم لتزول منه الجبال**''۔ (ملفوظات حکیم الامت، بسلسلہ: الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' جلد ۶، ص ۳۳۰، ۳۳۱، ملفوظ نمبر: ۳۸۱، ۳۸۲، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم 1424 ہجری)

حضرت تھانوی نے تو سرسید احمد خان اور مرزا غلام احمد قادیانی کو نیچریت وگمراہی میں مبتلا ہونے اور گمراہی پھیلنے کا سبب قرار دیا۔

لیکن اس کے برعکس مولانا سندھی صاحب ایک طرف تو خود اپنے کو نیچری قرار دینے اور سرسید کا ''مثنیٰ'' قرار دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور دوسری طرف سرسید احمد اور دیوبند کی تحریک کو ایک ہی فکر کے وارث قرار دیتے ہیں، اور ساتھ ہی مرزا قادیانی کے خلیفہ کی بھی تعریف وتوصیف فرماتے ہیں، جیسا کہ آگے آئے گا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ''اشرف السوانح'' میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب لکھتے ہیں:

''حضرت والا سرسید احمد خان مرحوم کے متعلق بھی فرمایا کرتے ہیں کہ ع

عیب می جملہ چو گفتی ہنرش نیز بگو

سرسید کو مسلمانوں کی دنیوی فلاح کی بہت ہی دھن تھی، اور اس معاملے میں بڑی دلسوزی تھی، کیا عجب ہے کہ اللہ اسی صفت پر فضل فرمادیں، اور اکثر موحوم کی اس

www.idaraghufran.org

صفت کے متعلق نیز بعض اکابر کے ساتھ مرحوم کے حسنِ عقیدت کے واقعات نقل فرمایا کرتے ہیں، اور فرمایا کرتے ہیں کہ سرسید کا عقیدہ توحید اور رسالت کے متعلق جس درجے کا بھی تھا، وہ نہایت پختہ اور بلاوسوسہ تھا، جیسا کہ ان کی تصانیف سے مجھ کو اندازہ ہوا، اور قرآن وحدیث میں انھوں نے جو جو تاویلات و توجیہات کی ہیں، ان کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکے گا، گو اس کا جو طرز انھوں نے اختیار کیا وہ غلط تھا۔

اس لیے میں ان کو نادان دوست کہا کرتا ہوں''۔ (اشرف السوانح، ج ۱، صفحہ ۱۳۲، باب دوازدہم ''لقائے بزرگان ودعائے بزرگان''، واقعات نمبر: ۲۸ تا ۳۰، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت تھانوی نے سرسید احمد خان صاحب کی اچھی صفات وخدمات کا اعتراف فرمایا، لیکن ان کے متعدد افکار سے اختلاف کیا، اور ان کو مخلص، مگر نادان دوست قرار دیا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ نادانی کا تعلق عقل سے ہے، مولانا قاسم نانوتوی، سرسید صاحب کی عقل کے ناکافی ہونے کا حکم لگاتے ہیں، مگر ان کو مخلص قرار دیتے ہیں، لیکن جب حضرت تھانوی اور حضرت مدنی وغیرہ یہی بات دوسرے الفاظ میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق فرماتے ہیں، تو سرسید صاحب کے متعلق اس فیصلے کو قبول کرنے والا ایک طبقہ مولانا سندھی کے متعلق اس کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار وآمادہ نہیں ہوتا۔

حضرت تھانوی نے ''امداد الفتاویٰ'' میں ایک رسالہ ''**رسالہ نموذج من معتقدات بعض اھل العوج ،معہ جدول معتقدات** '' کے اندر، سرسید احمد خان صاحب کے افکار کا بھی مفصل ذکر فرمایا ہے، جس کے شروع میں، فرماتے ہیں:

بعد حمد وصلاۃ عرض ہے کہ ۱۹۰۷ء میں ایک مصلحتِ دینیہ سے، بعض خیر خواہانِ اسلام کی فرمائش پر کچھ عقائدِ زائغہ ''تفسیر القرآن'' مصنفہ: سرسید سے بہت ہی معمولی وسرسری نظر سے، بطور نمونہ کے زبان فارسی میں ایک جدول کی شکل میں

www.idaraghufran.org

جمع کئے گئے تھے، جس کا مسودہ یادداشت کے کاغذات میں محفوظ رہا، اب بعض احباب کی یہ رائے ہوئی کہ اس کی اشاعت، دوسروں کے لئے نافع ہوگی اور اس کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ اگر ساتھ ساتھ ان معتقدات کی وجہِ بطلان کا بھی ذکر ہوجاوے، تو مزید فائدہ کی صورت ہے، اگرچہ اس کی دو وجہ سے ضرورت نہیں تھی۔

ایک تو یہ کہ اصلی غرض اس نمونہ سے مسلمانوں کو یہ معتقدات دکھلا کر ان معتقدات والوں سے بچانا تھا، سو اس کے لئے وجہِ بطلان ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔

دوسرے یہ کہ یہ عقائد بہت ہی ظاہر البطلان ہیں کہ جمہور اہلِ اسلام ان کو سنتے ہی بطلان کا حکم ذہن میں کرتے ہیں۔

مگر مزید فائدہ کے لئے یہ مشورہ قبول کیا گیا اور ہر چند کہ مشورہ تو مفصل تقریرِ بطلان کا دیا گیا تھا، مگر کچھ کم ہمتی، کچھ کم فرصتی، کچھ دوسرے مفصل تحریرات ورسائل کا جو پہلے سے موجود وشائع ہیں، مغنی ہونا، یہ سب اسباب اس مشورہ پر عمل نہ کرسکنے کے ہوئے؛ اس لئے صرف ہیئتِ سابقہ میں اس سے زیادہ تغیر نہ ہوسکا کہ جدول مذکور میں ایک خانہ بڑھا کر مجملاً وجہِ بطلان، یا نشانِ مقامِ رسالہ ''برہان'' مولفہ: حضرت مولانا محمد علی صاحب بچھرایونی رحمۃ اللہ علیہ کا (جو تفسیر مذکور کے جواب میں ہر طرح بے نظیر ہے اور گو بظاہر وہ تین جلدوں میں ایک ہی جلد کا جواب ہے، لیکن واقع میں اپنے مباحثِ کلیہ سے تمامتر تفسیر کا جواب ہے) کہ جس مقام پر کسی خاص مضمون کا رد ہے، ذکر کردیا کہ اس نشان سے اس مقام کو دیکھ کر مفصل رد پر مطلع ہوسکتے ہیں اور وہ بطلان مجمل بھی بوجہ نہایت مشہور وبیّن ہونے کے قائم مقام، وجہِ مفصل ہی کے ہے۔

پس اس طور پر وہ خانہ زائدہ تمامتر رد کے لئے کافل وکافی ہے اور چونکہ یہ جدول

اصل سے زبان فارسی میں تھی، اور رنگ (نیرنگی۔ناقل) زمانہ سے فارسی خواندہ مسلمانوں کی عام زبان نہیں رہی ہے، اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جدول کا اردو میں ترجمہ کردیا جاتا، تاکہ فائدہ عامہ ہو، مگر یہ نظر کرکے کہ یہ فائدہ عامہ، دوسرے طریق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے، اصل کو فنا کردینا کچھ ناگوار ہوا، اور اصل کی بقاء کے ساتھ ترجمہ طول کا سبب تھا؛ اس لئے فائدہ عامہ کے لئے، دوسرا یہ طریق اختیار کیا گیا کہ بعد اس جدول فارسی کے کتاب برہان مذکور بالا کی تینوں جلدوں کے مضامین کی فہرست جو کہ اردو زبان میں ہے، مع قید صفحہ کے نقل کردی گئی کہ فہرست تو مثل اصل جدول مذکور کے، ان معتقدات کے بتلانے کا کام دے گی اور نشانِ صفحہ، اس خانہ زائدہ کا کام دے گا، کیوں کہ وہی صفحہ نکال کر ہر شخص اس عقیدہ کی مفصل وجہِ رد پر مطلع ہوسکتا ہے اور علاوہ تفسیر کے پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' میں بعض معتقدات ہیں، ان کا جواب معلوم کرنے کے لئے پرچہ ''نورالآفاق'' جو کہ مطبع نظامی کانپور میں زمانہ شیوع ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپا کرتا تھا، کافی شافی ہے، اس کے بعض مضامین کا پتہ ''امدادالفتاوی جلد دوم باب اصلاح الفلسفۃ الجدیدۃ'' سے چل سکتا ہے۔

(امدادالفتاویٰ، مبوب، ج۶، ص۲۷۱، و۲۷۲، رسالہ نموذج من معتقدات بعض اہل العوج، معہ جدول معتقدات، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید 2010ء)

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب ''مشکلاتُ القرآن'' کے مقدمہ ''یتیمۃُ البیان'' میں فرماتے ہیں:

**ولما جری ذکر تفسیر السار سید احمد خان الدهلوی لکان من المداهنة المذهبية والنفاق الجلی لو لم یکشف عن امر هذا الرجل وتفسیره فانه اصبح زعیما وقدوة لکثیر من اهل الاهواء من المتنورین الذین اظلم علیهم سبیل الملة الحنفیة البیضاء وهو**

رجل زنديق ملحد او جاهل ضال اراد الوصول الى الحق فأخطأ الطريق السوى وأناط الامر فى امور الشريعة وشعائر الدين على عقله السخيف الزائغ فضل واضل وكان دأبه ان كل ما يرد من اهل اوربا من الاعتراضات السخيفة على الملة الاسلامية كان يسلمه و يقبله ثم طفق يتأول القرآن والسنة وأخذ يقرب الاسلام الى الكفر حتى يجعلهما دينا واحدا وكانه اراد التقرب به الى اهل الكفر الذين كانت بأيديهم الحكومة فى الهند فانكر وجود الملائكة وقال انها القوى الملكية للخير فى فطرة الانسان وجبلته وليس عالما مستقلا خارجا عن وجود الانسان بل هى صفات مضمة اليه وانكر الشياطين وقال هى قوى الشر المودعة فى فطرة الانسان وانكر الحشر والمعاد الجسمانى بل اثبت الروحانى فقط كملاحدة الفلاسفة وانكر السماوات وانكر الارواح اوانكر النبوة الشرعية التى هى موهبة الهية ختمت لسيدنا خاتم الانبياء محمد صلى الله عليه وسلم وزعم انها امر يحصل بالكسب وبدل صفاتها وغير أماراتها وسوى بين النبى وبين كل من قام مصلحا فى ملة من الملل ايما كان وانكر الخوارق الصادرة من الانبياء بامر الله القدير وقال ان الخوارق غير مقدورة لله تعالىٰ وكانه أبطل التكليف والتشريع وتأوّل فى سائر الضروريات الدينية القطعية والنصوص الصريحة الصحيحة القطعية دلالة وثبوتاً حتى قال فى خطبة القاها فى بلدة "ميرتھ" ان الاسلام فوض الينا امور الدنيا فنعمل فيها ما نشا حيث ورد "انتم اعلم

بامور دنیاکم منی" الحدیث، واما امر الدین فوسع فیه علینا حیث ورد "من قال لا الٰه الا الله دخل الجنة و ان زنیٰ و ان سرق" الحدیث، فهذه کانت عبده زبدة الشریعة و خلاصته و صار کالقرامطة الباطنیة والاسماعیلیة و المزدکیة والاخشونیة و غیرهم من اخوانه الملحدین والزنادقة المتاولین فی ضروریات الدین و کان هو تلمیذهم الروحانی اخذ عنهم ثم زعم کانه اخترعها و سوّل له الشیطان امره فتأول نصوص القرآن والحدیث بتأویلات سخیفة رکیکة تعافها الطبائع السلیمة و تمجّها الاسماع الصحیحة لا یتأول بمثلها کلام عاقل فکیف بکلام بلیغ و کیف بکلام الله المعجز بلاغة و فصاحة و کیف بکلام من اوتی جوامع الکلم و قد اعمی الله بصیرته فکان لا یعلم هل لتلک التاویلات مساغ فی العربیة نعم ارخی عداء الدین علی بصره سدول الجهل البین العوار و من لم یجعل الله نورا فماله من نور و زعم انها خدمة الدین و به یتحد الکفرة والمسلمون فهکذا حرف القرآن و مسخ الدین و شوّه وجه الشریعة المطهرة و الف علی هذه الاصول الموضوعة تفسیراً سماه تفسیر القرآن بالاردویة و حق ان یسمی بتحریف القرآن

(یتیمةُ البیان فی شئ من علوم القرآن، ص ۵۴ الی ۵۶، الناشر: مجلس الدعوة التحقیق الاسلامی بکراتشی، باکستان، الطبعة الثالثة 1416ھ، 1995م)

ترجمہ: چونکہ سرسید احمد خان کی تفسیر کے متعلق تذکرہ چلا، اس لئے اگر ان کی شخصیت اور ان کی تحریر کردہ تفسیر کے متعلق وضاحت نہ کی جائے تو یہ مذہبی

مداہنت اور عملی نفاق ہوگا، اس لئے کہ وہ بہت سے ایسے نفسانیت پسند روشن خیال لوگوں کے رہبر ورہنما ہیں، جن کے لیے ان کی کج روی کی بنا پر ملتِ اسلامیہ کی سیدھی اور ستھری راہ تاریک ہوگئی ہے، سرسید احمد خان زندقہ والحاد کے مرتکب شخص تھے، یا پھر جہالت وگمراہی میں ملوث، حق کی جانب راہ روی کے خواستگار تھے، لیکن سیدھی راہ ان سے خطا ہوگئی، انہوں نے شرعی معاملات اور شعائرِ دین سے متعلق اپنی ناکارہ عقل کو کسوٹی ٹھہرایا، جس کی بنا پر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کا طرز وطریقہ یہ تھا کہ اہلِ یورپ واہلِ مغرب، ملتِ اسلامیہ پر جو بیکار اعتراضات کیا کرتے تھے، موصوف ان کو قبول کرتے تھے، پھر قرآن و سنت میں تاویلات کرتے تھے، اور اسلام کو کفر کے قریب کر کے دونوں کو ایک ہی دین بتلاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف یہ تمام تر تاویلات اس لئے کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ ان کافروں کے دربار میں جن کے ہاتھ میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور تھی تقرب اور شرفِ باریابی حاصل کرسکیں۔

چنانچہ انہوں نے فرشتوں کا انکار کیا اور کہا کہ: ملائکہ خیر کے فطری ملکہ کا نام ہے جو انسانی فطرت وجبلت میں ودیعت ہے، یہ کوئی مستقل عالم (مخلوق) سے عبارت نہیں جو وجود انسانی سے کوئی خارج شئی شمار کیا جائے، بلکہ یہ ان صفات میں سے ہے جو انسان کے اندر ہی موجود ہیں۔

اسی طرح شیطان کا بھی انکار کیا اور کہا کہ: شیطان اس شر کے ملکہ سے عبارت ہے جو فطرتِ انسانی کا حصہ ہے، اسی طرح حشر اور معاد جسمانی کا انکار کیا، بلکہ ملحد فلاسفہ کی طرح صرف معاد روحانی کا قائل ومعتقد ہوا اور اسی طرح آسمانوں اور ارواح کے وجود کا بھی منکر ہوا۔

موصوف شرعی نبوت جو خدائی عطیہ ونوازش ہے کے بھی منکر تھے، جو نبوت حضرت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر تمام ہوئی، وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ: یہ نبوت کسبی ہوتی ہے، انہوں نے نبوت کی صفات وعلامات میں تحریف وتبدل سے کام لیا، نبی اور کسی بھی امت کے عام مصلح کو برابر قرار دیا، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، اسی طرح ان معجزات کا بھی انکار کیا جو انبیاء کرام کے ہاتھوں سے خداوندِ کریم وقدیر کی قدرت سے ظاہر ہوئے کہتے ہیں کہ: خوارق کا ظہور خداوند کریم کے دستِ قدرت سے بالاتر ہے، گویا کہ موصوف نے تکلیف وتشریع کی بنیاد ہی کو باطل قرار دیا، بلکہ تمام قطعی ضروریات دین اور صریح صحیح قطعی نصوص کی بھی تاویلات کیں، جن کی قطعیت دلالت وثبوت کے اعتبار سے مسلّم ومتفق ہے، حتی کہ میرٹھ کے ایک خطاب میں کہنے لگے کہ: دنیوی معاملات تو خود اسلام نے ہمارے سپرد کر رکھے ہیں کہ جس طرح چاہیں جیسے چاہیں ان کے متعلق تصرف کریں، اس لئے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے کہ: ''**أنتم أعلم بأمور دنیاکم منی**'' تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو، جہاں تک دینی معاملے کا تعلق ہے تو اس میں خوب وسعت وکشائش رکھی گئی ہے، فرمایا گیا کہ: ''**من قال : لا اله الا الله دخل الجنة وان زنی وان سرق**'' جس شخص نے کہا کہ: خدائے برحق کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں گویا داخل ہوگیا، اگرچہ زنا یا چوری کا مرتکب ہو۔

موصوف کے نزدیک ساری شریعتِ اسلامی کا یہی خلاصہ اور نچوڑ ہے، چنانچہ وہ قرامطہ باطنیہ، اسماعیلیہ، مزدکیہ، اخشونیہ جیسے ملحد زنادقہ کے گروہ میں شامل ہوگئے، جنہوں نے قطعی ضروریات دین میں دور از کار تاویلات کردیں، بلکہ موصوف ان کے روحانی شاگرد معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے ہی افکار کو اخذ فرما کر یہ گمان کر بیٹھے کہ خود ان نظریات کے موجد ہیں، شیطان نے انہیں ان گمراہ راستوں کو مزین

دکھلایا تو انہوں نے نصوصِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں ایسی نکمی اور بیکار تاویلات کیں، جن سے طبائع سلیمہ کراہت محسوس کرتی ہیں اور سماعتِ صحیحہ مسترد کر دیتی ہے، اس طرح کی تاویلات تو ایک عقلمند شخص کے کلام کی بھی نہیں کی جاسکتیں، چہ جائیکہ خدائے پاک کے بلیغ و فصیح اور معجز کلام میں ایسی نکمی تاویلات کو راہ دی جائے یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جنھیں جامع کلمات کی گویائی سے سرفراز فرمایا گیا، کے کلام کی ایسی بھونڈی تاویلات زیرِ غور لائی جائیں۔

دراصل خدائے پاک نے موصوف کی خرد و بصیرت کو اندھا فرما دیا تھا، جس کی بنا پر وہ اتنی تمیز بھی نہ کر سکے کہ آیا ان تاویلات کی من حیث العربیۃ قرآن وسنت کے کلمات میں گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اعدائے دین اور دشمنان ملت نے واضح جہالت کے پردے ان کی آنکھوں پر ڈال دیے تھے اور جس کو خدا نور سے نہ نوازے، واقعۃً وہ نورِ فہم و فراست سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتا۔

ستم برآں! کہ ان تاویلات کو وہ دین کی خدمت خیال کرتے تھے اور تاویلات کے ذریعے کافروں اور مسلمانوں کو ایک مذہب کے پیرو بتلاتے تھے۔

اس طرح کی تاویلات سے موصوف نے قرآن پاک میں تحریف کی اور دین اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا اور شریعت مطہرہ کے ستھرے خدوخال کو بدصورت و بدنما کر دیا، انہیں فاسد تاویلات کی بنیاد پر موصوف نے ''تفسیر القرآن'' کے نام سے اردو میں تفسیر تالیف کی، یہ تفسیر ''تفسیر القرآن'' کے بجائے ''تحریف القرآن'' کہلائے جانے کی مستحق ہے (یتیمۃ البیان)

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب مزید فرماتے ہیں:

**ثم لم یقتنع بھذا القدر بل بثّ الحادہ فی تفسیر و سائر مولفاتہ و**

خطبه، غير أن الله وعد صيانة الدين الى حين، و جرت سنته فى عباده لم يخل زمان من اهل الحق القائمين بامر الدين، و من المثل: لكل فرعون موسىٰ، و لكل خرق راقع، أقام لدمغ كفره و الحاده، و تطهير الدين من خبائثه و أنجاسه، الفاضل الحبر مولانا أبا محمد عبدالحق الدهلوى مسكناً والديوبندى تعلماً و تلمذةً المعروف "بالحقانى" فأبلغ فى الرد عليه قلماً و لساناً، و وضع جمر الخضا فى ضلوعه و جوائحه، أباد ما سنح له من بوارحه و سوانحه، و هكذا يقيم الله لمكامعة الفئة الضالة رجالاً حلب الدهر أشطرهم محنكين مدربين، يعرفون دسائسهم ووساوسهم، و يحسون رذائلهم و خسائسهم فيميزون من الطيب خبثهم و خبائثهم.

وبالجملة: فصنف هذا الفاضل تفسيراً فى الرد عليه و سماه "فتح المنان" و قد نفع الله به الامة، وله كتاب مبسوط كالمقدمة لتفسيره فى استيصال شأفة الحاده والرد على اصوله الزائغة و سماه: "البيان فى علوم القرآن" و قد ترجم الى الانكليزية فشرق و غرب (يتيمةُ البيان فى شئ من علوم القرآن، ص ٥٦، ٥٧، الناشر: مجلس الدعوة التحقيق الاسلامى بكراتشى، باكستان، الطبعة الثالثة 1416هـ، 1995م)

ترجمہ: پھران کی یہ تحریفات یہاں تک ہی منحصر نہ رہیں، بلکہ اس الحاد وزندقہ آمیز تاویلات کوانہوں نے تفسیر اور دیگر تالیفات وخطبات میں خوب پھیلایا، لیکن خدائے پاک نے قیامت تک کا اپنے دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور اپنے بندوں میں اس کی سنت وطریق یہ رہا ہے کہ کوئی بھی دور دینی معاملات کے

محافظین اہلِ حق سے خالی نہیں رہا۔

مشہور ضرب المثل ہے کہ: ''لکلّ فرعون موسیٰ، ولکلّ خرق راقع ''یعنی ہر فرعون کے لیے موسیٰ ہوتا ہے، اور ہر پھٹن کے واسطے رفو گر بھی ہوتا ہے، چنانچہ اس کے کفر والحاد کو مٹانے اور اس کے باطنی گندونجاست سے دین کو پاک وصاف کرنے کے لیے خدائے پاک نے مولانا ابو محمد عبدالحق کو منتخب فرمایا، جو دہلی کے رہنے والے اور دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے، حقانی کے لقب سے ملقب تھے، چنانچہ انہوں نے تحریر وتقریر کے ہر دو راستوں سے ان کی خوب تردید کی، اور جلتا انگارہ اس کے پہلو میں رکھ دیا، اور موصوف نے نیک وبد فال کے جو گھونسلے بنا رکھے تھے، وہ اجاڑ دیئے۔

اسی طرح خدائے پاک! گمراہ گروہوں کی سرکوبی کے لیے ایسے جہاندیدہ، صاحبِ بصیرت، تجربہ کار لوگوں کو کھڑا کر دیتے ہیں جو ان (منحرفین) کی دسیسہ کاریوں اور آشفتہ دماغیوں سے واقف ہوتے ہیں اور ان کے افکار کے کھوٹے وردی سکوں کی پرکھ رکھتے ہیں، چنانچہ کھرے کھوٹے کو وہ الگ الگ کر لیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ محترم مولانا عبدالحق نے ''فتح المنان '' کے نام سے سرسید کی تفسیر پر رد تحریر فرمایا، اور امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کو خوب نفع مند فرمایا، انہی فاضل مولف کی ایک مبسوط کتاب بھی ہے، جو گویا ان کی تفسیر کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں فاضل مولف نے سرسید کے الحاد کو بیخ وبن سے اکھیڑا ہے، اور اس کے باطل اصولوں کی تردید کی ہے، اس کتاب کا نام ''البیان فی علوم القرآن'' ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا، جو مشرق ومغرب میں پڑھی گئی (یتیمۃ البیان)

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی سرسید احمد خان صاحب سے بعض افکار

www.idaraghufran.org

میں مکاتبت ہوئی تھی، جو ''تصفیۃُ العقائد'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''سیّد صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا، ہم سے جب ہی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوالِ مشہورہ سے رجوع کریں، جو ان کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے، اور سیّد صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں، اور رجوع نہیں فرماتے۔ (اسی مکتوب میں چند سطروں کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی فرماتے ہیں)

ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندیٔ اہلِ اسلام کا معتقد ہوں، اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں، تو بجا ہے، مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سن کر اُن کا شاکی اور اُن کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں''۔ (تصفیۃُ العقائد، ص ۵، ۶، باہتمام مولوی محمد اسحاق صاحب، مدیر کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، ضلع سہارن پور)

ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے کتنے عدل وانصاف کے ساتھ سرسید احمد خان صاحب کے اقوالِ مشہورہ سے برملا اختلاف فرمایا، لیکن ان کی ہمت اور اہلِ اسلام کے ساتھ دردمندی کے جذبہ کی قدر بھی کی، اور اس کی عقیدت کا بھی اظہار کیا، اور اس کے باعث اظہارِ محبت کو بھی بجا قرار دیا، لیکن اسی درجے میں بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے افکارِ فاسدہ پر شکایت اور رنج کا اظہار بھی کیا، جو اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے بغض کی اعلیٰ مثال ہے، جس کا اعتراف خود سرسید احمد خان صاحب نے بھی کیا، اور اس کو مولانا سندھی صاحب کے شاگردِ خاص پروفیسر محمد سرور صاحب نے نقل کیا، جس میں سرسید احمد خان صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت قابلِ ملاحظہ ہے:

ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور

افعال جس قدر تھے، بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے، اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لیے تھا، اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے، مسئلہ ''حُب لِلّٰہ'' اور ''بُغض لِلّٰہ'' خاص، ان کے برتاؤ میں تھا، ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی ہی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل میں ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے، اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ ''مقالاتِ سرسید، حصہ ہفتم''۔ (افادات وملفوظات ص ۳۲۰، ۳۲۱، بعنوان: سرسید احمد خاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ (جامعہ حقانیہ، ساہیوال، سرگودھا) نے ایک مضمون ''سرسید احمد خان، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر میں'' تحریر فرمایا ہے، جو ماہنامہ ''البلاغ، کراچی'' کے شمارہ، مارچ 1987 عیسوی میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی فراخ حوصلگی اور وسعتِ قلبی سے اپنے مرتبے اور مقام کے موافق سرسید احمد خان کے خلوص، استغناء اور تحمل وحوصلہ مندی، مسلمانوں کی فلاح وبہبودی کی فکر جیسے اوصافِ ذاتیہ کا جابجا تذکرہ فرمایا ہے، مگر ان صفات کے تذکرہ فرمانے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ حضرت حکیم الامت کی نظر میں سرسید احمد خان کوئی بہت ہی بڑی عظیم شخصیت ہیں، یا یہ کہ ان کے عقائد واعمال میں کوئی بات بھی غلط اور واجبُ الاصلاح نہ تھی (ماہنامہ ''البلاغ، دارالعلوم کراچی'' صفحہ ۴۸، مارچ 1987 عیسوی، رجب 1407 ہجری)

مزید لکھتے ہیں:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے سرسید پر نہ تو کبھی ذاتی حملے کیے، نہ ہی ان کو کافر بتلا کر واجبُ القتل قرار دیا، بلکہ ان کے خلوص اور استغناء، حوصلہ مندی، اور ملی ہم دردی کی تعریف فرمائی ہے، مگر ان اچھی صفات کے ساتھ متّصف ہونے کے باوجود ان کے عقائدِ زائغہ اور خیالاتِ فاسدہ کی وجہ سے اعلیٰ درجے کا گمراہ اور مبتدع بھی بتلایا ہے (ایضاً، صفحہ ۴۹)

مذکورہ اور اس جیسی عبارات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خان صاحب اور اکابرِ دیوبند میں اختلاف کس نوعیت کا اور کتنی سنجیدگی اور ایک دوسرے کے شخصی احترام واکرام پر مشتمل اور مبنی تھا، جو موجودہ دور کے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

لیکن افسوس کہ سرسید احمد خان صاحب کے اخلاق و صفات کے اعتراف اور ان کے متعدد افکار سے اختلاف کرنے والے متعدد حضرات کو سرسید احمد خان صاحب کے متعلق بانی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے بیان کردہ اسی علت اور وجہ کے موجود ہوتے ہوئے، مولانا سندھی صاحب کے حق میں اقوالِ مشہورہ اور افکارِ فاسدہ اور اخلاق وصفات کا یہ حکم گوارا وتسلیم نہیں۔

اب سرسید احمد خان صاحب اور تحریکِ علی گڑھ سے، اہلِ علم، بالخصوص اہلِ دیوبند کے اختلاف کی نوعیت سے متعلق مزید چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا شبلی نعمانی صاحب کے متعلق خیال یہ کیا جاتا ہے کہ وہ سرسید احمد خان کے افکار کے حامل تھے، لیکن ہمیں اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی صاحب کی تحریر میں اس کی تردید دستیاب ہوئی، چنانچہ مولانا شبلی نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا، اور میں ان کے بہت سے عقائد وخیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھ کو انکار نہ ہوسکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے، کوئی اور شخص

ادا نہیں کرسکتا۔ (مقالاتِ شبلی، ج۲ص۶۴ ''بعنوان'' سرسید احمد اور اردو لٹریچر، مطبوعہ، معارف، اعظم گڑھ، تاریخِ طبع: 1931 عیسوی)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''سرسید کے قائم کردہ سکول کی ایک خوبی ضرور تھی کہ وہ مسلمان کے زیرِ انتظام تھا، لیکن یہاں کا نظامِ تعلیم وہی تھا، جو لارڈ میکالے نے دیا تھا، اور یہاں وہ سوچ تیار ہوئی، جو ایک غلام قوم کی سوچ ہوا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس زمانے کے بزرگوں نے سرکاری سکولوں میں بچوں کو بھیجنے کی مخالفت کی۔

ان کا خیال یہ تھا کہ سکولوں میں جا کر عصری تعلیم تو حاصل ہوجائے گی، اور ملازمتیں بھی مل سکتی ہیں، لیکن اس سے دین چلے جانے کا اندیشہ ہے، حالانکہ ایمان زیادہ قیمتی ہے۔

اس کی وجہ سے لوگوں نے جھوٹا پروپیگنڈا یہ کیا کہ علمائے دین عصری تعلیم کے خلاف ہیں۔

یہ بات بالکل غلط ہے۔

علمائے دین نے دنیاوی علوم کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

وقت کے عصری علوم ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے تھے۔ (اصلاحی خطبات جلد نمبر۴، ص۱۷۴)

اس سے معلوم ہوا کہ سرسید احمد خان صاحب کے اخلاق اچھے تھے، مگر عقائد میں بگاڑ تھا، اور ان کے طرزِ عمل کا اثر ان کے تعلیمی سلسلے میں بھی آیا، جس کی وجہ سے اہلِ علم نے اختلاف کیا، اہلِ علم حضرات کا اختلاف نفسِ عصری علوم اور بالخصوص انگریزی تعلیم کی وجہ سے نہیں تھا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب (اسسٹنٹ پروفیسر: شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل

کالج، لاہور) اپنے مضمون ''سرسید، شبلی اور مغرب'' میں لکھتے ہیں:

سرسید احمد خان نہایت نیک نیتی کے ساتھ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں، مغربیت کی راہ اپنائیں، اور انگریزوں کے وفادار رعایا بن کر رہیں، بہ الفاظِ مولانا سید سلیمان، سرسید چاہتے تھے کہ:

''مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں''۔

برطانوی حکومت کا باقی رہنا اور اس کا مستحکم ہونا، سرسید کے پرخلوص رائے میں مسلمانوں کے لیے مفید اور سودمند تھا، اس ذہنی روِش نے قدرتی طور پر سرسید کو عقل پرست بنا دیا، انہوں نے عقلی نقطۂ نظر سے مذہب کی تعبیر و تفسیر کا بیڑا اٹھایا، ان کا خیال تھا کہ مذہب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، یوں سیاسی فکر اور مذہبی تفسیر، دونوں اعتبار سے وہ مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو گئے، سرسید کا یہ رویہ ذہنی اعتبار سے مغرب کے سامنے مکمل ہتھیار ڈالنے (Complete Surrender) کی حیثیت رکھتا ہے (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، انڈیا، صفحہ ۳۷، ذوالحجہ 1409 ہجری، جولائی 1989 عیسوی، جلد نمبر 144، شمارہ نمبر 1)

مشہور مؤرخ جناب شیخ محمد اکرام صاحب ''موجِ کوثر'' میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے، بلکہ اس لیے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا، اور سرسید اپنی کتب اور ''تہذیب الاخلاق'' میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، جنھیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے، علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں، وہ مسلمان نہیں (بشرطیکہ کفر سے بچانے والی کوئی موثر تاویل نہ کرے۔ از ناقل محمد رضوان) اور جو

www.idaraghufran.org

مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے، اس کی اعانت جائز نہیں، شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے، جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتب میں کر رہے تھے، سرسید نے ایسا نہیں کیا، لیکن ان کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوئی تھیں، جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے''۔ (موجِ کوثر، ص۹۱، بعنوان: علی گڑھ، سرسید کی مخالفت، مطبوعہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سنِ طباعت: جون 2003ء)

اس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ کی تعلیم سے اہلِ علم حضرات کو نفسِ انگریزی زبان ہونے کی وجہ سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ سرسید احمد خان صاحب کے مخصوص افکار اور اس وقت کے مخصوص نظام و نصاب کی وجہ سے اختلاف تھا۔ [1]

جناب شیخ محمد اکرام صاحب ''موجِ کوثر'' میں ہی لکھتے ہیں:

''ان (سرسید) کے بعض عقائد اور خیالات سے اختلاف کرنا آسان ہے، لیکن انھیں مذہبِ اسلام اور بانیٔ اسلام سے جو محبت تھی، اس کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے''۔ (موجِ کوثر، ص۱۰۷، بعنوان: علی گڑھ، سرسید کا کردار، مطبوعہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سنِ طباعت: جون 2003ء)

نیز جناب شیخ محمد اکرام صاحب ''موجِ کوثر'' میں ہی لکھتے ہیں:

''علمائے دیوبند اور اربابِ علی گڑھ کے خیالات اور طریق کار میں جو اختلاف تھا،

---

[1] امداد الفتاویٰ میں ہے:
انگریزی، ایسے ہی ہندی منجملہ لغات یعنی زبانوں کے ایک زبان ہے اور زبان فی نفسہٖ کوئی قبیح نہیں، بلکہ نعم خداوندی سے ایک نعمت ہے.....
البتہ کبھی بعض عوارض کی وجہ سے قبیح لغیرہ ہو جاتی ہے پس اگر وہ عوارض نہ ہوں صرف کسی مصلحت دینی مثل رد نصاریٰ ہنود یا دنیوی مثل کسب معاش وغیرہ کے لیے سیکھے تو جائز ہے۔ (امداد الفتاوی، ج۶ ص۱۸۵، بقیہ کتاب العقائد والکلام، بعنوان: حکم تعلیم انگریزی وغیرہ بعد خواندن قرآن وضروریات دین ونماز خواندن پس انگریزی خواں، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، سنِ طباعت: ۱۳۹۳ ہجری)

www.idaraghufran.org

اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، سرسید کی زندگی ہی میں ان کے بعض عقائد کے خلاف مولانا محمد قاسم نانوتوی سرپرست مدرسۃ العلوم دیوبند نے رسائل لکھے، اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے لوگوں کو ان کے ساتھ مل کر کام کرنے سے منع کیا، لیکن اس اختلاف کے باوجود علمائے دیوبند نے علی گڑھ کی مخالفت اوچھے ہتھیاروں سے نہیں کی اور اعتدال اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا''۔ (موجِ کوثر، ص ۲۱۲، بعنوان: علی گڑھ تحریک کے خلاف ردِّ عمل، اکبر الٰہ آبادی، مطبوعہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سنِ طباعت: جون 2003ء)

جناب شیخ محمد اکرام صاحب مزید لکھتے ہیں:

''علمائے دیوبند کے مذہبی خیالات اور سرسید کے مذہبی عقائد میں بُعد المشرقین تھا، اور دیوبند میں جو طریقۂ تعلیم رائج ہوا، وہ علی گڑھ کے تعلیمی نظام کی عین ضد تھا، ان اسباب کی بنا پر خیال ہوسکتا تھا کہ دیوبند، علی گڑھ کا سب سے زبردست اور پُر جوش مخالف ہوگا، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہوا، دیوبند اور علی گڑھ کے اختلافات اصولی اور بنیادی تھے، لیکن ان اختلافات نے عملی مخالفت کا رنگ نہیں اختیار کیا، اس کی وجہ دیوبند کے اربابِ حل وعقد کا عام طرزِ عمل ہے، اسلام کے بہترین علماء و صلحاء کی طرح ان بزرگوں کا عام طریق کار یہ ہے کہ وہ مخالفتوں اور مناظروں میں اپنا وقت تلف نہیں کرتے، خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں، اور اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ ان کے کام کے عملی نتائج دیکھ کر مخالفین ان کے طریقِ کار کے قائل ہوجائیں۔

علی گڑھ کے معاملے میں بھی ان کا طرزِ عمل یہی رہا ہے، علی گڑھ سے اُن کے جو اختلافات تھے، وہ سب کو معلوم ہیں، لیکن انھوں نے فریقِ ثانی کو نیچا دکھانے کے لیے کبھی اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کیے۔

علی گڑھ اور دیو بند کے اختلافات اصولی تھے، اور کسی بغض وعناد یا رشک وحسد پر مبنی نہ تھے، اس لیے ان میں تلخی کبھی نہیں آئی، اس کے علاوہ چونکہ دیو بند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے، اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا، جب انھوں نے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا، اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کیا۔

شبلی نے اخیر عمر میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے متعلق جو رویہ اختیار کیا، وہ دیو بند کے طرزِ عمل سے مختلف تھا اور اس میں تلخی اور عملی مخالفت کا رنگ نمایاں تھا۔ شبلی نے مرنے سے دو چار سال پہلے وقتی مباحث پر جو نظمیں لکھی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی برائی ہوگی، جو سرسید اور ان کے رفقا سے منسوب نہ کی گئی ہو۔ اور علی گڑھ تحریک کا شاید ہی کوئی پہلو ہوگا جس میں انھوں نے نقص نہ نکالے ہوں۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے شبلی کو علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مخالف خیال کیا جا سکتا ہے اور یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ کی کامیاب عملی مخالفت کی بنیاد بیش تر انھی نے قائم کی''۔ (موجِ کوثر، ص ۲۴۸، ۲۴۹، بعنوان: علی گڑھ تحریک کے خلاف ردِّ عمل، مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، سنِ طباعت: جون 2003ء)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ اہل دیو بند کا اہلِ علی گڑھ اور بالخصوص سرسید احمد خان صاحب سے ذاتی وشخصی اختلاف نہیں تھا، بلکہ بعض افکار ونظریات میں اختلاف تھا، جس کے اظہار مین جانبین سے سنجیدہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو سراہا گیا۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب، سرسید احمد خان صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

12، اکتوبر 1870ء میں وہ اس (مغربی) تہذیب کے گرویدہ اور ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ان اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاح وتغیر کے پر جوش داعی اور مبلغ بن کر اپنے ملک واپس ہوئے اور پورے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ،

انہوں نے اس تحریک ودعوت کا علم بلند کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کے لئے وقف کردیں، ان کا نقطہ نظر خالص مادی ہوگیا، وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے، وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے، انہوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان ولغت کے مسلمہ اصول وقواعد اور اجماع وتواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا، چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی وعلمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کردی، ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی کتاب ''الفکر الاسلامی الحدیث'' میں ان کے اس رجحان پر کلام کرتے ہوئے صحیح کہا ہے کہ:

سرسید احمد خاں کی تحریک علوم طبعیہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے عشق وشیفتگی پر قائم تھی، اسی طرح جس طرح زمانہ حال کے بعض مفکرین سائنس اور اس کی ان ایجادات وفتوحات سے ضرورت سے زیادہ مرعوب ہیں، جن پر موجودہ مغربی تہذیب قائم ہے، علومِ طبعیہ یا طبعیات سے اس قدر وابستگی اور عشق، روحانی اور مثالی اقدار کی قیمت کم کردیتا ہے، حالانکہ یہ قدریں وہ ہیں، جن پر آسمانی مذاہب کی بنیاد ہے، اور جس کی نمائندگی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسلام نے کی ہے، علومِ طبعیہ سے یہ غیر معمولی لگاؤ، بعض اوقات ہر اس چیز کے انکار تک پہونچادیتا ہے، جو انسانی حس اور مشاہدہ میں نہ آسکے، یہی چیز تھی، جس کا رشتہ سید جمال الدین افغانی نے سرسید احمد خاں کے الحاد، اور ان کے مذہبِ نیچری سے جوڑا ہے، اور باوجود ان کے بار بار یہ کہنے کے کہ وہ اسلام کا دفاع کررہے ہیں، انہوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا۔

سرسید کا کہنا یہ تھا کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا طریقہ پیدا کریں، جس میں وہ اپنے اسلام پر قائم رہتے ہوئے، اس جدید زندگی

کو اپنا سکیں، جو علومِ طبعیہ کی ترقی کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔

یہ انتہا پسندانہ مادی رجحان، عقلِ انسانی کی تقدیس اور اس کے حدود اور دائرہ عمل کی ضرورت سے زائد توسیع، خدا کی قدرت و مشیت کو قوانینِ فطرت اور اسبابِ ظاہری کا پابند سمجھنا، قرآن کی جسارت کے ساتھ تاویل و تشریح، وہ چیزیں تھیں، جنہوں نے ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ روی اور بے باکی کا دروازہ کھول دیا اور آگے چل کر لوگوں نے اس سے ایسا غلط فائدہ اٹھایا کہ دین کی تشریح اور قرآن کی تفسیر بازیچہ اطفال بن گئی۔ (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص ۹۹، و ۱۰۰، طبع پنجم، 1444ھ 2003 عیسوی، طابع و ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر 110 ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب، سرسید احمد خان صاحب کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

سرسید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم سا ہو گیا، اور اس وجہ سے اس کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے، دینی حلقوں میں اس کے خلاف نفرت و بے زاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس تحریک کے ساتھ اس کے مقاطعہ اور بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع ہو گئی اور اس کے راستہ میں بہت سی غیر ضروری مشکلات پیدا کر دیں، علمائے دین نے جو انگریزی تعلیم اور مفید علوم کے حصول کے ابتدا میں مخالف نہ تھے، یہ دیکھ کر کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے غلط رخ پر پڑ گئی ہے، اور اس میں بہت سے غیر ضروری اور غلط عناصر شامل ہو گئے ہیں، مثلاً اس میں مغربی تمدن سے کھلی ہوئی مرعوبیت اور اس کی دعوت ہے، اخلاق و عقائد پر اس کے مضر اثرات پڑ رہے ہیں، انگریز پروفیسروں اور پرنسپل کے غیر محدود اثر و نفوذ کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوان جو اس کالج میں زیر تعلیم ہیں، انگریزی معاشرت و تمدن اور برطانوی

سیاست سے متاثر و مسحور ہوتے جارہے ہیں۔

انھوں نے اس کی مخالفت میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا، ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت وتمدن میں انگریزی طور وطریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کم زور اور متزلزل۔

دوسرا کم زور پہلو یہ تھا کہ ان کا سارا زور انگریزی زبان وادب کے حصول اور اعلیٰ تعلیم پر تھا، اور عملی علوم کی طرف (جو ترقی کا زینہ اور مغربی اقوام کی ترقی اور کامرانی کا راز ہیں، اور جن کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج کا انھوں نے انگلستان کے قیام میں مشاہدہ کیا تھا) انھوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی، حالانکہ مغرب سے لینے کی اور اس میں کمال حاصل کرنے کی اگر کوئی چیز تھی تو یہی تھی، بلکہ انھوں نے صنعتی تعلیم کی تحریک وتجویز کی سخت مخالفت کی اور اس موضوع پر سخت اور تلخ مضامین لکھے، اس سلسلے کا آخری مضمون وہ تھا، جو ۱۹ فروری ۱۸۸۴ عیسوی میں انھوں نے علی گڑھ گزٹ میں شائع کروایا، جس کا مقصد (مولانا حالی کے بقول) یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے، بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے، جو اب تک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی ہے۔

صنعتی تعلیم کے خلاف سرسید کے جذبات اور ان کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے، اس سے سرسید کو بھی اندیشہ ہوگیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی

ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے، اور اسی وجہ سے جب کوئی ایسی اسپیچ ان کی نظر سے گزرتی تھی، وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے، اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک ریزولیشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا، اور ریزولیشن کی تائید میں ایک طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی روئیداد میں مندرج ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اسلامی ادارہ خالص علمی وادبی رجحان کے ساتھ آگے بڑھا اور مغربی تمدن کی تقلید کا ذوق اور انگریزی ادبیات میں کمال حاصل کرنے کا شوق اس کے ذہین اور حوصلہ مند طلبہ پر غالب رہا، اس نے انگریزی کے بعض اچھے مقرر، صاحبِ قلم، محکموں کے افسر اور انتظامیہ کے عہدہ دار پیدا کیے، لیکن قدرتی طور پر ریاضی، طبعیات کیمسٹری، ٹیکنالوجی اور صنعتی علوم میں جن کی اسلامی ہند کو سخت ضرورت تھی، ممتاز شخصیتیں اور غیر معمولی افراد پیدا نہ ہوسکے، اور اس کی وجہ سے اس کا دائرہ اثر سرکاری ملازمتوں اور معمولی انتظامی اداروں تک محدود رہا۔

اس ساری تفصیل وتنقید کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید احمد خاں ایسی طاقت ور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخصیت اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی، انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی، جس تحریک کی انھوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا تھا، سرسید احمد خاں کی طاقت ور شخصیت کے اثر کا ہندوستاں کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے ادب وزبان، طریقِ فکر واسالیب بیان سب کو کم و بیش متاثر کیا، اور ایک ایسے ادبی وفکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

اس عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سر سید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی، بعض ناقابلِ انکار نتائج پیدا کیے، اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلا کو بڑی حد تک پر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا، ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے مایوسی اور بددلی بھی کم کی، اس ادارے میں بعض بڑے لائق نوجوان، صاحبِ فکر، صحافی، اہلِ قلم اور ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں تحریک خلافت اور تحریکِ آزادی ہند کی پرزور رہنمائی کی، بعد میں جب پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور پھر پاکستان کی اسلامی ریاست وجود میں آئی تو اس کو اسی تعلیم گاہ کے فضلا میں متعدد رہنما اور لائق منتظم دستیاب ہوئے۔

لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی وفکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس ادارے نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی، یہ مغرب کے علمی وعملی تجربوں اور ذخیروں کو مسلم معاشرہ اور ملتِ اسلامیہ کے حالات وضروریات کے مطابق ڈھالنے کا عظیم اور مجتہدانہ کام تھا، یہاں ایک نئی اسلامی نسل کا پیدا کرنا تھا جو عقیدہ اور اصول میں مستحکم ومضبوط اور اس اہم کردار سے واقف ہو جو اس تہذیب عالم کی قیادت میں ادا کرنا ہے، اس کی نظر میں وسعت اور فکر میں لچک ہو، جدید علوم اور مغربی ثقافت سے اس نے اس کے اچھے پہلو اور اس کا مغز لے لیا ہو اور اس کی کمزوریوں اور غیر ضروری اجزا سے احتراز کیا ہو، جس کے نتائج فکر و تحقیقات اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں اور ان میں اسلامی ذہانت اور خود اعتمادی صاف جھلکتی ہو، اور جن کے فکر وعمل میں لذتِ کردار اور جرأتِ اندیشہ پہلو بہ پہلو ہوں، یہ وہ نئی نسل تھی جس کا عالم اسلام بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصے سے منتظر اور اس کے لئے چشم براہ تھا، یہ نسل (اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی) عالم اسلام

www.idaraghufran.org

کو اس تحیّر واضطراب سے نجات دے سکتی تھی، جس میں وہ عرصہ سے مبتلا تھا، اور اس کو اقوام عالم کی قیادت اور تہذیب حاضر کی رہنمائی میں مرکزی مقام عطا کر سکتی تھی۔

سرسید کے تقلیدی ذہن اور رجحان کا مقابلہ ایک ایسے معاصر کے حصہ میں آیا، جس نے قدیم طرز پر تربیت پائی تھی، اور جدید سے واقف تھا، اس نے بغیر کسی رو رعایت کے اس پر نشتر زنی کی، یہ اکبر الٰہ آبادی تھے، انھوں نے اپنے مخصوص و معروف مزاحیہ انداز اور بلیغ اور طاقت ور اسلوب میں نئی تعلیم پانے والے نوجوانوں پر (جو اپنے ہی لختِ جگر تھے) تنقید کا ناخوش گوار لیکن ضروری فرض انجام دیا، اور آخر دم تک اسی کو اپنے شعر وسخن کا موضوع بنائے رکھا، انھوں نے سرسید کے خلوص کے اعتراف کے ساتھ ان کی تعلیمی سیاست، تقلیدِ مغرب کی پر جوش دعوت اور کالج کی مغربی زندگی اور فضا پر بے باکانہ مگر لطیف انداز میں تنقید کی، جس میں اس کی مغربی اندھی تقلید، عقائد میں کم زوری، دین میں ڈھیلے پن، نوجوانوں کی تن آسانی، ان کے بلند معیارِ زندگی، فیشن پرستی، اہلِ دین سے وحشت، ملازمتوں پر انحصار، قدیم مشرقی تہذیب اور اس کی روایات اور خصوصیات سے بغاوت، مغربی معاشرہ میں فنائیت اور خالص مادی طرزِ فکر کو خوب نمایاں کیا، انھوں نے اپنی سحر انگیز شاعری اور فن کار قلم سے نئی نسل کی ایسی بولتی ہوئی تصویر کھینچ کر رکھ دی جس میں سارے خطوط وانداز ایک ایک کر کے ابھر آئے، ان کے کلام کو ہندوستان کے مختلف طبقوں اور مکاتبِ خیال میں قبول عام حاصل ہوا، اہل ذوق اور نوجوانوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کو اس کثرت سے سنا اور پڑھا گیا کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

لیکن اپنی تاثیر ومقبولیت کے باوجود وہ تقلید کے اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا،

اور نئے ابھرتے ہوئے معاشرے کے لیے کوئی مضبوط و مثبت بنیادیں فراہم نہیں کرسکا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز و تعریض پر ہوتی ہے، اس کی عمر اور اثرات محدود ہوتے ہیں، اور وہ کوئی تعمیری انقلاب پیدا نہیں کرسکتا، لیکن بہرحال وہ افادیت سے خالی نہ تھا، اور ہندوستان کے جدید اجتماعی اور ادبی تصورات ورجحانات کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ ہے۔ (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص۱۰۲، تا۱۰۷، طبع پنجم، 1444ھ 2003 عیسوی، طابع و ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر 110 ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اکبرالٰہ آبادی نے سرسید احمد خان صاحب پر زبردست تنقید کی، لیکن ساتھ ہی بعض صفات کا اعتراف بھی کیا۔

چنانچہ اکبرالٰہ آبادی ایک جگہ اپنے اشعار میں فرماتے ہیں: ؎

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا — چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا — دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ابتدا کی جنابِ سید نے — جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پے ہوئی — قوم کا کام اب تمام ہوا

اور اکبرالٰہ آبادی نے اپنے درج ذیل اشعار میں سرسید احمد خان صاحب کی وفات پر جو خیالات ظاہر کیے، ان میں دلی خلوص اور احترام کا عنصر موجود ہے۔ کہتے ہیں: ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں، مرنے والے میں

مذکورہ اشعار اور عبارات سے معلوم ہوا کہ سرسید احمد خان صاحب کے متعدد افکار و خیالات

www.idaraghufran.org

اور طرزِ عمل سے اختلاف بھی کیا گیا اور ان کی اچھی صفات، اچھے اخلاق وغیرہ کا اعتراف بھی کیا گیا۔

یہی طرزِ عمل ہم بلا تفریق اور بلا تعصب مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے لیے بھی اختیار کرتے ہیں۔

ہم نے حضرت تھانوی کے ''مولانا عبید اللہ سندھی صاحب'' سے متعلق دونوں ملفوظات کی توضیح وتشریح، خود حضرت تھانوی ودیگر متعدد اکابر واصحابِ علم وفکر کی روشنی میں ذکر کردی ہے۔

جس کے بعد ہم دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ، ان حضرات پر حیرت واستعجاب کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جو سرسید احمد خان صاحب کے متعدد غلط افکار کے باعث، ان کی اعلیٰ صفات واخلاق کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن ان کے مقابلے میں مولانا سندھی صاحب کی اعلیٰ صفات وخدمات کے باعث ان کے متعدد وغلط افکار کو یا تو غلط تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، یا دیوبند کے مولویوں کا سرسید ہونے کی بنا پر، ان سے علی گڑھ کے سرسید احمد صاحب کی طرح غلط افکار ونظریات کے صادر ہونے کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔

حالانکہ حضرت تھانوی اپنے رسالہ ''التقصیر فی التفسیر'' میں فرماتے ہیں:

''سلف (یعنی اسلام کے ہر اول دور کے بزرگانِ دین وارباب علم) کے بعد خلف (یعنی ہر پہلے دور کے بعد والے دور کے علماء وفضلاء وبزرگان دین) میں جس طرح محرفین ومدعین (تحریف کرنے اور جھوٹے دعوے کرنے والے) ظاہر ہوتے رہیں گے، اسی طرح ان ہی میں ایسے خادمانِ علم بھی ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے، جو ایسی تحریفات ودعاویِ کاذبہ وتاویلاتِ جاہلانہ (یعنی تحریفات اور جھوٹے دعووں اور جاہلانہ تاویلوں) کا رد کرتے رہیں گے۔ چنانچہ سب زمانوں میں دونوں سلسلے برابر جاری رہے، جو کہ مخفی نہیں، حتیٰ کہ اسی سلسلے میں ہمارے وقت میں بھی دونوں جماعتیں موجود ہیں، محرفینِ حقائق

(یعنی حقائق کو بگاڑنے والوں) کی بھی اور معرفینِ حقائق (یعنی حقائق کی معرفت رکھنے والوں) کی بھی (یہ رسالہ بھی ان دونوں جماعتوں کا آئینہ ہے) پھر اُن محرفین میں دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جو اپنی جماعت جدا بنائے ہوئے ہیں اور ان کا جدا ہونا سب کو معلوم ہے، دوسرے وہ جو اپنے کو اہلِ حق کی جماعت میں داخل کہتے ہیں اور دوسروں کی نظر میں بھی وہ اہلِ حق کے آحاد (افراد) ہیں، یہ جماعت سخت خطرناک ہے۔ کیونکہ ان کا باطل حق سے ممتاز نہیں ہوتا، اس لئے عوام تو عوام بعض خواص بھی ان کے باطل سے متاثر ہوجاتے ہیں، چنانچہ اس وقت ایسی ہی ایک جماعت اپنے کو ہمارے اکابر کی طرف منسوب کرتی ہے اور اپنے آراءِ مخترعہ اور اہواءِ مبتدعہ (یعنی من گھڑت رائے اور بدعت والی خواہشات) سے نصوص (یعنی شریعت) میں خصوص قرآن مجید میں تصرفات کرکے بزعمِ خود دین کی خدمت کررہی ہے، جو کہ بالکل اس شعر کا مصداق ہے ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

اور وہ تصرفات بعینہا ان اشعار کے مصداق ہیں۔

بر ہوا تاویل قرآں میکنی　　پست و کژ شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جاں تو قندیلہا　　بہر بینش میکنی تاویلہا

کردۂ تاویل لفظِ بکر را　　خویش را تاویل کن نے ذکر را ''

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۳، و ۳۴، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

## سرسید احمد، نیچریت اور مولانا سندھی کے افکار

اب مولانا سندھی صاحب کے معتمد اور تربیت یافتہ شاگرد اور معتبر ترجمان جناب پروفیسر محمد

www.idaraghufran.org

سرور صاحب اور چند دوسرے افراد کے قلم سے، سرسید احمد خان صاحب اور نیچریت کے متعلق مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار وخیالات ملاحظہ فرمایے، ان کی روشنی میں گزشتہ تفصیلات کا انطباق کریں گے، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ منصفانہ وعادلانہ اور غیر متعصّبانہ فیصلہ کرنا زیادہ دشوار نہ ہوگا۔

پروفیسر محمد سرور صاحب کے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے معتبر ومعتمد ترجمان ہونے کی تصریحات ہم اس سے پہلے ضمیمے میں ذکر کر چکے ہیں۔ جس کے مقابلہ میں موجودہ دور کے بعض حضرات کا پروفیسر سرور صاحب کو مولانا سندھی صاحب کا غیر معتبر وغیر معتمد ترجمان قرار دینا، مدعی سست گواہ چست والا ہی معاملہ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پروفیسر محمد سرور صاحب، مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے افادات وملفوظات کے ضمن میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ میں نے مولانا سندھی سے عرض کیا: مجھے سرسید سے بڑی عقیدت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان پر ایک کتاب لکھوں۔ ان کے مذہبی اندازِ تفکر کا میرے دل پر بڑا اثر ہے، اور اس معاملے میں، میں ان کی فکر آزادی کا بھی بہت قائل ہوں۔ جہاں تک سرسید کے عملی کارناموں کا تعلق ہے، میں ان کی اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمان بحیثیت ایک باآبرو قوم کے تباہ وبدحال ہوگئے، اور ان کی اس مایوس کن حالت کو دیکھ کر وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مصر جانے کا سوچنے لگے تو وہ اس سے رک گئے۔ انھوں نے اپنے اہلِ وطن کو اس بری حالت میں چھوڑ کر جانے کی حمیت اور غیرت کے خلاف سمجھا۔
>
> مولانا (سندھی) میری اس بات سے بہت خوش ہوئے، اور فرمایا:
>
> ڈاکٹر محمد علی شاہ (سندھی) جب کراچی سے میرے پاس پڑھنے کے لیے گوٹھ پیر جھنڈا آئے (موصوف کا شروع کتاب میں ذکر ہو چکا ہے، وہ بعد میں جامعہ ملیہ

اسلامیہ میں استاد ہوئے) تو آنے سے پہلے انھوں نے اپنی کتابوں کا ایک صندوق بھجوایا تھا، ان کتابوں میں سرسید کی تمام تصنیفات بھی تھیں، میں نے سرسید کی یہ تمام تصنیفات پڑھیں، انھیں دنوں کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا، جس میں مجھے سرسید دکھائی دیے، وہ مجھے اپنے پیر و مرشد حضرت صاحب بھرچونڈی کی شبیہ میں نظر آئے، اس دن سے مجھے سرسید کے بارے میں کوئی ذہنی خلش نہ رہی، اور ان سے ایک گونہ مجھے انس ہوگیا۔

آپ نے اس سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا، فرمانے لگے:

یہاں ایک بات کا خیال رہے، سرسید اپنے مسلکِ فکر میں ولی اللّٰہی ہیں، اور وہ اپنی تفسیر القرآن اور تجدیدِ مذہبی میں ولی اللّٰہی طریقے سے باہر نہیں گئے''۔ (افادات و ملفوظات ص ۳۱۳، ۳۱۴، بعنوان: سرسید احمد خاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب نے، سرسید احمد خان صاحب کی تمام تصانیف کا مطالعہ فرمایا تھا، اس کے بعد سرسید احمد خان صاحب کے خواب میں نظر آنے سے، مولانا سندھی صاحب کو سرسید احمد خان صاحب کے متعلق کوئی ذہنی خلش باقی نہیں رہی تھی، بلکہ ساتھ ہی ایک گونہ انس بھی ہوگیا تھا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کے نزدیک، سرسید احمد خان صاحب کا مسلکِ فکر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب والا ہے، اور خواہ تفسیرِ قرآن کا معاملہ ہو یا تجدیدِ مذہب کا، سرسید احمد خان صاحب، ولی اللّٰہی مسلک سے باہر نہیں گئے۔

پھر سرسید صاحب کی طرح کی کوئی فکر اختیار کر کے مولانا سندھی صاحب اپنے آپ کو ''فکرِ ولی اللّٰہی'' سے خارج کیسے شمار کر سکتے ہیں؟

مولانا سندھی صاحب کے اپنے اعتراف اور مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر حضرت تھانوی، مولانا سندھی صاحب کو سرسید احمد کی طرح مخلص اور ''مولویوں کا سرسید احمد'' قرار

دیں، تو اس پر کسی منصف کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

پروفیسر محمد سرور مولانا عبید اللہ صاحب کے افادات وملفوظات میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

سرسید، خود علومِ شرقیہ کے فاضل تھے، انھوں نے ابو الفضل کی تصنیف ''آئینِ اکبری'' ایڈٹ کر کے چھپوائی، ''خطباتِ احمدیہ'' ان کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہے، قرآن مجید کی تفسیر میں انھوں نے شاہ ولی اللہ اور دوسرے حکمائے اسلام کی تصانیف سے پورا فائدہ اٹھایا، اس کے علاوہ ان کے کثیر التعداد بہت سے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔

ایسا شخص ظاہر ہے، اپنے ملی، تاریخی، علمی اور فکری ورثے کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، سرسید ماضی کی فرسودگی کے خلاف تھے، خود ماضی کے نہیں، اسی طرح مولانا محمد قاسم بھی انگریزی زبان اور جدید علوم کے مخالف نہ تھے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۳۲۲، بعنوان ''سرسید احمد خان'')

مولانا نانوتوی اور سرسید احمد خان کی جتنی صفات اور ایک دوسرے سے تعلق کا جتنا بھی ذکر کر دیا جائے، لیکن اس بات کے انکار کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ دونوں حضرات کے عقائد و افکار میں شدید اختلاف تھا۔ سرسید احمد کی تفسیر سے بھی اہلِ دیوبند و دیگر اہلِ فکر حضرات کا اختلاف ڈھکا چھپا نہیں۔

اصل مسئلہ اس وقت عقائد وافکار کے حوالے سے ہے، جس طرح سے مولانا سندھی صاحب کے بقول ان کے مثنیٰ ہونے کی حیثیت سے ان کا معاملہ بھی اسی حوالے سے ہے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے افادات وملفوظات میں لکھتے ہیں:

(مولانا سندھی نے فرمایا): دیوبند اور علی گڑھ دونوں مکاتبِ فکر شاہ ولی اللہ کے طریقے کے وارث ہیں۔ (ایضاً، صفحہ ۳۱۵، بعنوان: سرسید احمد خاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

www.idaraghufran.org

پروفیسر محمد سرور صاحب، مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے افادات وملفوظات ہی میں مزید لکھتے ہیں:

مولانا (سندھی) فرمایا کرتے تھے، مولانا محمد قاسم اور سرسید احمد خان دونوں فکرِ ولی اللّٰہی سے متاثر تھے، اور فکر ولی اللّٰہی مشتمل ہے دو اجزا پر، ایک عقلیت اور دوسرا سلف صالح کا تتبع۔

1857ء کی شکست کے بعد سرسید فکر ولی اللّٰہی کے اس جزو کو جس میں عقلیت مقدم تھی، علی گڑھ لے گئے، اور وہ جزو جس میں سلف صالح کے تتبع پر زیادہ زور تھا، مولانا محمد قاسم نے مدرسہ دیوبند کو اس کا محافظ ومرکز بنایا۔

مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ فکر ولی اللّٰہی کی عقلیت مولانا محمد قاسم کے ہاں بھی تھی، اور سرسید کو بھی حتمی طور پر اسلاف کی روایات سے دلی وابستگی تھی، اختلاف صرف ترجیح و تقدیم کا تھا، یہی وجہ ہے کہ باوجود اختلاف کے دونوں بزرگ ایک دوسرے کے معترف اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ (ایضاً، صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸، بعنوان ''سرسید احمد خان'')

یہ بات مخفی نہیں کہ ''علمائے دیوبند اور سرسید احمد صاحب '' کے مذہبی عقائد وافکار میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود مولانا سندھی صاحب کے نزدیک دونوں مکاتبِ فکر، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے طریقے کے ہی وارث ہیں، اور دونوں مکاتبِ فکر میں اختلاف ''فکر ولی اللّٰہی'' کے دو اجزا میں سے ایک ایک جز کی تقدیم وترجیح سے متعلق ہے۔

ایسی صورت میں سلفِ صالحین کے برخلاف، سرسید صاحب کی طرح کی کوئی فکر اختیار کر کے مولانا سندھی صاحب اپنے آپ کو ''فکرِ ولی اللّٰہی'' سے باہر کیسے شمار کر سکتے ہیں؟

اس لیے ان کے فیصلے کے مطابق سرسید احمد خان صاحب اور مولانا سندھی صاحب کو ایک

دوسرے کا مثنیٰ ہونے کی حیثیت سے، حضرت تھانوی اگر مولانا سندھی صاحب کو سرسید احمد صاحب کی طرح مخلص قرار دیں، اور ان کو بعض افکارِ شاذہ کی وجہ سے مولویوں کا سرسید احمد قرار دیں، تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

بے شک مولانا سندھی صاحب یا ان کے مخصوص معتقدین کچھ بھی سمجھتے رہیں، لیکن ہمارے نزدیک سرسید احمد خان کے مخصوص افکار، دیوبندی ہونے میں حائل ہیں۔

پروفیسر محمد سرور صاحب، مولانا عبیداللہ صاحب کے افادات وملفوظات میں ہی لکھتے ہیں:

> ہمیں اکبر، عالم گیر اور سرسید کے سلسلۂ فکر کو اور آگے بڑھانا چاہیے، شاہ ولی اللہ اور ان کا خانوادہ علمی اس میں ہمارے رہنما اور ہادی ہوں گے۔
>
> مولانا نے فرمایا کہ میں ایک ایسا دیوبندی ہوں، جو سرسید کو مانتا ہے، انھیں اور مولانا محمد قاسم کو ذہناً فکرِ ولی اللّٰہی کا وارث سمجھتا ہے، ان دونوں کو ایک ساتھ لے کر آگے چلنا چاہتا ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۴۱۱، بعنوان ''ملفوظات'')

یہاں بھی مولانا سندھی صاحب نے واضح فرمادیا کہ وہ ایسے دیوبندی ہیں کہ جو اکبر، عالم گیر اور سرسید کے سلسلۂ فکر کو لے کر آگے بڑھانا چاہتے ہیں، اور سرسید احمد اور اہلِ دیوبند کے عقائد وافکار کے مابین شدید اختلاف، مولانا سندھی صاحب کی دیوبندیت میں حائل نہیں ہوتا۔

ایسی صورت میں اگر حضرت تھانوی، مولانا سندھی صاحب کو سرسید یا مولویوں کا سرسید کہیں، تو حیرت نہیں ہونا چاہئے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ''افادات وملفوظات'' میں لکھتے ہیں:

> مولانا (سندھی) کہنے لگے: عام دیوبندیوں کا ''سرسید'' یا ''علی گڑھ کالج'' کے متعلق جو بھی خیال رہا ہو، لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ شروع ہی سے

دیوبند میں ایک مختصر لیکن ممتاز گروہ ایسا رہا ہے، جو علی گڑھ سے ذہنی بُعد رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ یہ دل سے چاہتے تھے کہ یا تو علی گڑھ کو اپنی طرف کھینچیں، یا خود علی گڑھ سے قریب ہو کر اسے اپنا لیں۔ میں اسی گروہ کا فرد ہوں۔

مولانا شیخ الہند نے مجھے علی گڑھ والوں سے ملنے اور ان سے تعلقات پیدا کرنے کی اجازت دی، چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میں علی گڑھ والوں سے صحیح دیوبندیت کا تعارف کرا سکوں گا، کیونکہ میں دیوبندی ہونے کے باوجود علی گڑھ کے ''نیچریوں'' سے بدظن نہ تھا۔ (ایضاً، صفحہ ۴۱۱، ۴۱۲، بعنوان ''ملفوظات'')

مولانا سندھی صاحب نے مذکورہ عبارت میں اپنے ایسا دیوبندی ہونے کا اعتراف فرمایا ہے کہ جو علی گڑھ کے قریب ہو کر اس کی فکر کو اپنانے میں دیوبندیت میں کوئی خلل محسوس نہیں کرتے ''بی بی تمیزن کے وضو کی طرح''۔

نیز مولانا سندھی صاحب نے اپنے آپ کو علی گڑھ کے نیچریوں سے بدظن نہ ہونے کا اظہار بھی فرمادیا ہے، اور دوسرے ملفوظات وارشادات میں اس بدظن نہ ہونے کی خود ہی مزید تشریح وتوضیح بھی فرمادی ہے، جیسا کہ گزرا، اور آگے بھی آتا ہے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں ہی لکھتے ہیں:

مولانا سندھی، سرسید کے اس اقدام کے بھی بڑے معترف تھے کہ اس نے یورپی تمدن کو اپنانے کی دعوت دی، ایک دفعہ فرمانے لگے:

سرسید کا ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے یہ محسوس کیا اور اپنے محسوسات کو ایک تحریک کی شکل دی کہ موجودہ حالات میں یورپی تمدن کو اختیار کیے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کا قومی وجود کسی صورت میں باعزت طور پر باقی نہیں رہ سکے گا۔ سرسید کا یہ مسلک عزت وتوقیر کے قابل ہے۔ اس پر چلنا اس وقت بھی ضروری تھا اور آج تو اسے اپنائے بغیر بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔

باقی رہی سرسید احمد کی سیاست اور اس کا مسلکِ وفاداریٔ حکومتِ برطانیہ، بے شک سرسید بہت بڑا آدمی تھا، اس کے زیرک اور مدبر ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ اس نے اپنے وقت میں اور ان حالات میں جو کچھ کیا اور حکومت کو مسلمانوں کے بارے میں مطمئن اور خوش کرنے کے لیے جو بھی راہِ عمل اختیار کی وہ اس زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے مخصوص طبقوں کے، جن کے سرسید قدرتی طور پر اور سماجی طور پر نمائندے تھے، مفادات کے عین مطابق تھا (ایضاً، صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸، بعنوان ''سرسید احمد خان'')

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

مولانا (سندھی) فرمانے لگے: مسلمان کو یورپین ازم سے قریب لانے میں، میں تین آدمیوں کا احسان مانتا ہوں، سرسید احمد خان، امیر حبیب اللہ خان اور مصطفیٰ کمال۔ (ایضاً، صفحہ ۳۴۶، بعنوان ''مولانا محمد علی'')

ملاحظہ فرمایے کہ سرسید احمد خان کے زمانے میں ان کے نزدیک یورپی تمدن اختیار کیے بغیر مسلمانوں کا باعزت طریقے پر ہندوستان میں رہنا ممکن نہ تھا۔

مولانا سندھی صاحب کے نزدیک سرسید صاحب کا یہ مسلک نہ صرف عزت وتوقیر کے قابل تھا، بلکہ سرسید صاحب کی یہ فکر ہندوستان کے مسلمانوں پر احسانِ عظیم بھی ہے، اور مولانا سندھی صاحب کے دور میں، سرسید احمد صاحب کے اس مسلک کو اختیار کیے بغیر بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی، اسی لیے انھوں نے اپنے زمانہ کے یورپی تمدن کو اختیار کرنے پر زور دیا، بلکہ اپنے آپ کو سرسید احمد خان کا ''مثنیٰ'' بھی قرار دیا، اور سرسید احمد خان صاحب کی دعوت کو اوپر کے طبقوں کے لیے اور اپنی دعوت کو نچلے طبقوں کے لیے قرار دیا، کیونکہ مولانا سندھی صاحب، حضرت تھانوی کے بقول ''مولویوں کے سرسید احمد'' تھے۔

چنانچہ پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں لکھتے ہیں:

مولانا (سندھی) نے کہا: جہاں تک یورپین ازم کو اختیار کرنے کا تعلق ہے، میں سرسید احمد خان کا مثنیٰ ہوں۔ سرسید نے یورپی تمدن اختیار کرنے کی دعوت دی، اس کے سامنے برطانوی نمونہ تھا، میں مسلمانوں کو یورپ کی دوسری قوموں کا نظامِ تمدن اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔

سرسید نے علی گڑھ کے لیے آکسفرڈ اور کیمبرج کو نمونہ بنایا، اور ایک مسلمان نوجوان کے سامنے انگریز ''جنٹل مین'' کی مثال رکھی، میں اپنے نوجوان کو یورپ کا کاری گر اور مزدور بنانا چاہتا ہوں، سرسید کی دعوت، قوم کے اوپر کے طبقوں کے لیے تھی، اور میری یہ دعوت قوم کے نچلے طبقوں کے لیے ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۴۱۹، بعنوان ''ملفوظات'')

مذکورہ عبارت کو بار بار پڑھنے کے بعد مولانا سندھی صاحب سے متعلق حضرت تھانوی نے اپنے ملفوظات میں جو رائے بیان فرمائی ہے، اس کی حقانیت اور صداقت کو سمجھنا اور قبول کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

مولانا سندھی صاحب، معاشرت وسیاست وغیرہ میں روسی اشتراکیت اور یورپین ازم کو کس طرح پسند کرنے کے قائل تھے، اس کی تفصیل تو آگے آتی ہے۔

ابھی مولانا سندھی صاحب کی طرف سے نیچریت کی فضا سے آلودہ، اور سرسید احمد صاحب کے شاگرد مرزا غلام احمد قادیانی کے ہم مسلک اور ان کے قریبی ساتھی اور جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ حکیم نورالدین کے متعلق خیالات ملاحظہ فرمایے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ایک دفعہ کا ذکر ہے، سید ہاشمی فرید آبادی جامعہ نگر میں مولانا (سندھی) سے باتیں

کررہے تھے، باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے، ہم نے حیدرآباد دکن میں فلاں قادیانی کو مسلمان کیا۔ مولانا نے سنا تو بڑے تاسف اور پردرد لہجے میں کہا کہ سید صاحب آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۵، بعنوان ''سوشلزم اور مذہب'')

مذکورہ بالا ملفوظ پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں مزید لکھتے ہیں:

مولانا سندھی نے فرمایا غلطی یہ ہوئی کہ ہمارے علمائے کرام نے احمدیت کو ایک اعتقادی مسئلہ بنادیا، اور اعتقادیات کی جنگ کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں ''تاویلوں'' کی بڑی گنجائش ہوتی ہے اور فنِ تاویل میں احمدیوں کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تاویل کے یہ معنیٰ ہوتے ہیں کہ ایک لفظ سے آپ جو چاہیں، مراد لیں۔ احمدیت ایک سماجی مظہر (Phenomenon) ہے۔ ''تحریک ختمِ نبوت'' جیسی تحریکیں نہ پہلے اس کا کچھ بگاڑ سکی ہیں، اور نہ آئندہ بگاڑ سکیں گی۔

(ایضاً صفحہ ۳۳۷، بعنوان ''حکیم نورالدین'')

مولانا سندھی صاحب کے ملفوظ میں علمائے کرام سے جو غلطی ہوئی، اس میں شاید وہ علمائے کرام بھی شامل ہوں، جو ختمِ نبوت کی تحریک میں شامل ہوئے، اور انھوں نے اس سلسلے میں جدوجہد کی، اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں مزید لکھتے ہیں:

اس کے باوجود کہ حکیم نورالدین، مرزا غلام احمد کو ''مسیح موعود'' مانتے تھے، اور مسلکاً احمدی وقادیانی تھے، مولانا سندھی ان کی علمی عظمت کے برابر قائل رہے۔ راقم الحروف (محمد سرور) کا خیال ہے کہ مولانا جب ان سے ملنے قادیان جاتے تھے، تو وہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن سے ان کی غیر معمولی محبت سے بہت متاثر ہوتے۔

(ایضاً صفحہ ۲۵۰، بعنوان ''شخصیات'')

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبید اللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

اس کتاب میں کئی بار حکیم نورالدین اوران کے علم وفضل کے متعلق مولانا سندھی کی بڑی اچھی رائے کا ذکر ہو چکا ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۳۲۳، بعنوان ''حکیم نورالدین'')

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبید اللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں مزید لکھتے ہیں:

[مولانا سندھی نے کہا] میں مولوی نورالدین کو واقعی بڑا آدمی سمجھتا ہوں، میں ان کے علم، تفقہ فی الدین، خلوص، ایثار، بے غرض خدمتِ دین اور سب سے بڑھ کر ان کا اپنے آپ کو ایک مقصد کے لیے وقف کر دینا، ان چیزوں کا میں بڑا معترف ہوں۔ (ایضاً، صفحہ ۳۲۸، بعنوان ''حکیم نورالدین'')

جناب شکیل عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

حکیم نورالدین کے خلوص کی وکالت کے علاوہ مولانا سندھی نے قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے بیان کا بھی عجیب تجزیہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بحیثیت ایک فلسفی کے اس (اقبال) کی نظر وفکر عالمی ہے۔ مسلمان ہونے کے لحاظ سے وہ اپنے دور کے ہندوستان کا جس میں چھوٹے چھوٹے ہندو۔ مسلم تنازعات زوروں پر تھے، ایک فرقہ پرست بن جاتا ہے، اور پنجاب میں قادیانیت کے خلاف جو عام فضا تھی، اس سے متاثر ہوتا ہے تو وہ احمدیوں کو دائرۂ اسلام سے نکال باہر کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے'' (افادات وملفوظات، ص ۳۵۳، بعنوان علامہ اقبال)

گویا علامہ اقبال نے احمدیوں کو دائرہ اسلام سے نکال باہر کر دینے کا مطالبہ کسی گہرے غور وفکر کے تحت نہیں کیا، بلکہ وہ پنجاب کی عمومی فضا سے متاثر ہو گئے تھے۔ یاللعجب! (''ششماہی نقطہ نظر اسلام آباد'' شمارہ نمبر ۲۰، اپریل۔ ستمبر ۲۰۰۶ء، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف

www.idaraghufran.org

پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد)

مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالے سے نیچریت، اور سرسید احمد اور قادیانیت میں نسبت و تعلق کا ذکر گزر چکا ہے۔

اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مندرجہ بالا افادات وملفوظات سے بھی ان تینوں نسبتوں اوران سے تعلق وربط پر روشنی پڑتی ہے۔

نیز پروفیسر محمد سرور صاحب کے جمع کردہ افادات وملفوظات سے نیچریت کا ایک اور نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

> کوئی مسلم بن عقیل سے پوچھے کہ تم جو یزید کی حکومت میں آ کر اس کے خلاف اہلِ کوفہ کو بغاوت پر آمادہ کر رہے ہو، تو یہ کس قانون کی رُو سے جائز ہے؟ تم جو یہاں اپنی حکومت بنانے آئے ہو، تو اپنی مخالف حکومت کے اہل کاروں کو کیوں چھوڑتے ہو؟ آخر مسلم بن عقیل اوران کے ساتھ ہانی اور پھر امام حسین کو اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ (افادات وملفوظات ص ۳۹۱، بعنوان: ملفوظات، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ''افادات وملفوظات'' میں اس طرح کی باتوں کی کمی نہیں، صرف حضرت تھانوی کے ملفوظ کی تشریح کرنے اور طوالت سے بچنے کے لیے چند عبارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اب ہم بامرِ مجبوری نیچریت اور بالخصوص سرسید احمد صاحب کے اس نظریہ کا ذکر کرتے ہیں، جو مولانا سندھی صاحب کی تفسیر میں بھی ان کے دوسرے شاگردوں نے ذکر کیا ہے۔

ان کے دوسرے معتبر شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے بھی مولانا سندھی صاحب کے افادات وملفوظات میں ذکر کیا ہے، اور وہ حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی قیامت سے پہلے آمد سے متعلق ہے۔

چنانچہ پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی کے ''افادات وملفوظات'' میں لکھتے ہیں:

بدقسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے امامت ومہدیت کے دعوے کردیے، اس سے خواہ مخواہ امراوخوانین میں بدمزگی پیدا ہوئی۔ (افادات وملفوظات ص۲۸۲، بعنوان: امام ربانی مجدد الف ثانی، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی طرف سے خاص حضرت سید احمد شہید کے متعلق اس الزام کا کسی معتبر وقوی ذریعے سے ثبوت نہیں ملتا، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں مولانا سندھی صاحب کی طرف سے سید احمد شہید پر لگائے گئے اس الزام کی تردید کی ہے۔

پھر کلام کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آگے فرماتے ہیں:

''مولانا (عبیداللہ سندھی صاحب) کا کہنا تھا کہ ایک طرف سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی، دوسری طرف انگریز کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ کوئی اور مہدی بن کر ان کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکا دے گا۔ ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو اس گورکھ دھندے سے نکالا جاتا۔ سرسید نے امام مہدی کے آنے کے بارے میں روایات کی تنقید کی اور ثابت کیا کہ مہدی کے آنے کا عقیدہ بے سروپا اور غلط ہے۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو کسی مہدی کے آنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

اس قسم کے روایاتی ماحول اور امام مہدی کے انتظار کی فضا میں مرزا غلام احمد نے مہدی کے آنے اور نزولِ مسیح کے عقیدے پر بحث کی۔ اب بجائے اس کے کہ وہ سرسید کی طرح ان روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وہ ہیں، وہ خود مہدی اور مسیح بن گئے اور اس طرح ایک لغویت کی جگہ دوسری لغویت پیدا ہوگئی۔

مولانا نے فرمایا: پنجاب میں صحیح الفکری نہیں، اور اب تک جو یہاں (اہلِ) فکر پیدا

ہوئے، ان میں بالعموم سلامت روی اور توازن کی کمی ہے۔ جیسے اہلِ قرآن، علامہ مشرقی، جماعتِ احمدیہ یہاں تک کہ علامہ اقبال بھی۔ جماعت اسلامی کو بھی فروغ یہیں ہوا۔

مولانا سندھی کی رائے میں شاہ ولی اللہ دراصل امام مہدی کے آنے کے عقیدے کو ختم کرنا چاہتے تھے، اور بالواسطہ انھوں نے ایسا کیا بھی'' (افادات و ملفوظات ص۲۸۳و۲۸۴، بعنوان: امام ربانی مجدد الف ثانی، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مذکورہ عبارت میں قیامت سے قبل حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی آمد سے متعلق روایات کو موضوع قرار دیا گیا ہے، اور اس مسئلے میں سرسید احمد صاحب کے موقف کی تائید کی گئی ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا عبارت میں درج ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں:

''سرسید کی طرح ان روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وہ ہیں''۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مزید لکھتے ہیں:

امام مہدی کا تصور دراصل اسی غلط ذہنیت کا آئینہ دار ہے، بدقسمتی سے ڈاکٹر اقبال بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے، یہ تصور بڑا مضرت رساں ہے، اس سے قوم میں اپاہج پن پیدا ہوتا ہے، اور وہ کسی آنے والے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہتی ہے، میں اس ذہنیت کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ (افادات و ملفوظات ص۴۱۹، ۴۲۰، بعنوان: ملفوظات، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی آمد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے کے طرزِ عمل سے نہ ہمیں اتفاق ہے، اور نہ ہی ان مستند و معتبر اہلُ السنۃ والجماعۃ کو اتفاق ہے، جو قیامت سے قبل حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی آمد کے مدعی و معترف ہیں۔

تاہم مذکورہ عبارات میں قیامت کے قریب حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کی آمد کے انکار میں مولانا سندھی صاحب نے اپنے مثنیٰ اور پسندیدہ شخصیت سرسید احمد خان صاحب کی جو پیروی

کی ہے، اس سے جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ اتفاق نہیں کرتے۔

البتہ سرسید احمد خان صاحب اس نظریہ اور فکر کے حامل ضرور ہیں۔

چنانچہ سرسید احمد خان صاحب اپنی مشہور کتاب ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھتے ہیں:

''ان غلط قصوں میں سے جو مسلمانوں کے ہاں مشہور ہیں، ایک قصہ امام مہدی آخر الزمان کے پیدا ہونے کا ہے، اس قصے کی بہت سی حدیثیں کتبِ احادیث میں بھی مذکور ہیں، مگر کچھ شبہ نہیں کہ سب جھوٹی اور مصنوعی ہیں، جب کہ ایک محقق کیا باعتبار واقعات تاریخی کے اور کیا باعتبار ان کے راویوں کے ان پر غور کرتا ہے، تو ان کا غلط اور نامعتبر اور وضعی ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے''۔ (تہذیب الاخلاق، ج۲ص ۴۰۷ و ۴۰۸، حصہ دوئم: مضامین مذہبی وعلمی، بعنوان: مہدی آخر الزمان، مطبوعہ: مصطفائی پریس لاہور، ۱۳۱۳ ہجری)

نیز اپنے مقالات میں سرسید احمد خان صاحب لکھتے ہیں:

''ان غلط قصوں میں سے جو مسلمانوں کے ہاں مشہور ہیں ایک قصہ امام مہدی آخر الزماں کے پیدا ہونے کا ہے، اس قصے کی بہت سی حدیثیں، کتبِ احادیث میں بھی مذکور ہیں مگر کچھ شبہ نہیں کہ سب جھوٹی اور مصنوعی ہیں..... اور ان سے کسی ایسے مہدی کی جو مسلمانوں نے تصور کر رکھا ہے اور جس کا قیامت کے قریب ہونا خیال کیا ہے، بشارت مقصود نہیں تھی''۔ (مقالات سرسید، حصہ6 ص121، ناشر مجلس ترقی ادب)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب نے بعض غلط عقائد وافکار میں سرسید احمد خان صاحب کی پیروی کی ہے، اور سرسید احمد خان کی فکر کو اپنی پسندیدہ فکر قرار دیا ہے۔

شیخ بشیر احمد لُدھیانوی صاحب، جن کو مولانا سندھی صاحب کے معتقدین بھی مولانا سندھی صاحب کا معتمَد اور محتاط ترجمان قرار دیتے ہیں، اُن کی ترتیب وتدوین شُدہ ایک کتاب ''امالی عبیدیہ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس کی تمہید میں تحریر کیا گیا ہے کہ:

زیرِ نظر کتاب مولانا سندھی کے وہ اسباق ہیں، جو انھوں نے 25 سالہ جلاوطنی سے واپسی پر اپنے شاگردِ رشید شیخ بشیر احمد صاحب کو 1940ء میں املا کرائے (امالی عبیدیہ، صفحہ xiii، مطبوعہ: رتن پبلیکیشنز، اسلام آباد، تاریخ طبع: ستمبر 2006ء)

اور تمہید میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ:

اس میں کسی لفظ یا جملہ کی ساخت کو تبدیل نہیں کیا گیا، ہاں اگر بہت ضروری ہوا تو قوسین میں وہ لفظ دے دیا گیا، جس کی وجہ سے مفہوم واضح ہوتا ہے (ایضاً)

اس کتاب میں مولانا سندھی صاحب کی طرف سے ''نزولِ مسیح کے مسئلہ'' پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں نزولِ مسیح کی بحث کو کچھ توڑ توڑ کر تحریر کیا ہے، اور درمیان میں غیر متعلقہ چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے۔

ہم نزولِ مسیح سے متعلق عبارات کو مِن وعَن نقل کرتے ہیں۔

چنانچہ اس کتاب ''امالی عبیدیہ'' میں ہے:

وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ (سورة نساء، رقم الآية159)

''بخاری شریف میں آیا ہے کہ مسیح نازل ہوں گے۔ [1]

---

[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم میں مروی ہونے کے علاوہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر مفسرین و محدثین سے بھی یہی تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں مروی ہے، اور اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، لیکن مولانا سندھی صاحب نے اپنی مذکورہ تقریر میں اس سے اختلاف کیا ہے۔

عن ابن شهاب أن سعيد بن المسيب، سمع أبا هريرة رضى الله عنه، قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :والذى نفسى بيده، ليوشكن أن ينزل فيكم ابن مريم حكما عدلا، فيكسر الصليب، ويقتل الخنزير، ويضع الجزية، ويفيض المال حتى لا يقبله أحد، حتى تكون السجدة الواحدة خيرا من الدنيا وما فيها، ثم يقول أبو هريرة:واقرء وا إن شئتم(وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته، ويوم القيامة يكون عليهم شهيدا(صحيح البخارى،رقم الحديث،٣٤٤٨)

عن ابن عباس رضى الله عنهما، "(وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته) قال: خروج عيسى ابن مريم صلوات الله عليه(حاكم،رقم الحديث،٣٢٠٧)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

شاہ صاحب نے قاعدہ بنایا ہے کہ بخاری، مسلم اور موطاء جس روایت پر متفق ہوں، وہ اول درجے کی صحیح روایت ہے۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

قال الحاکم:

هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه

وقال الذهبی:

على شرط البخاری ومسلم

(وإن) ما (من أهل الكتاب) أحد (إلا ليومنن به) بعيسى (قبل موته) أی الكتابی حين يعاين ملائكة الموت فلا ينفعه إيمانه أو قبل موت عيسى لما ينزل قرب الساعة كما ورد فی حديث (ويوم القيامة يكون) عيسى (عليهم شهيدا) بما فعلوه لما بعث إليهم(تفسير الجلالين،ص ۱۳۱،سورة نساء، رقم الآية۱۵۹)

وقوله تعالى :وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته ويوم القيامة يكون عليهم شهيدا قال ابن جرير :اختلف أهل التأويل فی معنى ذلک وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته يعنی قبل موت عيسى يوجه ذلک إلى أن جميعهم يصدقون به إذا نزل لقتل الدجال، فتصير الملل كلها واحدة، وهی ملة الإسلام الحنيفية، دين إبراهيم عليه السلام .ذكر من قال ذلک :حدثنا ابن بشار، حدثنا عبد الرحمن عن سفيان، عن أبی حصين، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته، قال :قبل موت عيسى ابن مريم عليه السلام .وقال العوفی عن ابن عباس مثل ذلک، وقال أبو مالک فی قوله :إلا ليؤمنن به قبل موته قال :ذلک عند نزول عيسى، وقبل موت عيسى ابن مريم عليه السلام، لا يبقى أحد من أهل الكتاب إلا آمن به وقال الضحاک عن ابن عباس وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته :يعنی اليهود خاصة .وقال الحسن البصری :يعنی النجاشی وأصحابه، رواهما ابن أبی حاتم .وقال ابن جرير :حدثنی يعقوب، حدثنا أبو رجاء عن الحسن وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته قال :قبل موت عيسى والله إنه لحی عند الله، ولكن إذا نزل آمنوا به أجمعون .وقال ابن أبی حاتم :حدثنا أبی، حدثنا على بن عثمان اللاحقی، حدثنا جويرية بن بشير، قال :سمعت رجلا قال للحسن :يا أبا سعيد، قول الله عز وجل :وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته، قال :قبل موت عيسى، إن الله رفع إليه عيسى وهو باعثه قبل يوم القيامة مقاما يؤمن به البر والفاجر .وكذا قال قتادة وعبد الرحمن بن زيد بن أسلم، وغير واحد، وهذا القول هو الحق، كما سنبينه بعد بالدليل القاطع إن شاء الله وبه الثقة وعليه التكلان(تفسير ابنِ كثير، ج۲ص ۴۰۱،سورة نساء، رقم الآية۱۵۹)

[1] ہمیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں طبقۂ اولیٰ میں ان تین کتابوں کے اکٹھا ہونے کے بجائے (جیسا کہ مولانا سندھی صاحب نے سمجھا) تینوں کتابوں کا الگ الگ مستقل طور پر طبقۂ اولیٰ میں داخل ہونا معلوم ہوا۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

شاہ صاحب کے طریقے پر میں قرآن کریم کے بعد روایات میں سے ان روایات کو اول درجے کی صحیح مانتا ہوں، جو ان تینوں میں متفق طور پر پائی جائیں، اگر کوئی حدیث ایسی صحیح ہو، اور مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہ آسکے، تو میں خاموش ہو کر تفتیش کرتا رہوں گا، انکار کبھی نہ کروں گا، مجھے یہ شبہ تھا کہ یہ حدیث موطاء میں ہے (اصل میں موطاء میں اور حدیث تھی) اس لیے میں اسے اصح الحدیث تسلیم کرتا تھا، اور اسے صحیح سمجھ کر اس کی تحقیق کرتا رہا۔

لیکن مجھے اس چیز کا قرآن سے منطبق کرنا مشکل ہو گیا، بیس برس خاموش رہا، اور اس پر کبھی بحث نہ کی۔

مکہ معظّمہ میں تھا کہ معلوم ہوا کہ یہ حدیث موطاء میں نہیں ہے۔ اب میرے نزدیک اس کا وہ درجہ نہیں رہا۔ [1]

اب میرے نزدیک یہ دوسرے درجے کی حدیث ہے، اس سے جو چیز ثابت ہو، وہ بسر خود صحیح ہے، مگر اسے قرآن کے معارضے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

---

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

اور ساتھ ہی یہ بھی دستیاب ہوا کہ صحیحین کی تمام احادیث کے متعلق محدثین کا اتفاق ہے کہ ان کی احادیث میں شک کرنے والا مبتدع ہے، جو مسلمانوں کے طریقہ پر نہیں۔

''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی اس سلسلے میں عبارت مندرجہ ذیل ہے:

**فالطبقة الأولى منحصرة بالاستقراء في ثلاثة كتب، الموطأ، وصحيح البخاري، وصحيح مسلم.....أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع، وأنهما متواتران إلى مصنفيهما، وأنه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين.....الطبقة الثانية : كتب لم تبلغ مبلغ الموطأ والصحيحين(حجة الله البالغة، ج ١، ص ٢٣٢، باب طبقات كتب الحديث)**

[1] لیکن پیچھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ صحیحین کی احادیث بھی ان کے نزدیک، موطاء کی احادیث کی طرح طبقۂ اولیٰ میں داخل ہیں۔ پھر اس صحیحین کی حدیث کو وہ درجہ نہ دینے کا کیا مطلب؟ علاوہ ازیں اس کا قرآن مجید سے کہاں تعارض ہے، جس کو قرآن پر منطبق کرنا اور بیس برس خاموش رہنا ضروری ہو۔

محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اب ہم نے قرآن پر مستقل طور پر غور کرنا شروع کیا۔ [1]

ہم یہ مانتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مسیح نازل ہوں گے، مگر اس مسئلے کو قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ [2]

قرآن دنیا کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ [3]

اگر یہ مسئلہ اس کا جُز بن جائے، تو حقیقت اور ہو جاتی ہے، اگر قرآن نے یہ تعلیم دی ہے کہ مسیح آئے گا، تو جس وقت تک ہم اسے تسلیم نہ کرلیں، اس وقت تک ہمارا ایمان قرآن پر ٹھیک نہ رہا۔ [4]

اب میری کیفیت یہ ہے کہ میں اسے قرآن کا حکم نہیں مانتا۔ جیسے اور سینکڑوں مسائل حدیث سے ثابت ہوتے ہیں، جن پر اہلِ علم کی آراء مختلف رہتی ہیں، یہ مسئلہ بھی ہے کہ مسیح آئے گا۔ [5]

---

[1] قرآن پر مستقل غور کرنے کا کیا مطلب؟ جب کسی آیت کی تفسیر میں صحابی کی ایسی موقوف حدیث آجائے، کہ جس میں قیاس کو دخل نہ ہو، تو اس کو حکمی مرفوع کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور قرآن پر مستقل اور الگ سے غور کرنے کے بجائے اس طرح کی حدیث کو ملحوظ رکھ کر تفسیر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محمد رضوان۔

[2] جب صحیح حدیث سے کسی آیت کی تفسیر معلوم ہوگئی، تو اس کا قرآن سے تعلق ہوگیا۔ اس میں کیا شبہ ہے؟ محمد رضوان۔

[3] اور احادیث بھی اسی لیے آئی ہیں، نہ کہ کسی اور کام کے لئے۔ محمد رضوان۔

[4] قرآن ہی نے احادیثِ رسول پر بھی ایمان لانے کی اصولی تعلیم دی ہے "**فی قولہٖ تعالیٰ: ما اتاکم الرسول فخذوہ**" پھر اس کے بغیر ایمان کیسے کامل ہوگا؟ بالخصوص جو چیز متواتر (معنوی) ہونے کی وجہ سے قرآن کے تواتر کے مشابہ ہو۔ محمد رضوان۔

[5] مطلب یہ ہوا کہ نزولِ مسیح کے مسئلے کا قرآن سے تعلق نہیں ہے، یہی بات بعض باطل فرقے اور اس کے علاوہ بعض دوسرے افراد، مثلاً سر سید احمد خان اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وغیرہ نے بھی کہی ہے، جس کی بنیاد پر اس مسئلہ کی اہمیت کو کم سمجھ کر اختلاف کی گنجائش پیدا کی جاتی ہے، اسی وجہ سے اوپر کے الفاظ میں قرآن کا حکم نہ ماننے کے بعد معاً ہی یہ بات تحریر کردی گئی کہ جس طرح اور بہت سے مسائل احادیث سے ثابت ہیں، اور ان پر اہلِ علم حضرات کی آراء مختلف رہتی ہیں، ان ہی میں سے مسیح کی آمد کا مسئلہ بھی ہے، گویا کہ یہ ایک ایسا اجتہادی مسئلہ ہوگیا، جس طرح کے اور بہت سے اجتہادی مسائل ہیں، جن میں احادیث کو مستدل بنایا جاتا ہے، اور دوسرا موقف رکھنے والے اس مستدل کو تسلیم نہیں کرتے۔
لیکن یہ فکر درست نہیں، کیونکہ اہلِ علم حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ نزولِ مسیح کا مسئلہ مسلمانوں کے مابین عام

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

مگر قرآن کی وہ تعلیم جو انقلاب پیدا کرنے کے لئے انسانیت کے ساتھ قیامت تک رہے گی۔ [1]

اُس کا یہ مسئلہ جُو نہیں بن سکتا (امالی عبیدیہ، صفحہ 153، وصفحہ 154، مطبوعہ: رتن پبلیکیشنز، اسلام آباد، تاریخ طبع: ستمبر 2006ء)

جس حدیث میں نزولِ مسیح کا ذکر ہے، وہ بخاری اور مسلم میں نہیں ہے، اور حدیث ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی، علمِ حدیث میں نازک غلطی ہوتی ہے، جس میں بڑے عالموں کے سوا لوگ تمیز نہیں کر سکتے، اصل میں ایک صحابی اپنی رائے ذکر کرتا ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کی رائے نہیں، بلکہ اسے رسولُ اللہ کی روایت سمجھ لیتے ہیں۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رائے ہے، اور انھوں نے یہ اہلِ کتاب سے لیا ہے۔ [2]

''ازالۃُ الخفاء'' میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رائے مرفوع روایت سمجھی گئی۔ اس پر علمِ

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اجتہادی مسائل کی حیثیت نہیں رکھتا، بھلا جس مسئلہ پر احادیثِ کثیرہ بلکہ متواترہ پائی جائیں، ان کے برخلاف اس طرح کے اجتہاد کی کہاں گنجائش ہوتی ہے؟ جب کہ وہ احادیث جس طرح ثبوت کے اعتبار سے یقین کی حدود تک پہنچی ہوئی ہیں، اسی طرح دلالت کے اعتبار سے بھی پہنچی ہوئی ہیں، اور ان کا تعارض نہ تو قرآن مجید سے ہے، اور نہ ہی صحیح احادیث سے، کسی کا ایسا سمجھنا ہی قرآن وسنت کے صحیح اور پختہ علم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ محمد رضوان۔

[1] لیکن ہمیں مندرجہ بالا موقف سے اتفاق نہیں، کیونکہ احادیثِ رسول، دراصل قرآن مجید کی صحیح تفسیر وتشریح ہیں، جن کے بغیر قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کو صحیح معنیٰ میں سمجھنا مشکل ہے، چنانچہ احادیث کو نظر انداز کر کے صرف قرآن مجید کی بنیاد پر نماز، روزہ وغیرہ کی تفاصیل کو نہیں سمجھا جا سکتا، پس قرآن مجید کی جو تعلیم انقلاب پیدا کرنے کے لیے قیامت تک رہے گی، اس کی صحیح تفسیر وتشریح کا احادیث صحیحہ کے تناظر میں ہونا بھی لابدی امر ہے۔ محمد رضوان۔

[2] حضرت ابو ہریرہ اور ان کے علاوہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے نزولِ مسیح کے عقیدہ اور حدیث کے ضمن میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے، یہ بات بیان کی ہے اور اہلِ کتاب سے اس کو نہیں لیا، نہ ہی مسلمانوں کے نزولِ مسیح کے عقیدہ کا اہلِ کتاب کے عقیدہ سے تعلق ہے، ان کا عقیدہ اور ہے، مسلمانوں کا عقیدہ اور ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

حدیث کے قواعد کے اندر رہ کر اس کے دلائل پیش کر سکتے ہیں کہ اس میں یہ غلطی موجود ہے (امالی عبیدیہ، صفحہ 157، مطبوعہ: رتن پبلیکیشنز، اسلام آباد، تاریخ طبع: ستمبر 2006ء) [1]

ایک بہت بڑے بزرگ کی رائے ہے کہ مہدی کا جو لوگ انتظار کرتے ہیں۔ جس وقت وہ آئے گا، سب اس کے دشمن ہو جائیں گے، تو یہ تعلیم مسلمانوں میں یہودیوں سے آئی ہے، خود مسلمانوں کی نہیں ہے۔ میں بذاتِ خود کسی مسیح کی آمد کا انتظار اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا (مسیح کی آمد کا انکار نہیں) (امالی عبیدیہ، صفحہ 159، وصفحہ 160، مطبوعہ: رتن پبلیکیشنز، اسلام آباد، تاریخ طبع: ستمبر 2006ء) [2]

حاصلِ مطلب یہ ہے کہ ہم قرآنِ عظیم کو ان دونوں تحریکوں سے پاک مانتے ہیں، قرآن نہ اس کی دعوت دیتا ہے کہ مسیح آئے گا، نہ اس کی دعوت دیتا ہے کہ مہدی آئے گا (امالی عبیدیہ، صفحہ 160، مطبوعہ: رتن پبلیکیشنز، اسلام آباد، تاریخ طبع: ستمبر 2006ء) [3]

اگرچہ مولانا سندھی صاحب، خود اعتراف فرما چکے ہیں کہ وہ سر سید احمد خان صاحب کے مثنیٰ ہیں، اور وہ یورپین ازم اور اشتراکیت کو اپنے دور میں ترقی کا راستہ اور ضرورت سمجھتے ہیں، جس کے بعد مزید حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

---

[1] علمِ حدیث کے قواعد کے اندر رہتے ہوئے، ہمیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں غلطی موجود ہونے کا ثبوت نہیں ملا، نہ ہی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ازالۃ الخفاء سے کسی غلطی کی طرف اشارہ ملا۔ اور نہ ہی مولانا سندھی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت میں ان دونوں باتوں کا کوئی حوالہ دستیاب ہوا، پھر اس تقریر کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ محمد رضوان۔

[2] ملحوظ رہے کہ اس اقتباس کے آخر میں جو بین القوسین عبارت ہے، اس کے متعلق ہمارا رجحان یہ ہے کہ یہ اضافہ بعد کے ناشرین کی طرف سے ہے، جیسا کہ اس کتاب کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے، اور اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے، تب بھی تاویل کے پردہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدی کی اس آمد کا انکار ثابت ہوتا ہے، جس کے ثبوت کے اہلُ السنۃ والجماعۃ قائل ہیں، البتہ تاویل کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے دوسرے معتمد تلامذہ کی املائی کتابوں سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ محمد رضوان۔

[3] مولانا سندھی صاحب کے دیگر تلامذہ نے بھی مولانا سندھی صاحب کے حوالے سے مسیح اور مہدی کی آمد کے انکار کی فکر کو مختلف زاویوں سے کئی مقامات پر نقل کیا ہے، جن کا ذکر ہم دوسری جگہوں پر کر چکے ہیں۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

لیکن ہمارے بعض کرم فرما حضرات کو مولانا سندھی صاحب کے متعلق یہ رائے گوارا نہیں، البتہ مولانا سندھی صاحب کے مثنیٰ اور ان کی پسندیدہ شخصیت ''سرسید احمد خان'' کے متعلق انھیں ان چیزوں کے گوارا ہونے میں کوئی تأمل نہیں۔

ممکن ہے کہ اس فرق کی وجہ یہ ہو کہ حضرت تھانوی کے بقول، مولانا سندھی ''مولویوں کے سرسید احمد'' ہیں۔ واللہ اعلم

اس لیے ہم مولانا سندھی صاحب کے اس سلسلے میں چند حوالے جات وعبارات پیش ونقل کرتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب اپنی خود نوِشت میں لکھتے ہیں:

1922 عیسوی میں ترکی جانا ہوا، سات مہینے ماسکو میں رہا، سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا، اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعے کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا، کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا) میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کی ایک شاخ ہے، اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس، دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا جن میں ہندو بھی شامل ہیں، اور مسلمان بھی، سوشلسٹ بھی، اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ رُوس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گزار رہوں گا۔ اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ (ذاتی ڈائری، صفحہ ۲۲، ۲۳، ناشر: ادبستان، بیرون موچی دروازہ، لاہور، بارِ اول: اکتوبر 1946 عیسوی)

www.idaraghufran.org

مذکورہ خودنوشت عبارت میں مولانا سندھی صاحب نے سوشلزم کے مطالعے اور اس سلسلے میں سوویٹ روس کے تعاون اور اس نظام سے اپنے متاثر ہونے کا اعتراف فرمایا ہے۔ یاد رہے کہ سوویٹ روس کے تعاون کو بلی کے دودھ کی حفاظت سے زیادہ خوش فہمی کا مصداق نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس کا پروگرام بھی مولانا سندھی صاحب نے تحریری شکل میں مرتب فرمایا تھا، اس کا ذکر کچھ وضاحت کے ساتھ آگے آئے گا۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

''مولانا (عبیداللہ سندھی) روس، انڈین کانگریس کے ایک رکن کی حیثیت سے گئے۔ اس وقت لینن ابھی زندہ تھا۔ زار کا روس ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نیا اشتراکی روس بن رہا تھا۔ مولانا نے روس میں اشتراکی انقلاب کے کارکنوں کو سرگرم عمل دیکھا۔ ان کے ولولے، ہمتیں، قربانیاں، جفاکشیاں اور عزت، دولت اور منصب پانے کے خیال سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے خوشی خوشی جانیں دینا ایسی باتیں نہ تھیں کہ مولانا دیکھتے اور متاثر نہ ہوتے۔ ماسکو میں مولانا کا قیام تقریباً ایک برس تک رہا۔ افغانستان کے دورانِ قیام میں آپ نے علماء کی تنگ خیالی اور اسلامی حکومت کی گراوٹ کے بہت سے مناظر دیکھے تھے، اور انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ علم و مذہب اور دولت وحشمت کے یہ سب بے جان لاشے ہیں۔ اس کے بعد مولانا روس آئے تو انھوں نے بالکل نئی بنیادوں پر ایک نئے عالَم کو تعمیر ہوتے دیکھا۔ آپ ان معماروں کی اولوالعزمی اور بلند خیالی سے متاثر بھی ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی اسلام کے ساتھ شیفتگی کم نہ ہوئی۔ نیا روس بالکل لادینی تھا، اور مولانا پکے دین دار۔ لیکن مولانا کی دین داری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح دینی جذبہ سرگرمِ عمل پایا۔ مولانا ماسکو میں

بہت سے اشترا کی لیڈروں سے ملے۔ آپ کو اشترا کیت کے مبادی واصول کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا، اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوموں کو تسلیم کیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے اور اسلام، روسی انقلاب کی ان ساری بلندیوں سے بھی انھیں بلند تر نظر آیا''۔ (مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۳۳، ۳۴۔ بعنوان: حالاتِ زندگی۔ مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

مذکورہ عبارت میں تصریح ہے کہ مولانا سندھی صاحب کی دین داری نے روسی انقلابیوں کی اس لادینی اور کمیونسٹ تحریک میں بھی صحیح دینی جذبہ سرگرمِ عمل پایا، اور اسی وجہ سے اس انقلاب کی ہر اچھی چیز کو انھوں نے سراہا، اور انھوں نے اسی وجہ سے اس انقلاب برپا کرنے والوں کو معجزانہ قوم ہونے کی حیثیت سے تسلیم کیا۔

مذکورہ عبارت سے مولانا سندھی صاحب کا موقف بالکل واضح ہے، اگرچہ تاویلات کے زور پر دن کو رات، یا رات کو دن اور زمین کو آسمان ٹھہرا دیا جائے۔

مذکورہ کتاب مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی زندگی ہی میں شائع بھی ہوگئی تھی۔

پروفیسر محمد سرور صاحب مذکورہ کتاب ہی میں مزید لکھتے ہیں:

''حجاز میں مولانا نے دس بارہ سال کا طویل زمانہ گزارا، اور اس عزلت میں وہ اپنی گزشتہ زندگی اور اس کے تجربات کا برابر جائزہ لیتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنے افکار بھی مرتب کیے اور چونکہ ان افکار کی افادیت اور صداقت کو وہ عملی دنیا میں کامیاب ہوتا دیکھ چکے تھے، اس لیے ان کے سچے ہونے پر ان کو غیر متزلزل یقین تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اپنی اس بصیرت کو عام کریں اور طول طویل تجربوں کے بعد جو کچھ انھوں نے سیکھا ہے، اسے دوسروں کو بھی سکھائیں۔ لیکن حجاز والے نہ ان کی باتیں سمجھ سکتے تھے اور نہ انھیں ان کی ضرورت تھی۔ ان افکار و

خیالات سے صرف مولانا کے اہلِ وطن ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے جب انھیں واپس آنے کا موقع ملا تو انھوں نے حکومت کی وہ تمام قیود و شرائط مان لیں جن کو مانے بغیر ان کا ہندوستان آنا مشکل تھا۔ مولانا زندگی کے آخری دنوں میں صرف اسی غرض سے وطن آئے ہیں کہ اپنے اہلِ وطن کے سامنے اپنے چوبیس برس کے تجربات کا حاصل پیش کریں۔

7 مارچ 1939ء کو مولانا کراچی کے ساحل پر اترے اور آپ نے اترتے ہی اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ مولانا نئے عزم و استقلال کے ساتھ اپنے وطن لوٹے ہیں۔ چوبیس برس کا جلاوطنی کا زمانہ جو بقول ان کے پیہم خطرات کا سامنا کرتے گزرا اور اس طویل مدت میں شاید ہی ان کی ایک رات کبھی اطمینان سے کٹی ہو۔ مولانا بے تاب ہیں کہ اس طویل مدت میں جو جو باتیں ابھر ابھر کر ان کے دل کے اندر ہی اندر دبی رہیں، انھیں بے محابا کھلے بندوں سب کو سنائیں۔ مولانا کی یہ باتیں بعض لوگوں کو بڑی تلخ گزرتی ہیں، لیکن وہ جانتے نہیں کہ مولانا نے جو حقائق دیکھے ہیں وہ کتنے تلخ ہیں اور ان تلخ حقائق کا جاننا ہندوستان والوں کے لیے کتنا ضروری ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انھیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو، یہ گھروندے زمانے کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمھارا تمدن، تمھارا سماج، تمھارے افکار، تمھاری سیاست اور تمھاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو، لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں، تم مذہب کا نام لیتے ہو، لیکن یہ مذہب محض تمھاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو۔ یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہو یہ تو کفر سے بھی بدتر ہے۔ تمھارے امیر جاہ پرست ہیں، حکمران شہوات میں پڑے ہیں اور

غریب طبقے توہمات کا شکار ہو رہے ہیں۔ بدلو، ورنہ زمانہ تمھارا نشان تک بھی نہ چھوڑے گا۔ سنبھلو، ورنہ مٹا دیے جاؤ گے.....

مولانا کی ان باتوں سے اکثر لوگ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور ان کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں جھجکتے، یہ لوگ جانتے نہیں کہ ان کے ارد گرد دور و نزدیک کتنے بڑے بڑے طوفان اٹھ رہے ہیں، جن کے سامنے طوفانِ نوح کی بھی کوئی حیثیت نہیں، مولانا کی دور رَس نگاہ ابھی سے اس طوفان کو اٹھتا دیکھ رہی ہے، اور وہ اپنی قوم کو اسی آنے والے ہولناک انجام سے ڈراتے ہیں''۔ (مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۳۶ تا ۳۸۔ بعنوان: حالاتِ زندگی۔ مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

مذکورہ عبارت سے واضح ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے دل و دماغ اور حواس و اعصاب پر کمیونسٹ انقلاب کی ھیبت و دہشت اور اس سے گزر کر پھر رعب و عظمت کس درجے کی قائم ہو چکی تھی کہ اس کے سامنے آپ کو کوئی تہذیب، تمدن، سیاست و ریاست، حتّٰی کہ خود اسلام کی عالی شان روایات و تہذیب اور مسلمانوں کی ہزار سال سے قائم معاشرت و اجتماعیت کانٹے کی طرح کھٹکتی گئیں، اور تارِ عنکبوت کی طرح بودی و بے اعتبار اور دیر سویر میں کمیونزم کے سیلابِ بلا کی نذر ہونے کے لیے آمادہ و تیار نظر آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی سوچ و ذہنیت نفسیاتی عوارض کے زمرے میں آتی ہے، جس کو حضرت مدنی نے آپ کے قیامِ مکہ کے زمانے میں ہی بھانپ لیا تھا، اور ''مدینہ، اخبار'' والے بیان میں اس کا اظہار کیا، اس طرح بعض دیگر اہلِ نظر بھی۔

اس سلسلے میں مولانا سندھی صاحب کو اکثر لوگوں کا سیخ پا ہونا اور برا بھلا کہنا بھی متاثر نہیں کرتا، کیونکہ ان کی دور رس نگاہ کے سامنے روس کا انقلاب طوفانِ نوح جیسی طاقت رکھتا ہے۔

مگر افسوس کہ یہ انقلاب اب ''نسیاً منسیا'' ہو چکا ہے، اور مولانا سندھی صاحب کی اس

دوررس نگاہ کا راز فاش ہوگیا ہے۔

پروفیسر صاحب اسی مذکورہ کتاب میں مزید لکھتے ہیں:

''اشتراکیت اپنے اصول ومبادی کے اعتبار سے خالص بین الاقوامی تحریک ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک قوم کو اشتراکی بنانا نہیں، بلکہ ایک اشتراکی تو اس دن کی تمنا رکھتا ہے، جب ساری دنیا اشتراکیت قبول کرلے گی۔ طبقات کی موجودہ تقسیم مٹ جائے گی، اور روئے زمین پر انسانوں کا صرف ایک ہی طبقہ نظر آئے گا۔ یہ ہے مشن جو اشتراکیت کے داعیوں کے پیشِ نظر ہے''۔ (مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۲۴۵۔ بعنوان: مسلمانوں کی قومی حکومتوں کا دور۔ مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

مذکورہ عبارت سے صاف واضح ہے کہ اشتراکیت کے داعیوں کے پیشِ نظر طبقات کی فطری اونچ نیچ کو مٹا کر سب انسانوں کو ایک طبقہ بنانا ہے، اسی وجہ سے یہ اشتراکیت اصول ومبادی کے اعتبار سے خالص ''بین الاقوامی تحریک'' ہے۔

مگر افسوس کہ مولانا سندھی صاحب کی اس ''بین الاقوامی تحریک'' کا اب روس میں بھی وجود نہیں، چہ جائے کہ اس کو بین الاقوامی درجہ دیا جائے۔

جب مولانا سندھی صاحب کی طرف سے اشتراکیت کو ایک ''بین الاقوامی تحریک'' تسلیم کرلینے پر شکایت کی گئی، تو انھوں نے اس شکایت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، اور اپنے موقف پر تادمِ حیات مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

چنانچہ پروفیسر سرور صاحب مذکورہ کتاب کے اگلے ایڈیشن کی اشاعت کے موقع پر آغاز میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب (مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار) میں سوشلزم، کمیونزم اور سوویت یونین پر بحثیں بھی ہیں۔ اسی کی بنا پر بعض لوگوں نے مولانا

www.idaraghufran.org

سے شکایت کی تھی کہ اس کتاب میں ان کے حوالے سے سوشلزم کا پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ مولانا نے اس شکایت کو قابلِ توجہ نہ سمجھا اور کتاب کے ہر اندراج پر صاد فرمایا۔ مولانا اشتراکیت کو ایک بین الاقوامی تحریک مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ہے روسی اشتراکیت کا عمومی پہلو اور ایک ہے اس کا قومی پہلو اور ان میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔ مولانا کمیونسٹ نہیں تھے، لیکن میں نے ان کی زبان سے کمیونزم کی مخالفت کبھی نہ سنی۔ اس معاملے میں ان کا سیاسی مسلک آج جسے ''قومی جمہوری'' کہا جاتا ہے، کم وبیش وہی تھا۔ خود مولانا کے الفاظ میں: ''یہ مشینی دور اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔ روس میں مشین پر کام کرنے والے کاری گروں اور مزدوروں نے خود اپنی حکومت بنا لی ہے۔ جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے مزدور اور کاری گر انقلاب برپا کریں گے، اس وقت اگر وہاں کے کاشتکار بھی منظّم ہو چکے ہوں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ مزدوروں اور کاشت کاروں کا یہ انقلاب ہمارے ہاں بھی آ کر رہے گا''

یہ کتاب اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اور تقریباً ایک برس بعد اگست ۱۹۴۴ء میں آپ کا انتقال ہوا''۔ (مولانا عبیداللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، ص ۷، بعنوان: اشاعتِ پنجم، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔ سنِ اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء)

مولانا سندھی صاحب جس کمیونسٹ انقلاب کا ہندوستان کا مقدر ہونے کی پیشین گوئی 1940 عیسوی کے عشرے میں بڑے پرزور انداز میں فرما رہے تھے، آئندہ کی 5 دھائیوں (1990 عیسوی تک) میں اس انقلاب کو اس خطے کا مقدر بنانے کے لیے بہت کچھ ایڑی چوٹی کا زور لگانے والوں نے زور لگایا، متحدہ ہند میں بھی (1947 عیسوی تک) اور تقسیم کے بعد دونوں حصوں بلکہ پورے جنوبی ایشیاء میں کمیونسٹ لابیاں، پارٹیاں، طبقے، حلقے اور اشرافیے، اس سرخ انقلاب کے لیے یہاں سرگرم رہے، حتّٰی کہ 1980 عیسوی کے عشرے

کے بالکل آغاز میں کمیونزم کی مرکزی ہائی کمان، ماسکو اور کریملن کے ایوانوں میں اس پر صاد کر چکیں کہ ''دریائے آمو'' پار کر کے افغانوں کے کوہ ودمن کو تسخیر وعبور کر کے بحرِ ہند کے ساحلوں کراچی وگوادر پر جا کر ہی اب سانس لینا ہے، پھر وہاں سے بحرِ ہند کے گرم پانیوں میں اتر کر بحری یلغار کر کے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ تک بلا خوف وخطر سرخ انقلاب کے پھریرے لہرانے ہیں، لیکن ان سب باتوں کو عملی جامہ حاصل نہ ہوسکا۔

مولانا سندھی صاحب نے وطن واپسی سے پہلے ہندوستان کی حکومت کے لیے، جو پروگرام مرتب کیا تھا، اس میں بھی آپ نے اشتراکی تحریک کو پوری طرح سراہا تھا، اور اس میں ایسی عبارات صراحت کے ساتھ موجود ہیں کہ ایک منصف وغیر متعصب کو سمجھنا دشوار نہیں۔

چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے اس انقلابی دور کے دوسرے معتمد رفیق اور شاگرد جناب ظفر حسن ایبک صاحب لکھتے ہیں:

> ''قبلہ مولانا (عبیداللہ سندھی) صاحب نے بحث ومباحثہ کے بعد ترمیم کر کے ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لیے جو پروگرام مرتب کیا تھا، اس کے اہم مواد کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں''۔ (خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ ۲۹۵، سولہواں باب ''استنبول کے قیام کے دوران ہماری سیاسی سرگرمیاں'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

پھر اس کے بعد قبلہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مرتب کردہ اس پروگرام کے مواد کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے جناب ظفر حسن ایبک صاحب لکھتے ہیں:

> ''فوائدِ عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیے جائیں گے، انفرادی اور ذاتی ملکیت (منقولہ وغیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی حد سے زیادہ جائیداد اور مال قومی ملکیت ہوگا)

مال داروں پر متزائد ٹیکس لگایا جائے گا، جس کی آخری حد (50) فی صدی ہوگی۔
ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی، اور نظامِ زمین داری منسوخ کر دیا جائے گا (ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، پارٹی فاروقِ اعظم کے فیصلے کے مطابق، زمین داروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر، اور امام ابوحنیفہ کے فیصلے کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی)
ہر کاشت کار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی، جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے''۔ (خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ ۲۹۹، سولہواں باب ''استنبول کے قیام کے دوران ہماری سیاسی سرگرمیاں'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ایک دوسرے رفیق و معاون اور مستند ترجمان پروفیسر محمد سرور صاحب مولانا سندھی کے ''افادات وملفوظات'' کے ذیل میں سوشلسٹ نظام کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے ایک مضمون میں، جو آپ کے وطن واپس آنے کے موقع پر لاہور کے بعض اخبارات میں چھپا تھا، آپ نے لکھا تھا:
''۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا، سات مہینے ماسکو میں رہا، سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ (آل انڈیا) نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا، اس لیے سوویت یونین نے اپنا معزز مہمان بنایا، اور مطالعے کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں''
ماسکو سے آپ استنبول پہنچے، انھیں خیال تھا کہ وہ ترکی میں رہ کر اپنا سیاسی کام زیادہ آسانی سے کر سکیں گے، چنانچہ 1924ء میں استنبول سے مولانا نے اپنا نیا پروگرام شائع کیا، جسے چھپوا کر ہندوستان بھجوایا گیا۔

اس پروگرام کی ابتدا یوں ہوئی:

اللہ اکبر

مہابھارت سرو راجیہ پارٹی

ہندوستان کلاں کی جمہوری جماعتوں کی مجلس کا نظامِ عمل

اس پروگرام میں ہندوستان کے مسئلے کو ایک ایسے سوشلسٹ نظام کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی، جس میں مذہب اور چھوٹے پیمانے کی ذاتی ملکیت کو برقرار رکھا گیا ہے، اصول و مقاصد میں سب سے پہلے یہ صراحت کی گئی کہ ہندوستان مختلف ممالک کا مجموعہ ہے، اور یہ کہ اسے ''ایک ملک فرض کر کے نئی ہندوستانی واحد قومیت پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی'' نہ بنایا جائے، نیز ہندوستان میں بسنے والی اقوام کو ایک فیڈرل نظام میں جمع کیا جائے۔

اس پروگرام کی ایک شق یہ بھی تھی:

(۱) فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت قرار دیے جائیں گے۔

(۲) انفرادی ملکیت (منقولہ و غیر منقولہ) محدود کردی جائے گی، یعنی حد سے زیادہ جائیداد قومی ملکیت قرار دی جائے گی۔

(۳) سر راجیہ ہند کی ان جمہوریتوں میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پارٹی فاروقِ اعظم کے فیصلے کے مطابق، زمین داروں کو ملکیتِ اراضی چھوڑنے، اور امام ابوحنیفہ کے فیصلے کے مطابق مزارعت (بٹائی) چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔

(افادات وملفوظات ص ۴۶ و ۴۷، بعنوان: مکہ معظمہ علمی وسیاسی دلچسپیاں، مطبوعہ: سندھ ساگر اکیڈمی، سنِ اشاعت: اپریل ۲۰۱۴)

مولانا سندھی صاحب نے اپنے پروگرام میں فوائدِ عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت قرار دیے جانے، اور انفرادی اور ذاتی ملکیت کو محدود کرنے کی تصریح کردی ہے، جس سے مولانا سندھی صاحب کے اشتراکیت سے متعلق موقف کو منصفانہ طریقہ پر سمجھنے میں زیادہ دشواری

www.idaraghufran.org

پیش نہیں آئے گی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح پروفیسر محمد سرور صاحب، مولانا سندھی صاحب کے شاگردِ خاص اور معتمد رفیق وترجمان سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح ظفر حسن ایبک صاحب کا بھی معاملہ ہے۔ اور جو بعض حضرات اس قسم کی باتیں سامنے آنے پر مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ان رفقاء وترجمانوں کو مولانا سندھی صاحب کے غلط ترجمان، بلکہ مولانا سندھی صاحب پر بہتان لگانے والے قرار دیتے ہیں، اس میں وزن محسوس نہیں ہوتا۔ [1]

---

[1] ظفر حسن ایبک کی ''آپ بیتی'' کے مقدمے میں جناب شریف الحسن صاحب لکھتے ہیں:

ظفر حسن صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی صحبت میں گیارہ سال افغانستان، روس اور ترکی میں بسر کیے، مولانا مرحوم سے سیاسی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ تفسیر قرآن شریف اور شاہ ولی اللہ کی حکمت وفلسفے کا درس بھی لیا ہے۔ (خاطرات ''آپ بیتی''، صفحہ ۲۲، مقدمہ، از: شریف الحسن، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

جناب ظفر حسن ایبک صاحب اپنے قیامِ افغانستان کے زمانہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قبلہ مولانا (سندھی) صاحب مرحوم نے ہمیں قرآن شریف کی تفسیر پڑھانے کا فیصلہ کیا، اس درس میں میرے ساتھ شیخ عبدالقادر اور شیخ خوشی محمد شریک ہوئے تھے، شیخ عبدالقادر اور میں درس کے بعد نوٹ لکھ لیا کرتے تھے، کچھ دنوں بعد شیخ عبدالقادر کو اس مشن کی وجہ سے جس کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا، کابل سے جانا پڑا، اس لیے ان کا درس ادھورا رہ گیا، انھوں نے اپنے نوٹ ''الدین والسیاسۃ فی القرآن'' کے عنوان سے ایک کاپی میں مرتب کیے تھے، لیکن افسوس ہے کہ وہ نوٹ ضائع ہوگئے، خوشی محمد نے میرے ساتھ اس درس کو چند ماہ اور جاری رکھا، لیکن بعد میں اس نے بھی سبق پڑھنا چھوڑ دیا، میں نے اس کے بعد اور دو سال تک قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے فیض حاصل کیا، میں نے اپنے نوٹوں کو ''المذہب والسیاسۃ فی القرآن'' کی سرخی سے لکھا، ان درسوں میں جن سورتوں اور سپاروں کی تفسیر میں نے پڑھی، ان کا انتخاب خود مولانا مرحوم ہی کیا کرتے تھے، اور اس انتخاب میں اس وقت کے حالات اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے تھے، شکر ہے کہ یہ نوٹ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں، خدا کرے کہ کبھی ان کو بھی چھپوانا نصیب ہوجائے، تاکہ دوسرے نوجوان مسلمان بھی ان سے ایسے ہی مستفیض ہوں، جیسا کہ جوانی میں، میں ہوا تھا، جب کہ مختلف کتابوں، بدلے ہوئے ماحول اور نئے نئے نظریات کی وجہ سے ایمان میں کچھ نہ کچھ تزلزل واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ (خاطرات ''آپ بیتی''، صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶، چھٹا باب ''کابل میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کا ورودِ مسعود اور حکومتِ موقتہ ہند کی سرگرمیاں'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی''، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

www.idaraghufran.org

جناب ظفر حسن ایبک صاحب لکھتے ہیں:

قبلہ مولانا (سندھی) صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں یونیورسٹی میں داخل ہوجاؤں، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے کمیونسٹوں کے اصولِ تعلیم اور کمیونزم کے بنیادی عقائد کا پتہ لگائیں، تاکہ آزاد ہندوستان میں ایسا نظام قائم کرسکیں، جو کمیونزم کا توڑ ہو، اور ہندوستان کے عوام اس نظام سے ایسے خوش حال بنیں کہ کمیونزم کے پروپیگنڈے پر کان نہ دھریں، اور اس کے پھندے میں نہ پھنسیں، اس کے علاوہ ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ کمیونزم جو مذہب کا دشمن ہے، اس سے ہندوستان میں اپنے مذہب کو بچانے کے لیے کچھ تدبیریں سوچیں، نیز اس بارے میں بھی اپنی واقفیت بڑھائیں کہ کمیونسٹوں سے، انگریزی سامراج کو نیست ونابود کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے میں مدد لینے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ (خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ، ۲۳۷، تیرہواں باب ''ماسکو یونیورسٹی میں میرا داخلہ'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی صاحب کو کمیونسٹوں کے اصولِ تعلیم اور بنیادی عقائد کا پتہ لگانے کی بڑی فکر لاحق تھی، اسی وجہ سے انھوں نے خود بھی اعتراف فرمایا کہ روسی حکومت نے اس سلسلے میں مطالعے کے لیے، ان کو ہر قسم کا تعاون فراہم کیا تھا۔

تاکہ اس کی روشنی میں مولانا سندھی صاحب ہندوستان کے لیے کوئی نظام مرتب کرسکیں، جس کا ذکر پہلے گزرا۔

جناب ظفر حسن ایبک صاحب کو کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو جو اسلامی احکام وعقائد کے خلاف ہوتے تھے، ان کا حل جس طرح مولانا سندھی صاحب کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا، خود جناب ظفر حسن ایبک صاحب کے قلم سے اس کا حال ملاحظہ کرنے والا شخص ''بارش سے بچ کر

پرنالے کے نیچے جا کھڑے ہونے''۔ کی مثال سوچنے پر مجبور ہوگا۔

چنانچہ جناب ظفر حسن ایبک صاحب مذکورہ تمہید کی تفریع و تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

روس میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی، یہ حکومت کارل مارکس کے تمام نظریات کو روس میں عملی جامہ پہنا کر ساری دنیا میں مزدوروں کی مطلق العنان حکومت (Dictatorship of The Proletariate) قائم کرنا چاہتی ہے۔

میں ہر روز شام کے وقت، یونیورسٹی کے لیکچر ختم ہونے پر ہوٹل لکس میں جا کر اس روز کے پڑھے ہوئے سبقوں کا خلاصہ قبلہ مولانا (سندھی) صاحب کو سنایا کرتا تھا، جس سے ان کو کمیونسٹ نظریوں، کمیونسٹ اصولِ حکومت، مزدوروں کی تحریک (Labour movement) اور کمیونسٹ انٹرنیشل یعنی تھرڈ انٹرنیشنل جس کو مختصراً کومینٹرن (Comintern) کہا جاتا تھا، کے بارے میں آہستہ آہستہ کافی سے زیادہ معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔.....

اس سلسلے میں کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو، جو اسلامی احکام اور عقائد کے خلاف تھے، وہ بھی قبلہ مولانا صاحب پر واضح ہوگئے تھے، میرے دل میں اس مضر تعلیم کی وجہ سے اسلام کے بارے میں جو شک وشبہ اور ذہنی تشویش پیدا ہوسکتی تھی، میں اس کو مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ان سے اس کا شافی اور اطمینان بخش جواب اور صورتِ حل پوچھ لیا کرتا تھا۔ (خاطرات ''آپ بیتی'' صفحہ، ۲۴۳، ۲۴۴، تیرہواں باب ''ماسکو یونیورسٹی میں میرا داخلہ'' مؤلف: ظفر حسن ایبک، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی''، مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

جناب ظفر حسن ایبک صاحب مزید لکھتے ہیں:

www.idaraghufran.org

ایک روز ہمیں یونیورسٹی میں پڑھایا گیا کہ ذاتی ملکیت کو جو مذہب بھی جائز سمجھے، وہ قدامت پسند ہے، کیونکہ وہ غریبوں کو مال داروں کا غلام بناتا ہے اور ان کا استحصال (Exploitation) کراتا ہے، اس لیے ایسے مذہب کا قلع قمع ہونا چاہیے۔

ہندومت میں ذاتی ملکیت کھلم کھلا موجود ہے، اس لیے بنیر جی اس سبق کے بعد کچھ کھسیانا سا ہو گیا، کیونکہ وہ اب ہندومت کی کبھی تائید اور حمایت نہیں کر سکتا تھا، اس پر اس نے اسلام پر حملہ کرنا چاہا اور اس غرض سے مجھ سے پوچھا: ''کیا اسلام ذاتی ملکیت کی اجازت دیتا ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''ہاں دیتا ہے''، اس پر اس نے اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینے کو بڑے اطمینان سے کہا: ''پھر تو ہم کو ہندوستان سے ہندوازم کے ساتھ اسلام کو بھی مٹا دینا ہوگا''۔

میں اس وقت اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا، چونکہ اس سے میرے دل میں اسلام کے متعلق ذرا شبہ پیدا ہو گیا۔

شام کے وقت اپنی عادت کے مطابق ہوٹل لکس جا کر میں قبلہ مولانا (سندھی) صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بنیر جی کا اعتراض اور اسلام پر جو اس نے حملہ کیا تھا اس کو ان کی خدمت میں عرض کیا، اور اس کا جواب ان سے پوچھا۔

انھوں نے فرمایا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ''

یعنی ''اللہ نے مومنوں کے مال کو اور ان کی جانوں کو ان سے جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے''

اس سے یہ معنیٰ نکلتے ہیں کہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کو اپنی جان اور ذاتی مال سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور ان کو خداوند کریم آخرت میں اس کے عوض

www.idaraghufran.org

جنت دے گا، یعنی اسلام میں ذاتی ملکیت کا اصول ضرورت کے وقت بالکل اٹھایا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب نہیں، جس میں ذاتی ملکیت کے اصول کا ہمیشہ رکھا جانا ضروری ہو، اگر ضرورت پیش آئے، اور زمانے کا حال ایسا ہو جائے کہ اس میں ذاتی ملکیت قائم رکھنے کی وجہ سے مسلمان اپنے مذہب کو اور اپنے ایمان کو خطرے میں دیکھیں، تو ذاتی ملکیت کے اصول سے دست بردار ہو سکتے ہیں، اور اس اصول کو بدل سکتے ہیں، لہٰذا اسلام ایک قدامت پسند مذہب نہیں، جو مال داروں کو ناداروں کے استحصال کی اجازت دے، یا اس کا موقع دے۔

قبلہ مولانا صاحب کی اس تفسیر سے مجھے بہت اطمینان ہوا اور میرا اسلام پر ایمان اور بھی مضبوط ہو گیا، اس سے بنیر جی کو ایک ایسا جواب ملا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔ [1]

ایک روز ہمارے پروفیسر نے کہا کہ ”سوویٹ نظام حکومت قائم کرتے ہوئے ہمیں سب سے زیادہ مخالفت کسانوں کی طرف سے پیش آئی، کیونکہ وہ زمین کو

---

[1] اشتراکیت اور نیشنلائزیشن کے مدعی حضرات کی طرف سے پیش کردہ، اس قسم کے دلائل کے، اہلِ علم حضرات نے موثر جوابات بیان کر دیے ہیں۔

مولانا سندھی صاحب نے اوپر جس آیت کو پیش فرمایا، اس کے متعلق مفسرین کی تفاسیر موجود ہیں، کسی نے بھی اس آیت سے مملوکہ اور شخصی اشیا کے نیشنلائز ہونے کے جواز کی دلیل نہیں پکڑی۔

جنت کے بدلے میں جان و مال خرچ کرنے کے مصارف خود شریعت نے بیان کر دیے ہیں، اس طرح کی آیات سے جس طرح اس شخص کو دلیل پکڑنا جائز نہیں، جو لوگوں کے مملوکہ اموال کو ان سے جبراً یا چوری وغیرہ سے وصول کر کے غربا و مساکین کا تعاون کرے، اسی طرح حکومت کے لیے بھی امیر لوگوں کے مملوکہ اموال کو جبری وصول کرنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور فقہائے کرام سے بھی اس طرح کے نیشنلائزیشن کا جواز ثابت نہیں ہوتا، جس کے مولانا سندھی صاحب مدعی ہیں۔

کسی کی جائز شخصی ملکیت کو چھین کر اس طرح نیشنلائزیشن کرنے کے بطلان پر قرآن وسنت کی بے شمار نصوص شاہد ہیں۔

مولانا سندھی صاحب چونکہ خواہ مخواہ سمجھے ہوئے تھے کہ روس کا اشتراکی نظام اختیار کیے بغیر چارا نہیں، اس لیے ایسی ضرورت و مجبوری میں اسلام کے احکام کو توڑ موڑ کر یا کوئی بھی تاویل کر کے اس نظام کو اپنانا پڑے گا، اس لیے وہ اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر رکھنا چاہتے تھے اور زراعتی کومیون (یعنی مشترک ملکیت والی زراعتی کواوپارتیف) بنانا نہیں چاہتے تھے، کوئی مذہب ان کو اس خیال سے ہٹانے کے لیے مذہبی احکام پیش نہیں کرتا، اس لیے سارے مذاہب رجعت پسند ہیں، لہٰذا صفحۂ ہستی سے مٹائے جانے کے لائق ہیں''۔

سبق کے بعد شام کو ہوٹل لکس میں جا کر میں نے پروفیسر کے اس نظریے کا قبلہ مولانا صاحب سے ذکر کیا اور پوچھا: ''کیا اسلام بھی زمین کی ملکیت منفرد اشخاص کو دینا چاہتا ہے''۔

اس پر انھوں نے فرمایا کہ نہیں! اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران فتح کیا تو عرب فاتحین نے ایران کی زمینوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر ان پر قبضہ کرنا چاہا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی قوت بازو سے ان کو حاصل کیا تھا۔ لیکن حضرت عمر نے ان کو ایسی اجازت نہ دی اور ساری زمینوں کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور فاتحین کو صرف ان زمینوں کی کاشت کا حق عطا فرمایا''۔ [1]

میں نے اگلے روز یونیورسٹی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا اور اس اسلامی قانون کا ذکر اپنے اسی پروفیسر سے کیا، اس پر وہ بہت اچنبھے میں پڑا اور کہنے لگا: ''اگر کوئی شخص ہم کو اسلام کے یہ احکام پہلے بتلاتا، تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا اور ہم کسانوں کو اپنی انقلابی صفوں میں بڑی آسانی سے داخل کر لیتے اور

---

[1] مولانا سندھی صاحب کے اس موقف اور دلیل سے ہمیں اتفاق نہیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ فیصلہ جو فرمایا تھا، وہ اس زمین کے متعلق فرمایا تھا، جو عراق فتح ہونے کے بعد ابھی تک کسی کی شخصی ملکیت میں نہیں آئی تھی، اور وہ مفتوحہ زمین تھی، جس میں اسلامی حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

جب کہ مولانا سندھی صاحب، اس سے ان زمینوں کو بیت المال کی ملکیت اور نیشنلائزیشن قرار دینا چاہتے ہیں، جو لوگوں کی شخصی ملکیت ہوں، جو کہ قیاس مع الفارق ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عدالتی فیصلے، ج۲ ص۹۸، مضمون ''ملکیتِ زمین کا مسئلہ'' از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات، لاہور، اشاعتِ دوم: مارچ 2000 عیسوی)

www.idaraghufran.org

ہماری حکومت ان کی مخالفت سے بچی رہتی''۔(خاطرات ''آپ بیتی''صفحہ،۲۴۴ تا ۲۴۶، تیرہواں باب ''ماسکو یونیورسٹی میں میرا داخلہ'' مؤلف: ظفر حسن ایبک ، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی''مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

مذکورہ عبارت سے صاف ظاہر ہوا کہ مولانا سندھی صاحب نے جو نظریہ پیش کیا تھا، اس میں روسی حکومت کی مخالفت سے بچنے کا سامان موجود تھا، جس سے ہر صاحبِ عقل وخرد حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

پیچھے مولانا سندھی صاحب کا ہندوستانی حکومت کے لیے پیش کردہ نظام گزر چکا ہے، مذکورہ عبارت میں مولانا سندھی صاحب نے اپنے تئیں اس کے شرعی دلائل بھی پیش فرمادیے۔

مولانا سندھی صاحب کی طرف سے اشتراکیت سے متعلق پیش کردہ دلائل کا جناب ظفر حسن ایبک صاحب پر اتنا اثر تھا کہ جب ان کو مولانا سندھی صاحب کی جدائی کا سامنا کرنا پڑا، تو ان کو یہ سخت گراں گزرا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وہ (یعنی مولانا سندھی صاحب) جولائی 1923ء کے وسط میں عزیز احمد کو ساتھ لے کر ترکی روانہ ہوگئے .....قبلہ مولانا صاحب کی جدائی مجھ پر سخت گراں گزری، کیونکہ میں ہمیشہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں سے مستفید ہوتا رہتا تھا، روس جیسے لامذہب ملک میں ان کے بغیر میرا رہنا بہت دشوار تھا، لیکن کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا، کیونکہ روسیوں نے مجھے اس وقت ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی تھی۔ (خاطرات ''آپ بیتی''صفحہ،۲۶۳، چودھواں باب ''مولانا کی روسی وزیر خارجہ چچرن سے ملاقاتیں'' مؤلف: ظفر حسن ایبک ، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی'' مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، تاریخ طبع: 1990 عیسوی)

مذکورہ مختلف عبارات کے مجموعہ سے مولانا سندھی صاحب کے دماغ پر روس اور اشتراکی تحریک کے چھانے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اپنے لفظوں میں، مولانا

سندھی صاحب کی طرف یہ بات منسوب کرے، تو مولانا سندھی صاحب کے بعض معتقدین کو یہ بہت بڑا الزام محسوس ہوتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی طرف منسوب کئی دوسری کتب میں بھی اشتراکیت کی حمایت وتائید کا پُر زور انداز میں ذکر آیا ہے، ''قرآنی شعورِ انقلاب'' نامی کتاب میں بھی جگہ جگہ اس پر زور دیا گیا ہے، لیکن ہر جگہ کا انداز مختلف ہے، جس کی وجہ سے بعض مقامات کی تاویل کر کے اعتراض ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ حقائق کو تاویلات کی وجہ سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے اس سلسلے میں جو فکر اختیار کی، متعدد اہلِ علم واہلِ قلم حضرات نے اس کا ذکر کیا۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

> اصل یہ ہے کہ مولانا کے دل ودماغ پر روس اور اسٹالن چھائے ہوئے ہیں۔ جس طرح اسٹالن، اشتراکیت کے اصولوں میں ترمیم کر کے اسے قومی رنگ دینے میں کامیاب ہورہا ہے، اسی طرح ہمارے مولانا بھی اسلام کو قومی لباس پہنانا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی قومی پارٹی بنانا چاہتے ہیں، جو بین الاقوامی رجحان رکھتی ہو، اسی لیے وہ ٹروٹسکی جیسے ''مومن قانت'' اشتراکی کے مقابلے میں، اسٹالن جیسے ہوشیار اور زمانہ ساز کو پسند کرتے ہیں..... یہ سب کچھ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں پورے نو صفحے (ص۲۲۰-۲۲۹) اسلام اور اشتراکیت کی مماثلت کی نذر کیے گئے ہیں۔ افسوس کہ مضمون کی تنگ دامانی، طول طویل اقتباس کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے صرف اس کا ابتدائی حصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جس میں اس ''مشابہت ومماثلت'' سے برأت ظاہر کی گئی ہے۔

www.idaraghufran.org

''حاشا وکلّا، ہمارا مقصود یہاں کسی قسم کا مقابلہ کرنا نہیں ہے، اور نہ کسی طرح کی مشابہت ثابت کرنے کی غرض ہے، لیکن تاریخِ اسلام کے ان ادوار کو سمجھنے میں اس زمانے کی ایک اور بین الاقوامی تحریک سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ تحریک ہمارے سامنے اٹھی، اُبھری اور پھیلی، اور مختلف مراحل سے گزری ہے..... ہماری مراد اشتراکیت کی تحریک سے ہے''۔ (ص ۲۲۰)

غرض تو ''مشابہت'' ثابت کرنے کی نہیں ہے، لیکن اسلام کے تاریخی ادوار کو آپ دیکھتے ہیں اشتراکیت ہی کی تاریخ کی روشنی میں ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' میں بھی ایک موقع (ص ۱۲۳، حاشیہ) پر یہ مماثلت پیش کی گئی ہے۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۴۴ و ۲۴۵، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں 3 جون 1939ء کو کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ایک اجلاس میں ان (مولانا عبیداللہ سندھی صاحب) کے صدارتی خطبے کی یہ چند باتیں ملاحظہ ہوں:

''ہماری سیاست نیشنلزم کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ ہندو مسلمان، سکھ اور دوسرے فرقوں کے اہلِ علم وفکر اپنے اپنے مذہب کی حقیقی روح اور سوشلزم میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کریں۔ جمعیۃ العلمائے ہند شاہ ولی اللہ کو اپنی انقلابی سیاست کا امام بنائے، اس سے اسلام کی صورت اور معنیٰ دونوں محفوظ رہ سکیں گے، اور اسلام اور سوشلزم میں مطلوبہ ہم آہنگی بھی ممکن ہوگی۔ سیاست میں یورپی طرزِ قومیت اور اقتصادیات میں سوشلزم کو اپناؤ''۔ مولانا سندھی نے اپنے اس خطبہ میں کوٹ، پتلون اور ہیٹ پہننے کو سراہا اور ڈاڑھی اور خاص وضع قطع کو ہم نے جو مقدس بنالیا

ہے، اسے غلط ٹھہرایا۔ (افادات وملفوظاتِ مولانا عبیداللہ سندھی، ص ۷۳، ۱۲۱)

اس خطبے میں جس سوشلزم کو اپنانے اور اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور جس کے متعلق روس اور ترکی سے آنے کے بعد مولانا اکثر فرماتے تھے کہ وہ عن قریب پوری دنیا پر چھانے والا ہے، الحمدللہ، جہادِ افغانستان نے اس سوشلزم کا جنازہ نکال دیا ہے، اور یہ کارنامہ دین کے محافظ بڑی بڑی ڈاڑھی رکھنے والے ان ہی علماء کے ہاتھوں سر ہوا، جنھوں نے خاص اسلامی وضع قطع ہی کو مقدس سمجھا۔ فلسفۂ سوشلزم کی بدبودار لاش خود اپنی جنم بھومی میں ہمیشہ کے لیے اب دفن ہو چکی ہے۔

زندگی کا ہر وہ نظام جو فطرت کے خلاف ہو، اس کو دوام نہیں، اسلام دینِ فطرت ہے، اس لئے صرف اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ دونوں نظام غیر فطری ہیں، اس لیے ان کے دوام کی ضمانت نہیں۔ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں واضح اصول وہدایات رکھتا ہے۔ اسلام کا نظامِ معیشت نہ سرمایہ دارانہ ہے اور نہ ہی سوشلزم واشتراکی نظام سے اس کا تعلق ہے۔ اسلامی نظام کے لبادے میں اپنے گمراہ کن غیر فطری اقتصادی فلسفے کو ''اسلامی سوشلزم'' کا نام دینا ایسا ہی غلط اور کج فہمی پر مبنی رویہ ہے، جس طرح اشتراکی نظام کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے طبقاتی نظام کے ظالمانہ اصولوں کو اسلامی سانچے میں فٹ کرنے کی سعی رائیگاں کرنا، گمراہ کن اور غلط رویہ ہے۔ پھر جس طرح زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اسلام کے ضابطۂ حیات کو صرف عقائد وعبادات تک محدود کرنا درست نہیں، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ گمراہ کن نظریہ یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد وہدف صرف اقتصادی یا سیاسی نظام کا قیام قرار دیا جائے۔ اسلام عقائد وعبادات، معاشرت ومعیشت، سیاست وحکومت کے تمام شعبوں میں

فطری اور منصفانہ نظام کا نام ہے۔ جس نے اس کو کسی ایک میں محصور کیا، اس نے انصاف نہیں کیا۔ کسی ایک کو اس کا مقصد ٹھہرالیا، وہ اسلام کی روح سے ناواقف رہا۔ پھر اسلام کے ہمہ گیر اصول ہر شعبے میں صاف واضح اور بے غبار ہیں، کسی شعبہ میں کسی ایک شخصیت کے مشکوک افکار کو اسلامی نظام کے طور پر پیش کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ کام چاہے کوئی اسلامی جذبے ہی سے کیوں نہ کرتا ہو، تاہم مسلمانوں میں فتنے ہمیشہ اسلامی جذبات کے غلط استعمال ہی سے بنتے اور ابھرتے رہے ہیں۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۳۹ تا ۳۴۱، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

اور جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب لکھتے ہیں:

مولانا عبیداللہ سندھی جب سات سال افغانستان میں، چار ماہ سوویت یونین روس میں اور تین چار سال ترکی وغیرہ میں رہ کر مکہ پہنچے، تو نئے دور کے نئے انقلاب کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد موصوف اس نتیجہ پر پہنچے کہ کمیونزم اور ترقی پسندی کا سیلاب تیزی سے آرہا ہے، جو آہستہ آہستہ سارے مسلمان ممالک کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا، وسطِ ایشیاء کے مسلمانوں کی حالتِ زار، ترکی میں مصطفیٰ کمال کی طرف سے دین و مذہب اور اس کی ساری علامتوں اور نشانات کے خلاف جنگجوئی کرتے ہوئے دیکھ کر مولانا نے محسوس کیا کہ مذہب کے خلاف کمیونزم اور جدیدیت کی لڑائی دراصل جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں اور مولوی کی ذہنی قدامت پسندی کے خلاف ردِعمل ہے، اگر دین و مذہب کی ایسی تشریح کی جائے، جس میں انقلابیت، عالمگیریت، زندگی کی مکمل تبدیلی، وحدتِ انسانیت، وحدتِ مذاہب، معاشی مساوات، معیشت کے سلسلے میں ریاست کے لامحدود اختیارات، نیشنلائیزیشن اور جدید تہذیب کے نئے نشانات، سوٹ، ٹائی

اور عورت کی آزادی وغیرہ تصورات کی بھرپور نمائندگی ہو، تو دین کی ایسی تشریح سے ایک طرف تو جدیدیت سے ہم آہنگی پیدا ہوگی، دوسری طرف مسلم معاشرہ کو جاگیرداریت اور مولوی کے فرسودہ طور طریقوں سے بچایا جاسکے گا، اس طرح مسلم معاشرہ وسطِ ایشیاء کی ریاستوں اور ترکی کی طرح مذہب کے خلاف بغاوت کے رجحانات سے بچ جائے گا۔

مولانا سندھی کو جدید دور کے انقلابات کو دیکھنے کا جو مشاہدہ ہوا تھا، ایسا مشاہدہ برصغیر ہند کے کسی دوسرے عالم کو حاصل نہ ہوسکا تھا۔

دوم یہ کہ مولانا مذہبی طبقہ میں نہایت حساس، متحرک اور فعال شخصیت تھے، پھر مولانا غیر معمولی ذہین بھی تھے، مولانا کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ مسلم معاشرہ کو بیدار کرکے اسے نئے دور کے طوفان خیز انقلاب سے کس طرح بچایا جائے؟ اس سلسلے میں جب مولانا سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر کا گہرا مطالعہ کیا، تو انھیں ان کے فکر میں کچھ اجزاء ایسے نظر آئے، جنھیں بنیاد بنا کر مولانا نے اپنی فکر کو شاہ ولی اللہ کی فکر کی طرف منسوب کرکے فکر دینا شروع کی، مولانا سندھی مکہ میں بارہ سال تک یہ فکر دیتے رہے، مولانا سارے قرآنی فکر کو اپنے ان مذکورہ نکات کے گرد گھما پھرا کر پیش کرتے رہے، 1939ء میں وطن واپس آنے کے بعد مولانا جامعہ ملیہ دہلی اور پیر جھنڈو میں یہ فکر دیتے رہے، اس سلسلے میں مولانا نے کئی شاگرد تیار کیے، جو ساری زندگی مولانا کے اس فکر کے علمبردار رہے، مولانا کے ایسے شاگردوں میں محمد سرور صاحب، بشیر احمد لدھیانوی صاحب، الطاف جاوید صاحب اور مولانا عبدالحق ربانی صاحب اور مولوی عزیز اللہ جروار صاحب جیسے کئی شاگرد شامل ہیں''

(بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارح، ان کے فکر کا تجزیاتی مطالعہ، صفحہ ۱۷۳، تصنیف: مولانا

www.idaraghufran.org

عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ، ترتیب: محمد موسیٰ بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، سندھ، سال اشاعت، جولائی ۲۰۰۵ء)

مولانا سندھی صاحب نے ہندوستان واپسی کے بعد کلکتہ میں جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبہ میں جو کچھ فرمایا، وہ اسی پروگرام کی جھلک تھی، جو مولانا سندھی صاحب روس اور ترکی وغیرہ سے لے کر آئے تھے، اور اس صدارتی خطبے سے اس دور کے تمام جمہور علماء اور مسلمانوں نے اختلاف کیا، اور اس کا شدید شکوہ کیا۔

لیکن ان تاریخی حقائق کے برعکس آج بعد میں آنے والے ایک طبقے کو یہ بدیہیات مسلم نہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حوالے سے جو تفصیل ذکر کی گئی، اس کی روشنی میں حضرت تھانوی کے ملفوظات کی تشریح وتوضیح کو ملاحظہ کر کے، عادلانہ ومنصفانہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا، البتہ تاویلات کا راستہ بڑا طویل ہے۔

فاضل ناقد نے اپنی کتاب ''یادگارِ اکابر'' میں، ڈاکٹر تاراچند کی ایک تحریر، جس کا ترجمہ قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے کیا ہے، اور اس کا عنوان ''مولانا عبیداللہ سندھی کی خدمات کا جائزہ'' بحوالہ ''مسلم افکارِ سیاست'' نقل کی ہے، جس کے شروع میں فاضل ناقد لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر تاراچند سے یہ کام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے کرایا تھا، ان کی کتاب سے حضرت سندھی کے متعلق مضمون یہاں لیا جارہا ہے، آپ بھی اس سے استفادہ فرمایئے (یادگارِ اکابر، صفحہ 164)

اب فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب سے ڈاکٹر تاراچند صاحب کی محولہ بالا تحریر کے چند اقتباسات ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

> اسلام کے لئے ان (مولانا عبیداللہ سندھی) کا تصور قدامت پرستانہ یا محدود نہ تھا، علیحدگی پسندی کا بھی اس میں کوئی دَخَل نہ تھا، ان کے نزدیک اسلام ایک

عالمگیر اور ابدی مذہب کا دوسرا نام ہے، قرآن ایک زندہ اور انقلابی فکر کی حامل کتاب ہے، بنی نوع انسان کے بنیادی تصورات کا اظہار، تمام مذاہب کا بنیادی اصول اور خدا کی ذات کا مظہر ہے، انسانوں کے ضمیر، بھگوت گیتا، عہدِ عتیق کی پانچ موسوی کتابیں (بائبل کا عہد نامہ قدیم) اور انجیل (بائبل کا عہد نامہ جدید)، وہ سب اس مذہب کی شرحیں ہیں، گیتا، انجیل یکساں طور پر حق ہیں، ان کے شارحین نے بعد کے زمانوں میں انتشار اور تفریق پیدا کی (یادگارِ اکابر، صفحہ 168)

تمام انسانوں کا مذہب ایک ہی ہے، جو ازلی اور ابدی ہے، لیکن قانون (شریعتیں) مختلف ہیں، ہر سماج اپنے خاص جغرافیائی اور تاریخی ماحول کے تحت اپنے مخصوص قوانین اپنے لئے وضع کرتا ہے، جو وقت کی تبدیلی کے ساتھ لازمی طور پر بدل جاتے ہیں، وہ سیاسی اور اقتصادی نظام جو اولین خلفائے اربعہ کے زمانے میں تھے، وہ موجودہ زمانے پر منطبق نہیں کیے جاسکتے، تعصب کے جوش میں اس چیز کو جو دنیوی اور وقت وحالات کے تحت بدلتی رہنے والی ہے، اسے قائم رکھنے پر زور دینا قدامت پرستی ہے، اور قدامت پرستی زندہ قوموں کا شعار نہیں، دوسرے مذاہب سے نفرت کرنا معصیت ہے (یادگارِ اکابر، صفحہ 169)

اشوک کو جو شغف بدھ سے تھا، وہ اسی طرح کا ہے، جو اکبر کی اس کوشش میں پنہاں تھا، کہ سب کے لئے ایک مذہب (دینِ الٰہی) کی تلاش کی جائے، جس کی بنیاد قدیم ہندوستانی فلسفے اور اسلامی تصوف کے اشتراک سے ہو، یعنی مطلق وحدانیت (وحدۃُ الوجود) پر۔

اورنگ زیب نے مسلمانوں کے دلوں میں عقائد کی جو کمزوری پیدا ہوگئی تھی، دُور کرکے پھر اسے زندہ کرنے کی کوشش کی، جن کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا انحصار وحدۃُ الشہود کے فلسفیانہ اصول کی تبلیغ تھا۔

www.idaraghufran.org

دراصل یہ دونوں فلسفے (وحدۃُ الوجود اور وحدۃُ الشہود) شاہ ولی اللہ کے نزدیک، جو مولانا سندھی کے پیش رو، اور ان کے امام ومطاع تھے، خدا کی وحدانیت کے اقرار کے دو طرزِ استدلال تھے، اکبر کا وحدۃُ الوجود، اورنگ زیب کا وحدۃُ الشہود، ایک ہی سِکّے کے دو رُخ تھے، دونوں ایک ہی منزل ہندوستان کے فکری اتحاد کی بنیاد کی تلاش میں گامزن تھے (یادگارِ اکابر، صفحہ 170، وصفحہ 171)

سیاسی اور اقتصادی اُمور میں انھوں (مولانا عبیداللہ سندھی) نے مغرب کے طریقوں کو مکمل طور پر اپنانے پر زور دیا (یادگارِ اکابر، صفحہ 172)

ہندوستان میں بہت سے مذاہب ہیں، لیکن بنیادی طور پر سب ایک ہی ہیں، کیونکہ ان سب کے فلسفے کا بنیادی پتھر ایک خدا کے وجود کا ماننا (وحدانیت) ہے، خیالات میں ہم آہنگی، دماغوں میں ایک دوسرے سے گہرا تعلق اور باہمی ہم دردی کے جذبات پیدا کرتا ہے، اسلام قومیتوں کو تہس نہس کرنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ ان سب کو ایک برادری کے رشتہ میں جوڑ دینا چاہتا ہے۔

مولانا سندھی کو یقین تھا کہ صوفیاء کا وحدۃُ الوجود کا عقیدہ ہندوستان کے اتحاد کی مضبوط بنیاد بن سکتا ہے، اس مسئلے میں ان کے خیالات مضبوط اور منضبِط تھے (یادگارِ اکابر، صفحہ 172)

مولانا سندھی صاحب کی فکر میں ''وحدۃُ الوجود، وحدۃُ الشہود'' کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، ہم اس پر کوئی تبصرہ کر کے کرم فرماؤں کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے۔

اس کے علاوہ فاضل ناقد نے اپنی مرتَّب کردہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' میں ڈاکٹر کلیم اللہ ساریو کا ایک مضمون، بعنوان ''عقائد اور اجتماعیت کا تعلق، حضرت مولانا سندھی کی نظر میں'' نقل کیا ہے، اوپر کے اقتباسات ذہن میں رکھ کر، اس کے درجِ ذیل اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائیے:

حضرت مولانا سندھی کے خیال میں قرآن مجید کل انسانیت کی بنیادی فکر کا

ترجمان ہے، اور یہ بنیادی فکر نہ کبھی بدلا، اور نہ آئندہ کبھی بدلے گا، اور سارے ادیان، مذاہب اور فلسفوں کا اصل اصول یہی فکر ہے (مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ 62)

اس بنیادی فکر کو فطرۃُ اللہ کہہ لیجئے، اسے دین کا نام دیجئے، یا اسے ضمیرِ انسانی سے تعبیر کیجئے، اسی ضمیرِ انسانی کی ترجمانی انبیاء، صلحاء اور حکماء کرتے آئے ہیں (یادگارِ اکابر، صفحہ 267)

قرآن مجید اسی ضمیرِ انسانی کا ترجمان ہے۔

مولانا کے نزدیک، گیتا نے بھی اپنے زمانہ میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی تھی، توراۃ اور انجیل بھی اسی ضمیرِ انسانی کی شارح ہے، اور حکماء نے بھی کہیں کم، کہیں زیادہ اسی راز سے پردہ اُٹھایا ہے۔

مولانا کے نزدیک گیتا حق ہے، لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی ہے، وہ کفر ہے۔

توراۃ اور انجیل حق ہیں، لیکن جو غلط معانی ان کے الفاظ کو پہنائے گئے ہیں، وہ باطل ہیں۔

اسی طرح قرآن حق ہے، لیکن جس طرح مسلمان اس کو عام طور پر ماننے والے اور جو تفسیر وہ کرتے ہیں، وہ حق نہیں۔

اگر گیتا اور انجیل کو غلط طور پر ماننے والے کافر قرار دیے جاسکتے ہیں، تو قرآن کو غلط مفہوم میں ماننے والے کیسے مؤمن کہے جائیں گے (یادگارِ اکابر، صفحہ 268)

مولانا سندھی کے نزدیک قرآن نے تمام اقوام، اَدیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کُل انسانیت پر منطبق ہوسکتے ہیں، یکجا کیا، اور ساری دنیا کو یہ دعوت تھی کہ صرف یہی ایک اَساس ہے، جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہوسکتی ہے،.....

قرآن ایک میزان ہے، جس میں سب تولے جاسکتے ہیں، مسلمان، ہندو، یہودی

اور عیسائی کی اس میں کوئی تمیز نہیں، جورائی برابر بھی کم نکلا، اس کی پُرسش (پوچھ) ہوگی (مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ 45)

مولانا کے نزدیک اصل دین یہی ہے، کہ سب رسوم اور روایتیں ہیں، قرآن کا مقصد انسانیت کو ان رسوم اور روایتوں کے بندھنوں سے آزاد کرانا ہے۔

بدقسمتی سے ہر قوم نے ان رسوم کو اصلی مذہب سمجھ لیا، اور ان کے پیچھے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے (یادگارِ اکابر، صفحہ 269، وصفحہ 270)

مذکورہ اقتباسات کے بعد، اب مولانا سندھی صاحب کے مستند و معتبر ترجمان پروفیسر محمد سرور صاحب کے نقل کردہ، مولانا سندھی صاحب کے افادات وملفوظات سے بھی اس سلسلہ میں چند اقتباسات ملاحظہ فرماتے چلیں:

اگر ایک عیسائی بھی ایک کام کو اللہ کا حکم سمجھ کر کرتا ہے، تو اس کا شمار بھی حنفاء میں ہوگا، اسی طرح ایک یہودی اور ہندو بھی.....۔

جب انسان کے دل میں اللہ سے محبت کا جذبہ اُبھرے، تو وہ سجدہ کرے، رکوع کرے، یا کھڑے ہوکر اس کی بارگاہ میں اپنی زبان میں بندگی کا اظہار کرے، اب خواہ وہ مسلمان ہو، یا ہندو، عیسائی ہو یا یہودی، جب بھی انسان خداپرستی کے اس جذبہ کا اظہار، عبودیت کی صورت میں کرے گا، وہ نماز ہے، ہماری نماز اسی نماز کی ایک مکمل شکل ہے (افادات وملفوظات، صفحہ 372 وصفحہ 373، بعنوان ''ملفوظات، حنفیت کے چند اُصول'')

مذکورہ افکار وخیالات کے بعد اب یہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیں کہ اگر کوئی مولانا سندھی صاحب کے پیش کردہ توحید کے عقیدہ کے بجائے، کفر کی حالت میں مرگیا، اس کو جہنم میں دائمی سزا ہوگی، یا عارضی؟

پروفیسر محمد سرور صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

یہ جو بتایا گیا ہے کہ کافر تا ابد دوزخ میں رہے گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ کافر کے نسمہ کی وہاں کب اصلاح ہوگی، اور اس کا نفس ناطقہ کس طرح نسمہ کی کدورتوں سے پاکیزہ ہو سکے گا، لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس کے نفس ناطقہ کی کبھی اصلاح ہی نہ ہوگی، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

اس بنا پر ابنِ عربی کا یہ کہنا کہ آخر میں فرعون بھی نجات پا جائے گا، صحیح ہے، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو فرعون کا نفس ناطقہ، نسمہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنے مرکز اصلی یعنی نفس کلیہ کی طرف انجذاب حاصل کرے۔

(افادات وملفوظات، صفحہ ۳۷۶، ۳۷۷، بعنوان ''ملفوظات، جنت ودوزخ اور فرعون کی نجات'')

تفسیر ''المقام المحمود'' مرتبہ مولانا عبداللہ لغاری میں بھی مولانا سندھی صاحب کا یہی موقف درج ہے۔

چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر 39 ''وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ'' کی تفسیر کے ضمن میں ہے:

''خالدون'' کے معنیٰ ہوئے ''اقامت کرنے والے'' اور ابد الآباد تک اقامت کرنا مراد نہیں، جیسا کہ غلط خیال عام ہو گیا ہے۔ (تفسیر المقام المحمود، ج ۱ ص ۲۳۲، تفسیر سورہ بقرہ، ناشر مکی دار الکتب لاہور)

پروفیسر محمد سرور صاحب، مولانا سندھی صاحب کے ہی افادات وملفوظات میں لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی کے الفاظ میں: اقبال نے جماعت کو جسے وہ ملتِ اسلامیہ کہتے تھے، ایک بت بنا لیا۔ ان کے طبعی تقاضے، گرد وپیش کے حالات اور خود ان کی اپنی فکری شخصیت کچھ اور مانگتی تھی۔ وہ ان طبعی، سیاسی اور معاشی مطالبوں کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتے اور جو زمانے کا چلن ہوتا، اس کا ساتھ دیتے۔ لیکن جماعت

کا ''شخص''، یعنی تصوراتی وجود اور اس سے جو خصائص و امتیازات، انھوں نے متعلق کر رکھے تھے اور اس سے جو احکام و ہدایات وہ لیتے تھے، یہ سب چیزیں ان کے نیم شعور میں اس طرح رچی ہوئی تھیں کہ جیسے ہی ان کو موقع ملتا، وہ ان کے شعور میں عود کر آتیں اور فلسفی اقبال ایک روایت پرست بلکہ توہم پرست لاہوری مسلمان ہو جاتا۔ اس حالت میں وہ اپنے آپ کو کوستا، اپنی گناہ گاری کا اعتراف کرتا اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، روتا بھی۔ یہاں اس کی عقلیت جواب دے دیتی۔

مولانا (سندھی صاحب) نے کہا:

سچ پوچھو تو اقبال ایک روایت پرست یہودی کی طرح مسلمانوں کی موہوم جماعت کو پوجتا ہے۔ وہ جماعت کی قیود سے نکلتا تو تھا، لیکن اس کی یہ بغاوت منظّم فکر کی بغاوت نہ تھی، بلکہ یہ فکری آزادروی ہوتی، جو شعر کا موزوں لباس پہن لیتی۔ اس کا دل اس جبر کی مخالفت کرنے کو چاہتا۔ لیکن نوعمری کی عقیدتوں پر تشکیل شدہ شخصیت اس میں آڑے آتی۔ چنانچہ وہ ساری عمر انہی الجھنوں میں برابر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی! ایک لذت یکتائی

میں مانتا ہوں کہ اقبال، دل سے چاہتے تھے کہ قرآن کی حکومت بروئے کار آئے، اور اسلام پر بالکل ایک نئی دنیا کی تعمیر ہو۔ لیکن قرآن اور اسلام کی عملی تشریح جو آج کے زمانے میں قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہو سکے، یہ ان کے بس میں نہ تھی۔ کیونکہ وہ جماعت کے روائتی اثرات اور اس کے قوانین وضوابط سے ذہناً باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اور قرآن و اسلام کے نظام کو مجموعی انسانیت کا نظام بنا کر پیش کرنے کا وہ حوصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے فکراً خواہ وہ کچھ ہوں، اقبال کا اسلام عملاً ایک

فرقہ پرست ہندوستانی، بلکہ پنجابی مسلمان کا اسلام تھا۔ کردار کے تو غازی تھے ہی نہیں، وہ گفتار کے غازی بھی نہ بن سکے''۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۳۵۴، تا ص ۳۵۶، بعنوان ''علامہ اقبال''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

ہم نے مندرجہ بالا اقتباسات، مولانا سندھی صاحب کے محبین ومعتقدین اور معتبر ترجمانوں کے حوالہ جات سے نقل کر دیئے ہیں، جس کے بعد امید ہے کہ اگر مولانا سندھی صاحب کے مذکورہ افکار کی کوئی دوسرا ترجمانی کرے، تو ان کے قبول ہونے میں زیادہ ناگواری کا سامنا نہیں ہوگا۔

اب ہم تائید کے طور پر مولانا سندھی صاحب کے بعض افکار پر ناقدین کے بھی چند اقتباسات وتجزیات پیش کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب (المتوفیٰ: 1977 عیسوی) اپنے مضمون ''ایک شرک نواز مولانا'' میں لکھتے ہیں:

> حکمتِ ولی اللّٰہی، جس کا شور وشغب، اتنے روز سے سننے میں آرہا تھا، آخر اس متن کی شرح بھی خود صاحبِ متن کی زبان سے ہو کر رہی، کہ وہ مترادف ہے ''حکمتِ دہلویہ'' یا ''حکمتِ ہندیہ'' کے، اور لفظ جب اس کے احیاء کا بولا جائے گا، تو معنیٰ اس سے حکمتِ ہندیہ یا حکمتِ وطنیہ کے مراد ہوں گے، گویا مقصود وہی وطن اور ہندوستان کے حکمت وفلسفہ کی اشاعت ہے، اور لقب اور نقاب اس کے لیے ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کو ٹھہرایا گیا ہے، اور ایسا اکثر ہوتا ہی آیا ہے، شاعروں نے بارہا یہ کہا ہے:
>
> نام اُن کا آسماں ٹھہرالیا تحریر میں!
>
> معاملہ اگر تحریکِ وطنیت ہی تک رہا، تو غنیمت ہے، لیکن خدا کے لیے مولانا (عبیداللہ سندھی) کی تحریروں کو ذرا غور وتأمل سے پڑھا جائے۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ موضوعِ تحریر کچھ بھی ہو، کسی نہ کسی نہج سے رورعایت مشرک قوموں کے حکمت وفلسفہ کی ضرور ہی ملے گی؟ ''ویدانت فلاسفی'' کی عظمت کا کلمہ تو مولانا علانیہ پڑھتے ہیں، باقی کہیں مدح ملے گی، یونانیوں کی، کہیں رومیوں کی، کہیں کلدانیوں کی، اور کہیں جدید ترکیوں کی، موقعِ مدح پر ذکر ملے گا، کہیں ایتھنز کا، کہیں اِندر پرست کا، کہیں روما کا، کہیں بابل کا، اور کہیں جدید اشتراکیت کا.....سب آخر مبتداء ہے کس خبر کا؟ سوال یہاں مولانا کے سیاسی خیالات واجتہادات کا مطلق نہیں، صرف اس کا ہے کہ آخر شرک نوازیوں کی بھی کوئی حد ہے؟ (ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' صفحہ ۳، جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 10، دوشنبہ، 8 جمادی الثانی 1359 ہجری، بمطابق 16 جولائی 1940 عیسوی)

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب اپنے مضمون ''مقدس محرِّف'' میں لکھتے ہیں:

''یا ایھا المدثر: مدثر سے مراد انسانیت سے ظلم وکفر مٹانے والا ہوا۔

قم: یعنی اے وہ کہ تو دیتا ہے، انسانیت سے کفر وطغیان اور ظلم وجور دور کرنے کا مشن لے کر اٹھا ہے، بیٹھ کر تجویزیں سوچنے اور ریزولیشن پاس کرنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اٹھ کر کمر ہمت باندھ.....۔

وثیابک فطھر: اس انقلاب کے لیے کسی خاص نشان یا وردی کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ بین الاقوامی انقلاب ہے، اس میں ہر قوم اور نسل کے افراد جو انسانیت کی خدمت کے لیے آمادہ اور تیار ہوں، شامل ہو سکتے ہیں، البتہ ایک شرط ہے کہ لباس پاک ہو، اور پاک رہ سکتا ہو، اخلاق کی پاکیزگی میں ممد ومعاون ہو.....

ساصلیہ سقر: لیکن اس ارتجاعی کے لیے اس بداخلاقی کی آگ سے بچنا محال ہے، اسے ظلم کی تائید کرنے کی آگ میں ڈالا جائے گا'' (زمزم، لاہور، ضمانت نمبر)

یہ چند ''جواہر ریزے'' ہیں، اس ''سراپا مرصع'' تحریر کے، جو ''سورہ مدثر کی حکیمانہ تفسیر'' کے عنوان سے ''حضرت مولانا عبیداللہ سندھی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

اگر اسی کا نام تفسیر ہے، تو خدا معلوم تحریف اور بدترین تحریف کا نمونہ اور کہاں ملے گا؟

ہمارے علمائے کرام، بعض ان میں کے یقیناً مخلص و نیک نیت، لیکن عقیدت میں غلو و افراط کے شکار، ایک بڑی شخصیت کے نام سے مرعوب و مسحور، براہِ کرم ہم عاصیوں کو بتادیں کہ اگر یہ ''تفسیر بالرائے'' کسی درجہ میں بھی دینی خدمت کہی جاسکتی ہے، تو آخر ہم سب مل کر عنایت اللہ المشرقی کو امامِ عصر تسلیم کرلیں؟ اس غریب کی جسارتیں تحریفِ قرآنی کے باب میں کیا اس سے کچھ بڑھی ہوئی ہیں؟ (ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' صفحہ ۱، جلد نمبر 7، شمارہ نمبر 8، دوشنبہ، 26 جمادی الاولیٰ 1360 ہجری، بمطابق 23 جون 1941 عیسوی)

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب اپنے مضمون ''روشن خیالی سے قبل'' میں لکھتے ہیں:

''مقدس محرِّف'' کے زیرِ عنوان ''صدق'' نمبر 8 کا شذرہ پڑھ کر ایک صاحب سورہ مدثر کی ایک اور اردو تفسیر کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جو ''فتح المقتدر'' کے عنوان سے مولانا نورالحق علوی کے نام سے کئی سال ہوئے نکلی تھی، اور جس پر دو تین سال ہوئے ''صدق'' میں تبصرہ بھی شائع ہو چکا ہے، تفسیر پر نام اگرچہ مولانا علوی کا درج ہے، لیکن اندر جابجا تصریح ہے کہ مضامین و نکات مولانا سندھی کے تعلیم کیے ہوئے ہیں ''فتح المقتدر'' اچھی خاصی تفسیر ہے، جیسی قرآن مجید کی تفسیریں ہوتی ہیں، اگر مولانا کے خیالات، عقائد اس وقت تک وہی تھے، اور اب

یہ ہو گئے ہیں، تو بجز حیرت اور انتہائی عبرت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے (ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' صفحہ ۳، جلد نمبر 7، شمارہ نمبر 10، دوشنبہ، 11 جمادی الثانی 1360 ہجری، بمطابق 7 جولائی 1941 عیسوی)

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب اپنے تفصیلی مضمون میں فرماتے ہیں:

''مولانا کے خیال میں قرآن مجید کل انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے''۔

سمجھا آپ نے، قرآن حق تعالیٰ کی مرضیات کا ترجمان ہے، آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہیں، لیکن جناب سندھی صاحب قرآن کو انسانیت کی بنیادی فکر کا ''ترجمان'' سمجھتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟ سندھی صاحب تو خیر تشریف لے گئے، لیکن ان کے معتقدوں سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس کا مطلب کیا قرار دیتے ہیں؟ کیونکہ اسی کے بعد یہ بھی ارشاد ہوتا ہے ''مذاہب اور فلسفوں کا اصلُ الاصول یہی فکر ہے''۔

فلسفہ کے متعلق تو بے شک یہ معلوم تھا کہ اس کا خدا سے نہیں، بلکہ آدمی کے بھیجے (یعنی دماغ) اور اس کی فکر سے تعلق ہے، لیکن مذاہب کی بنیاد بھی انسانی فکر ہے، اور اس کا مرکز بھی انسانی دماغ ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد فلسفہ اور مذہب میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ غریب فلسفہ پر عدم اعتماد کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس کا تعلق ناقص انسان کی ناقص معلومات سے ہے۔ جب انسانی فکر ہی پر اعتماد کرنا ہے، تو آدمی بجائے دوسروں کی فکر کے خود اپنی ہی فکر پر کیوں اعتماد نہ کرے (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ 129، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

اور مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب مزید فرماتے ہیں:

خیر شیخ ابنِ عربی کو تو جانے دیجیے، سندھی صاحب نے ان کو تو صرف مقدمۃُ الکلام

بنایا تھا، آمدم برسرِ مطلب تو یہ ہے، یہ فرمانے کے بعد کہ ''شاہ ولی اللہ بھی ایک نئے فکر کے بانی ہیں'' وہ ''ولی اللٰہی فکر'' جو مولانا سندھی صاحب کا کلام بلکہ تکیہ مرام ہے۔ کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے:

''شاہ صاحب، ابنِ عربی کے عقیدۂ وحدتُ الوجود کو صحیح مانتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ امامِ ربانی کے فکر کو بھی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔ امام ربانی نے جس خیال کو وحدتُ الشہود سے تعبیر کیا ہے، وہ ابنِ عربی کے وحدتُ الوجود میں خود موجود ہے'' (صفحہ ۲۱۱)

دیکھا آپ نے، قرآن کی ''لازوال حکمت'' جو سرمدی وابدی تھی، کہاں گئی۔ قرآن کا سب سے بڑا معرکۃُ الآراء مسئلہ شرک وتوحید کا، جس پر قوموں میں جنگیں ہوئیں، خونریزیاں ہوئیں، سندھی صاحب کی تحقیق نے ثابت کردیا کہ شرک وتوحید کا یہ اختلاف دراصل وحدتُ الوجود اور وحدتِ شہود والا ہی اختلاف تو ہے، جو اسلامی صوفیوں میں پایا جاتا ہے، جن میں ہر مسلک والے کو مسلمان اپنا بزرگ اور پیشوا بلکہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی سمجھتے ہیں، خصوصاً جب شاہ ولی اللہ نے دونوں عقیدوں کے متعلق ثابت کردیا کہ ایک ہی حقیقت کی یہ دونوں تعبیریں ہیں، تو اب اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ شرک بھی توحید ہے، اور توحید بھی شرک ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں، جو مشرک ہے، وہ بھی موحد اور جو موحد ہے، وہ مشرک ہے (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ 139، وصفحہ 140، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب اپنے تفصیلی مضمون میں فرماتے ہیں کہ:

مولانا (سندھی) کی مشہور املائی تفسیر ''الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ٹائیٹل پر لکھا ہے کہ یہ تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی نے

علامہ موسیٰ جاراللہ کو املا کرائی۔ علامہ موسیٰ جاراللہ، مولانا سندھی کے آخری دور کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ تفسیر کی تحقیق وتہذیب کرنے والوں میں شیخ محمد نور مرشد مکی اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کا نام لکھا ہے (جو مولانا کے براہِ راست شاگرد ہیں) اس تفسیر میں جمہورِ امت اور علمائے اسلام کے بالکل خلاف بعض نظریات وتحقیقات پیش کی گئی ہیں۔

حیاۃِ عیسیٰ علیہ السلام، امتِ مسلمہ کا ایک اجماعی عقیدہ ہے، اور علمائے اسلام نے اس کے اجماع اور تواتر پر مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں، مثلاً ہمارے اس آخری دور میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی تصنیف بزبانِ عربی ''عقیدۃُ الاسلام فی حیاۃِ عیسیٰ علیہ السلام''، مولانا بدرِ عالم میرٹھی کی تصنیف ''حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام''، مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ کی تصنیف ''حیاتِ مسیح علیہ السلام''، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی جمع کردہ سوا احادیث کا مجموعہ ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' اور مولانا محمد حسین نیلوی صاحب کا رسالہ ''القول الأتم فی حیاۃ عیسیٰ ابن مریم''۔ ان کتابوں میں حیاۃِ عیسیٰ علیہ السلام اور قربِ قیامت میں ان کے نزول کو امتِ مسلمہ کے ایک اجماعی عقیدہ کے طور پر ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن جمہور امت کے اس عقیدہ کے بالکل برعکس دل پر ہاتھ رکھ کر حیاۃِ عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں اس تفسیر کی عبارت پڑھیے:

**وأما ما شاع بين الناس من حياة عيسىٰ عليه السلام، فهي أسطورة يهودية وصابئية، وقد شاعت بين المسلمين بعد مقتل عثمان رضي الله عنه بواسطة انصار بني هاشم من الصابئة ومن اليهود الموالين لعلي بن ابي طالب لا لحبه بل انها اشاعوها بين**

**المسلمين بغضا فی الاسلام وأهله بين من لم يتدبر معنى قوله تعالىٰ "هو الذی أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله" واتخذها عقيدة ولايفهم معنى هذه الآية الكريمة الا من يتقن الاجتماعية العامة، ويكون ماهرا فيها.**

**وأما من يؤمن بتلک الروايات ، ويأتوننا بها فهم أبعد الناس من العلوم الاجتماعية ، واذا كانوا جاهلين بمعنى هذه الآية الشريفة فانهم يقبلون تلک الروايات ويتأثرون بها** (الهام الرحمن ، ۴۹)

''یعنی لوگوں کے درمیان حیاۃِ عیسیٰ علیہ السلام کا جو عقیدہ مشہور اور شائع ہوا ہے، یہ درحقیقت ایک یہودی صابی من گھڑت کہانی ہے۔ یہ عقیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی اور بنو ہاشم کے طرفدار یہودیوں اور صابیوں کے واسطہ سے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں عام ہوا، کسی محبت کی بنا پر نہیں، بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ بغض اور نفرت کی وجہ سے انھوں نے اس کو ان مسلمانوں میں عام کردیا، جنھوں نے اس آیتِ کریمہ کے معنیٰ میں غور فکر نہیں کیا ''هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' (یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کردے)

چنانچہ انھوں نے اس کو عقیدہ بنالیا، اس آیتِ کریمہ کے معنیٰ کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو عام معاشرت واجتماعیت سے خوب واقف اور اس میں ماہر ہو، لیکن جو لوگ (حیاتِ عیسیٰ کی) ان روایات پر ایمان لاتے ہیں، اور ہمارے سامنے ان روایتوں کو پیش کرتے ہیں، یہ لوگ معاشرتی اور اجتماعی علوم سے کوسوں دور ہیں۔ جب وہ اس آیت کے معنیٰ سے جاہل رہیں گے، تو ظاہر ہے پھر ان روایات کو قبول کریں گے، اور ان سے متأثر ہوں گے''۔

www.idaraghufran.org

اس عبارت میں امتِ مسلمہ کے ایک اجماعی عقیدہ کو ''أسطورة يهودية'' (یہودی من گھڑت کہانی) قرار دیا گیا ہے، اور صریح وصحیح روایات واحادیث کی تردید کی گئی۔ اب اگر یہ مولانا سندھی کا واقعتاً اپنا عقیدہ ہے، تو یہ بھی ان کا تفرد ہے، جو جمہور امت اور علمائے اسلام کے ایک متفق علیہ عقیدہ کے خلاف ہے، اور اگر ان کی طرف اس کی نسبت غلط ہے، تو پھر اس کی تصریح ہو جانی چاہیے تھی، تاہم ظاہر یہی ہے کہ اتنی بڑی بات کوئی کسی کی طرف غلط منسوب نہیں کرسکتا، جب کہ علامہ موسیٰ جار اللہ کے علاوہ (مولانا سندھی کے شاگردوں) محمد نور مرشد مکی اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے بھی اس تفسیر کی تحقیق وتہذیب میں حصہ ملایا ہے، اور ''تحقیق'' کا حق ادا کرتے ہوئے اشارہ تک نہیں کیا کہ یہ عبارت امتِ مسلمہ کے ایک متفق علیہ عقیدہ کے خلاف اور تفرد ہے۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کی آمد بھی جمہور علماء کے نزدیک درست اور ثابت ہے، لیکن اس تفسیر میں صفحہ ۵۴ پر بعض اشاعرہ کے حوالے سے جمہورِ امت کے بالکل برعکس یہ لکھا گیا کہ نزولِ عیسیٰ اور ظہورِ مہدی، اہلِ سنت کے ضروری عقائد میں سے نہیں، محمد نور مرشد مکی صاحب نے اس پر چار چاند لگاتے ہوئے یہ حاشیہ لکھا:

**''اتيان المهدى ونزول عيسىٰ عليه السلام لم يكونا من عقيدة السلف''**

''یعنی حضرت مہدی کا ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اسلاف کے عقائد میں سے نہیں''۔

آگے صفحہ 231 پر نزولِ عیسیٰ کا انکار کرتے ہوئے لکھا گیا:

**''لاحاجة لنا الى القول بنزول المسيح''**

''یعنی نزولِ مسیح کے قائل ہونے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں''

ظاہر ہے یہ بھی مولانا سندھی اور ان کے مذکورہ بعض شاگردوں اور عقیدت مندوں کا تفرد ہے، جس سے جمہور علمائے اسلام اور عام مسلمان بالکل بری ہیں۔ جمہور امت کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف اسلام مذہبِ حق اور اس کے علاوہ اس وقت موجود دوسرے ادیان باطل ہیں'' إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ''لیکن تفسیر الہام الرحمٰن میں وحدتِ ادیان کا نظریہ پیش کیا گیا ہے، چنانچہ صفحہ ۲۵، ۲۶ پر لکھا گیا:

''ہم تمام ادیان کی حقانیت وصحت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن صرف اس قدر جتنا ان کی طرف نزول ہوا ہے، اور ان ادیان میں اختلاف کو ہم اس طرح کا اختلاف قرار دیتے ہیں، جس طرح حدیث کی مختلف کتابوں میں اختلاف پایا جاتا ہے..... اس لئے ہم تمام ادیان کو جمع کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ ان میں تطبیق دیتے ہیں، جس طرح مختلف احادیث میں جمع وتطبیق اختیار کی جاتی ہے''

آگے ایک اور مقام پر اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

''عام فقہاء نے مسلمانوں کو اپنے اس فتویٰ سے گمراہ کیا کہ تمام کے تمام غیر مسلم باطل پر ہیں، اور ان کے پاس حق میں سے کچھ بھی نہیں'' (صفحہ ۶۳)

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۴۹ تا ۳۵۳، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (لاہور) اپنے ایک تفصیلی مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا سندھی کہتے ہیں:

''یہود کہتے تھے کہ خواہ وہ کس قدر ہی گناہگار کیوں نہ ہوگے، صرف چند روز ہی جہنم میں رہیں گے، اس کے بعد جنت میں آجائیں گے''۔ یہود کے اس خیال کی تردید کی جارہی ہے اور لطف یہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ

مسلمان گناہگار چند دن جہنم میں رہنے کے بعد جنت میں منتقل کر دیئے جائیں گے اور باقی امتیں جہنم میں رہیں گی'' (المقام المحمود ص ۲۷۵، ۲۷۶)

اس پر تنظیم کے مفتی عبدالقدیر صاحب اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ الفوزُ الکبیر میں اس خیال کو معنوی تحریفات میں شمار کیا ہے۔

مولانا سندھی کا مسلمان گناہگاروں کے بارے میں اس عقیدہ پر علی الاطلاق اعتراض کرنا اور مفتی عبدُ القدیر صاحب کا اس کو شاہ صاحب کی عبارت کے موافق بتانا دونوں ہی غلط ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت جو الفوز الکبیر میں ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فرق میان متدین، فاسق و کافر جا حد در ہر ملتے بیان کردہ اند و کافر را خلود نار و عذابِ شدید اثبات نمودہ اند و فاسق را خروج از نار بشفاعتِ انبیاء درست کردہ اند۔ در تقریر ایں معنی در ہر ملتے اظہار نام متدین بآں ملت کردہ اند۔ و در توریت یہودی و عبری را ایں منزلت اثبات نمودہ اند و در انجیل نصرانی را دریں مرتبہ داشتہ اند و در قرآن عظیم مسلمانان را ایں مزیت نہادہ اند۔

مناط حکم ایمان است بخدا و روز آخرت و انقیاد پیغمبرے کہ برایشاں مبعوث باشد و عمل بشرائع ملت و اجتناب از منہیات آں نہ خصوص ہیچ فرقہ لذا تھا۔ پس یہود دانستند کہ ہر کہ یہودی باشد یا عبری البتہ بہشتی خواہد بود و شفاعتِ انبیاء او را خلاص خواہد ساخت و جز چند روز در دوزخ نہ خواہد ماند اگرچہ آں مناط حکم متحقق نہ شود و ایمان بخدا بوجہے آوردہ باشد کہ صحیح نہ بود و از ایمان بآخرت و برسالتِ پیغمبر مبعوث بایشاں حظے ادراک نہ کردہ باشد، و ایں خلط صرف است و جہلِ محض۔

چوں قرآن عظیم مہیمن ست بر کتبِ سابقہ و مبین مواضع اشکال آں شبہ را بر وجہ اتم کشف رمود بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّأَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ فَأُولٰئِکَ

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ .

ترجمہ: ہر مذہب میں دیندار، فاسق اور کافر کے فرق کو بتایا گیا ہے۔ کافر کے لئے ہمیشہ کی جہنم اور سخت عذاب کو ثابت کیا ہے اور فاسق کے لئے انبیاء کی شفاعت کے ذریعہ سے جہنم سے خلاصی کو صحیح بتایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر مذہب میں دیندار کو اس مذہب کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔ توریت میں یہودی کے لئے یہ مرتبہ ذکر کیا ہے اور انجیل میں نصرانی کو یہ مرتبہ دیا ہے جب کہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے اور اس حکم کا دارومدار خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے اور اپنے میں مبعوث رسول کی تابعداری اور دین کے احکام کو پورا کرنے اور اس کے ممنوعات سے بچنے پر ہے نہ کہ کسی فرقہ و مذہب کی خصوصیت پر۔ پس یہودی خیال کرتے ہیں کہ جو کوئی یہودی ہے وہ یقیناً جنتی ہے اور انبیاء کی شفاعت سے اس کو جہنم سے چھٹکارا مل جائے گا اگرچہ حکم کا مدار ثابت نہ ہو کہ خدا پر ایمان صحیح طور سے نہ ہو اور آخرت اور رسالت پر ایمان کا کچھ بھی حصہ حاصل نہ ہو۔ یہ تو محض خلط و جہالت ہے۔ چونکہ قرآن مجید کتبِ سابقہ کا نگران اور بیان ہے، اس لئے یہود کے اس شبہ کو خوب وضاحت کے ساتھ یوں دور فرمایا:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ .

کیوں نہیں جس نے گناہ کمایا اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایسی کوئی بات مسلمان کے بارے میں نہیں کہی جیسی کہ مولانا سندھی کہہ رہے ہیں اور مفتی عبدالقدیر صاحب جس کی تائید کر رہے ہیں، کیونکہ شاہ صاحب جس بات کے قائل ہیں وہ، وہ ہے جو خود شیخ الہند رحمہ اللہ

نے اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھی ہے۔

''گناہ کسی کا احاطہ کرلیں اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو حتّٰی کہ دل میں ایمان وتصدیق باقی ہوگی تو یہ مذکور احاطہ ثابت نہ ہوگا۔ تو اب کافر پر ہی یہ صورت صادق آسکتی ہے''۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۲۷ تا ص ۳۳۰، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب مزید لکھتے ہیں:

مولانا سندھی آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جس طرح تمام بزرگ لوگ اللہ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، اسی طرح اللہ نے ان کو بھی اپنی طرف اٹھالیا۔ یہ انسانیت کا عام قاعدہ ہے کہ جس بزرگ کی قبر مشتبہ ہوجائے (یعنی اس بزرگ کی قبر معین نہ ہو اور لوگوں نے اس بزرگ کو کھلے طور پر دفن ہوتے نہ دیکھا ہو) تو اس کی متعدد جگہوں پر یا تو قبریں بنالی جاتی ہیں اور یا کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر چلا گیا'' (تفسیر المقام المحمود ص ۶۵۱)

''الہامُ الرحمٰن''، جس کے حوالے مفتی عبدالقدیر صاحب ''المقام المحمود'' کے حواشی میں دیتے ہیں اس میں موسیٰ جاراللہ متوفیک کا معنیٰ ممیتک (یعنی موت دینے والا) نقل کرتے ہیں اور مولانا سندھی کی یہ تشریح نقل کرتے ہیں۔

''یہ جو لوگوں کے درمیان عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مشہور ہوا ہے، یہ یہودیوں اور صابیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے اور یہ بات حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں مشہور ہوئی ہے۔ صابیوں میں سے جو لوگ بنی ہاشم کے انصار تھے ان کے واسطے سے، اور یہودیوں میں سے جو لوگ حضرت علی کے انصار تھے ان کے واسطے سے مسلمانوں کے درمیان اس کی اشاعت حضرت علی کی محبت کے لئے نہیں، بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے بغض ونفرت کی وجہ سے، تاکہ

مسلمان اسلام کے عمومی غلبہ سے رک جائیں''۔

اس کے بعد جارُ اللہ صاحب نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن میں کوئی صریح آیت نہیں جو حیاتِ مسیح پر دلالت کرتی ہو اور یہ کہ وہ زندہ ہیں اور عنقریب زمین پر اتریں گے۔ یہ محض استنباطات اور تفسیرات ہیں بعض حضرات کی جو شکوک و شبہات سے خالی نہیں (الہام الرحمٰن ص ۶۹ ج ۲ بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار از مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ، ص ۶۹)

اس کے برخلاف حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے قائل ہیں۔ وہ ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

**بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ .....بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ**

بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست حکمت والا۔ اور جتنے فرقے ہیں اہلِ کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے۔

اس ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے تمام فرقے ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے البتہ ایک وقت آئے گا کہ سب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ایسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ہوگا لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک حیات ہیں۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول کے قائل ہیں۔ خود مولانا سندھی اس کو یوں نقل کرتے ہیں۔ **فلن یوجد بعدک مقرب الا ولک دخل فی تربیته ظاهرا وباطنا حتی ینزل عیسیٰ علیه السلام** (محمودیه)

تیرے بعد کوئی مقرب الٰہی ایسا نہیں ہوگا جس کی ظاہری اور باطنی تربیت میں تیرا دخل نہ ہو، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں (بحوالہ: مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار۔ مؤلفہ: مولانا سواتی، ص ۷۱)

www.idaraghufran.org

تنبیہ: تنظیم فکر ولی اللّٰہی والے یہ اجمالی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عقائد وہی ہیں جو اہل سنت کے ہیں اور اگرچہ تنظیم کے مفتی عبدالقدیر صاحب نے تفسیر المقام المحمود میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے، لیکن مولانا سندھی کے اس مضمون کو انھوں نے بغیر کسی انکار کے شائع کیا ہے، بلکہ یہاں تو عنوان ہی یہ قائم کیا گیا ہے ''عیسیٰ کے اٹھائے جانے کی حقیقت اور اس کی تاریخی مثال'' غرض تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی والوں نے مولانا سندھی کے اس خیال وعقیدے کو بلا انکار لیا ہے اور وہ واضح طور پر مولانا سندھی کی اس مسئلہ میں تغلیط بھی نہیں کرتے۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۰۷ تا ۳۰۹، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

مولانا (سندھی) کے افکار کی تنقید اور مکمل جائزے کے لئے بڑی فرصت اور پھیلاؤ کی ضرورت ہے۔ افسوس کہ نہ اس وقت ہمیں اتنی فرصت نصیب ہے، اور نہ ایک رسالے کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش ہے۔ سرسری طور پر ہم اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ مولانا سندھی، اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجونِ مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے، اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں۔ اسی اعتبار سے وہ وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان کے قائل ہیں۔ مولانا کے نزدیک قرآن مجید بھی اسی ''بنیادی فکر'' کا ترجمان ہے:

''اور یہ بنیادی فکر عالمگیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے۔ قرآن میں بے شک اس کا جامہ عربی ہے''۔ (ص ۳۵)

''لیکن یہ ''عربیت'' ''مشاہدہ حق'' کے بیان میں صرف ''ساغر و مینا'' کے طور پر

www.idaraghufran.org

ہے''۔(ص۳۵)

اصل حقیقت تو وہی ہے، جو گیتا میں ہے۔ مولانا کے نزدیک گیتا حق ہے، لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی ہے، وہ کفر ہے۔ گیتا کے متعلق تو گیتا والے جانیں، لیکن قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی ''وحدتِ انسانیت کا شارح ہے'' اور نہ وہ ''وحدتِ ادیان'' کا قائل ہے، اس کا حامل تو ایک ''دینِ حق'' اور ''ھُدیٰ'' لے کر آیا تھا، تاکہ ساری کائنات اس کی پابند ہو، اور اللہ کی زمین پر اسی کا قانون نافذ ہو۔ مولانا جن قوانین و مذہبی اقدار کو ''رسوم'' کہتے ہیں، وہ صرف رسوم نہیں، ان میں ''حدودُ اللہ'' بھی ہیں، اور ''حدودُ اللہ'' سے تجاوز کرنے والے کے لئے قرآن مجید کا لہجہ سخت ہے۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص۲۳۸و۲۳۹، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستانی قومیت'' کے پرستاروں کے نزدیک ''اکبرِ اعظم'' سے زیادہ چہیتا کون ہوسکتا ہے۔ طبعی طور پر مولانا اس کے بڑے مدّاح ہیں۔

''چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرمانروا ہے، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول وقوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور ان کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش''۔(ص۲۹۳)

بالکل صحیح! یقینی، اکبر کی حکومت ہندوستانی قومیت اور ہندو تمدن وتہذیب کو زندہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے اصول وقوانین کے اندر رہ کر ایسا کرنا ممکن بھی ہے؟

''مولانا کے نزدیک وحدتُ الوُجود کا عقیدہ اکبر کے فکر کی اساس تھا اور اسی پر اس کے دین کی بنیاد رکھی گئی تھی'' (ص ۲۹۷،۲۹۶)

معلوم نہیں ''وحدتُ الوُجود'' کے ماننے والے، مولانا کے اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟

اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوتا ہے۔

''اکبری سیاست ایک دینی فکر کا نتیجہ تھا، جس کا اساس وحدتُ الوجود کا عقیدہ تھا..... جہانگیر کے زمانے میں امامِ ربّانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدتُ الوجود کی تردید کی اور اس پر جس سیاست کی بنا پڑی تھی، اسے غلط ٹھہرایا۔ امام ربانی کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے با اقتدار سرداروں سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی اور یوں بھی مسلمانوں کے حکمران طبقوں کا ان کی طرف مائل ہونا ایک طبعی امر تھا'' (ص ۳۰۷)

دیکھئے وہی بات مولانا دوسرے انداز میں کہہ رہے ہیں۔ کہنا یہی چاہتے ہیں کہ امام ربانی اس وقت کے مسلمان حکمران طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور انھیں اکبر کی بدعات اور اس کے بداندیش وزیروں کی بیہودہ حرکتوں سے کوئی خاص اصولی اختلاف نہیں تھا۔ ورنہ مولانا سے زیادہ اسے کون جانتا ہے کہ معاملہ صرف ابنِ عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کا نہیں تھا، معاملہ دین کا تھا۔ اکبر نے اس دین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔ اگر حضرت امام ربّانی مجاہدانہ میدان میں نہ آتے تو نہ اورنگ زیب پیدا ہوتا، اور نہ ہم آپ اس حال میں ہوتے ..... لیکن ہمارے مولانا ہیں کہ اکبر کی شہنشاہیت کو ''ہندوستانی اسلامی حکومت'' کا نام دیئے جا رہے ہیں۔

''اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندوستانی اسلامی حکومت تھی۔ اس کے سیاسی مسلک

میں ہندوستانیت کو اسلامیت پر ترجیح دی گئی تھی، کیونکہ ابتدائے کار میں اسلامی حکومت کو ہندوستانی بنانے کے لئے لابدی طور پر ہندوستانیت پر زیادہ زور دینا چاہئے تھا'' (ص۳۰۹)

خاکسار عرض کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت ہندوستان میں تھی کہاں؟ جسے اکبر اور اس کے جانشین ''ہندوستانی'' بنانا چاہتے تھے۔ مغلوں سے پہلے کی مسلمان حکومتوں کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں! وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، جن میں بادشاہ اچھے بھی ہوتے تھے اور بُرے بھی۔ اکبر پہلا بادشاہ ہے، جس کے دور میں وہ مسلمانیت بھی ختم کردی گئی۔ اور صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ دین ہی کے بیخ وبُن سے اکھاڑنے کی مہم شروع کردی گئی اور ایک نئے ''دینِ الٰہی'' کی بنا ڈالی گئی (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ 255 تا صفحہ 257، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

ہمیں امید ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے معتقدین وناقدین کے ملے جلے مذکورہ اقتباسات وتاثرات سے، مولانا سندھی اور سرسید احمد صاحبان میں تقابل کرکے ان کے افکار کو سمجھنا زیادہ مشکل نہ رہا ہوگا۔

پس مندرجہ بالا تفصیل کے بعد کیا کوئی صحیح الفکر وسلیم العقل، شخص جو اپنے آپ کو اہلُ السنۃ والجماعۃ یا اہلِ دیوبند، یا شاہ ولی اللہ صاحب کی صحیح فکر سے وابستہ سمجھتا ہو، مذکورہ اور اس جیسے غلط افکار کو، خواہ، وہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے ہوں، یا سرسید احمد صاحب کے، صحیح قرار دینے کے لیے تیار ہوگا؟

ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ وہ بالآخر حضرت مدنی کے اسی فیصلہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگا کہ:

''بنابریں، تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت

والجماعت کے زرین قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اور ان کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں''۔

ہم حضرت مدنی کے اسی فیصلے کو قبول کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کے علاوہ کوئی اور موقف اختیار کرے، تو وہ جانے۔

## مولانا ابوالکلام آزاد اور سرسید احمد خان

اس سے قبل سرسید احمد خان، ان کی نیچریت اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحبان کے افکار وخیالات میں کچھ مناسبت اور موافقت کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے مولانا اشرف علی تھانوی کے، سرسید احمد خان اور مولانا عبیداللہ سندھی کے شخصی احترام کے ساتھ ساتھ ان کے افکار وخیالات سے اختلاف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اور ہمیں خود سے یہاں مولانا سندھی صاحب کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے افکار کے تقابل وغیرہ کی بحث کی ضرورت نہیں تھی، نہ ہی اس کتاب میں ان کے افکار و خیالات پر تفصیل سے کلام کی گنجائش ہے۔ لیکن فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے بعض مداحین ومعتقدین کے ایسے مضامین موجود ہیں کہ جن کے مطابق، مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات میں، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (پیدائش: 1888 عیسوی، وفات 1958 عیسوی) کے افکار وخیالات سے بھی مناسبت و

مطابقت پائی جاتی ہے۔

چنانچہ فاضل ناقد نے اپنی مرتبہ کتاب ''یادگارِ اکابر'' میں مولانا سندھی صاحب کے بڑے مداح اور سوانحی نوعیت کے موضوعات کے محقق جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری صاحب کا ایک مضمون، بعنوان ''مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی، افکار وشخصیات کا تقابلی مطالعہ'' بھی ''ماہنامہ برہان''، دہلی، اکتوبر 1965ء کے حوالے سے نقل کیا ہے، جس کے شروع میں جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری صاحب لکھتے ہیں:

> دو شخصیتوں کا موازنہ ومقابلہ کسی ایک شخصیت کے ارادت مندوں کے لئے دل شکنی کا باعث بھی ہوسکتا ہے، لیکن ایک شخصیت کے سہارے، دوسری شخصیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں جو مدد ملتی ہے، اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، اور اگر احتیاط کی جائے تو کسی ایک شخصیت کے عقیدت مندوں کی دل شکنی کے بغیر بھی شخصیات کے مطالعے کا یہ مفید اور دل چسپ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے، ذیل کی سطروں میں ہم اس قسم کی ایک کوشش کررہے ہیں، لیکن یہاں تفصیلی مطالعہ مقصود نہیں ہے، بلکہ محض اشارات مقصود ہیں۔
>
> برِصغیر پاک وہند کے علماء میں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی دو ایسی شخصیتیں ہیں، جن کے افکار وخیالات، عقائد ونظریات، اندازِ فکر ونظر اور زندگی کی اُٹھان میں سب سے زیادہ مناسبت اور مطابقت پائی جاتی ہے (یادگارِ اکابر، صفحہ ۴۵۹)

اس کے بعد جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری صاحب نے اپنے مضمون میں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحبان کے افکار وخیالات، عقائد ونظریات، اندازِ فکر ونظر اور زندگی کی اُٹھان میں سب سے زیادہ مناسبت اور مطابقت کے مناظر کا اپنے اندازِ

فکر کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحبان کے افکار وخیالات میں مناسبت ومطابقت کے حوالے سے یہ بات تو مولانا سندھی صاحب کے مداح جناب ڈاکٹر صاحب موصوف اور فاضل ناقد نے بیان ونقل کی ہے۔

لیکن مولانا سندھی صاحب کے ایک معتمد ترجمان پروفیسر محمد سرور صاحب نے مولانا سندھی صاحب کی مولانا ابوالکلام آزاد صاحب سے اجنبیت اور مولانا سندھی صاحب کی طرف سے ان پر تنقید کا ذکر کیا ہے۔

چنانچہ پروفیسر صاحب موصوف، مولانا سندھی صاحب کے افادات وملفوظات میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> مولانا سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت کے بڑے قائل تھے، کئی دفعہ انھوں نے کہا کہ اگرچہ میں نے قرآن پر بڑی محنت کی ہے، لیکن مولانا آزاد مجھ سے زیادہ ذہین ہیں، وطن واپس تشریف لانے کے بعد مولانا سندھی، کلکتہ میں مولانا آزاد سے ملے تھے، اس وقت مولانا آزاد کانگرس کے صدر تھے، مولانا سندھی نے راقم السطور کو بتایا کہ جب میں مولانا سے ملا، تو میں نے ان سے کہا کہ میں بادشاہ سے ملا ہوں، بڑی بڑی سلطنتوں کے وزراء سے ملا ہوں، لیکن مجھے فخر ہے کہ آج میں اپنی قوم کے سردار سے مل رہا ہوں، قوم کی سرداری سے مراد، ان کا کانگرس کا صدر ہونا تھا۔

مولانا آزاد کے اس شخصی احترام کے باجود ایک دیوبندی مسلک والے عالم کو مولانا آزاد، جیسے عالم سے، جو علماء کے کسی خاص مسلک سے وابستہ نہ تھے، اور اپنی وضع قطع اور معمولات میں بھی دوسرے علماء سے الگ تھلگ تھے، جو دلی اجنبیت ہوسکتی ہے، وہ مولانا سندھی کو بھی تھی، اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی وہ

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی میں موازنہ کرتے، تو ان کا رجحان ہمیشہ مولانا محمد علی کی طرف ہوتا (افادات وملفوظات، صفحہ ۲۴۹، بعنوان ''شخصیات''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

پروفیسر محمد سرور صاحب مذکورہ کتاب میں ہی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

مولانا سندھی نے اس پر بڑے رنج وافسوس کا اظہار کیا کہ محمد علی اور ابوالکلام آزاد میں کبھی نہ بنی، سچ پوچھئے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کا سب سے بڑا سانحہ محمد علی اور ابوالکلام کی باہمی رقابت ہے، مولانا سندھی کے الفاظ میں یہ رقابت محض شخصی نہ تھی، اس میں دو مختلف رجحانات آپس میں برسرِ پیکار تھے، آزاد نے محمد علی کو نیچے گرانے کی ہمیشہ کوشش کی، اور آخر آخر میں شاہ ابنِ سعود کے معاملے میں محمد علی کو ایسا چت کیا کہ وہ کہیں کا نہ رہا، دراصل اس کے بعد محمد علی کا سیاسی زوال شروع ہوتا ہے، وہ کانگریس سے نکلے، کانگریسی دوستوں سے لڑے، اور انجام بڑا افسوس ناک ہوا (افادات وملفوظات، صفحہ ۳۴۳، بعنوان ''مولانا محمد علی''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے خود اپنے افکار، دیوبندی مسلک کے علماء کے کتنے مطابق تھے، اور کتنے نہیں؟ یہ تو اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل بحث ہے، لیکن یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، کا شمار علمائے دیوبند میں نہیں ہوتا، اس لیے ان کے افکار سے اہلِ دیوبند کو اجنبیت ہونے میں زیادہ حیرت نہیں ہونی چاہیے، البتہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا شمار علمائے دیوبند میں کیا جاتا ہے، اس لیے اُن کے اگر کچھ افکار ایسے ہوں، جو مسلکِ دیوبند سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، تو دیوبندی مسلک کی حیثیت سے ان کی اجنبیت اور ان کی تنقید وتوضیح، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب سے زیادہ اہم ہے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ ہمارے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی

صاحبان کے تمام افکار وخیالات میں توافق اور ہم آہنگی کا دعویٰ تو مشکل ہے، البتہ ان دونوں شخصیات کی متعدد تحریرات وعبارات سے ان کے کئی افکار وخیالات میں مناسبت وموافقت کا ثبوت ہوتا ہے۔

اس موقع پر مولانا سندھی صاحب کے بعض معتقدین ومحبین حضرات کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ جب مولانا سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحبان کے تمام یا بعض افکار وخیالات میں مناسبت ومطابقت پائی جاتی تھی، تو کیا وجہ ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات کی تردید وتنقید تو کی جاتی ہے، اوران کو سرسید احمد خان اور نیچریت سے متاثر قرار دیا جاتا ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے افکار وخیالات کی تحقیق وتنقید اوران کی تردید ونکیر میں یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جاتا۔

لیکن دراصل اس طرح کے شبہات واعتراضات کم علمی اور حقیقت ناشناسی کی وجہ سے ناشی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ والوں اوراہلِ حق حضرات کا کسی سے اختلاف یا اتفاق، نفسانیت پر مبنی ہونے کے بجائے، دین کے تابع ہوتا ہے، اوران کی طرف سے اس میں اپنے اور پرائے اور عالم یا غیر عالم ہونے کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاتی۔

اسی بنیاد پر اہلِ حق حضرات نے اپنی نظر میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے افکار کے اندر جہاں تزلزل اور غلط روش محسوس کی، انھوں نے حسبِ ضرورت اس کی نشاندہی میں بھی کوتاہی نہیں فرمائی، جس کی تفصیل بندہ نے اپنی دوسری تالیف ''مولانا ابوالکلام آزاد: چند سوالات کے جوابات'' میں ذکر کردی ہے۔

البتہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے سرسید احمد خان صاحب سے جس عقیدت وتعلق کا اظہار کیا ہے، صرف اس پہلو کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی اپنی ''خود نوشت'' سے چند حوالے جات ذکر کیے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں فرماتے ہیں:

سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل ودماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی، شوق نے ارادت وعقیدت کی شکل اختیار کرلی، اور یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح، جو اپنے مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل وجان سے خریدنا چاہے، ان کی تصنیفات کا ہر ورق وصفحہ میں نے نہایت جدوجہد کرکے حاصل کیا.....

مقصود یہ ہے کہ سرسید کی تصنیفات سے شوق نہیں، بلکہ عشق ہوگیا تھا، اور طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے، اور میرے پاس نہیں ہے (خودنوشت، صفحہ ۱۷۹، وصفحہ ۱۸۰، بعنوان ''سرسید سے تاثر''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے سرسید احمد خان صاحب کی تصنیفات وتالیفات سے عشق ومحبت کا ایسا جذبہ شاید ہی مولانا عبیداللہ سندھی کے حصہ میں آیا ہو، کیونکہ سرسید سے عقیدت کے اظہار کے باوجود اس طرح کے جذبات کا اظہار تو مولانا سندھی بھی نہ کرسکے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ابتدائی زمانہ وہ تھا کہ قدیم خیالات وعقائد سے دل برداشتہ ہوچکا تھا، اور سرسید مرحوم کی تعلیمات نے ایک نئی دنیا میں پہنچادیا تھا، لیکن زیادہ دنوں تک طبیعت اس پر قانع نہ رہ سکی، جیسا کہ ہمیشہ ان حالات میں پیش آیا ہے، سرسید کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہوگئی، اور جو دروازہ انھوں نے کھول دیا تھا، اس نے بالآخر شک واضطراب کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحاد وانکار تک پہنچادیا، ابتدا میں شکوک، پھر مذہبی تاویلات کا استغراق اور ایک فلسفیانہ مذہب کا ادعا، پھر مزید اضطراب وجستجو اور اس سے الحاد وانکار کا ظہور، اور بالآخر ایک سخت اضطراب

www.idaraghufran.org

ویاس کا جماؤ، ان زمانوں کے مضامین میں ان مختلف حالات کے اثرات موجود ہیں، علی الخصوص ان مضامین میں جو مذہبی اور علمی ہیں (خودنوشت، صفحہ ۲۰۰، بعنوان ''مسلک سید سے انحراف''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے ہندوستان میں نیچریت کے بانی، جناب سرسید احمد خان صاحب کی تعلیمات کے اثرات کی جس گمراہ کن ترقی کا ذکر فرمایا ہے، اور وہ ان کے الفاظ میں الحاد وانکار کا ظہور ہے، یہ دراصل انھوں نے اپنے اوپر حق الیقین کی صورت میں ظاہر ہونے والی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی ان کے استاذ سرسید احمد خان صاحب کی تعلیمات کے اثرات نے ہی اس حد تک پہنچایا تھا، جیسا کہ پہلے گزرا۔

معلوم نہیں کہ مولانا سندھی صاحب کو بھی سرسید کی کتابوں اور تعلیمات میں الحاد وانکار محسوس ہوا تھا کہ نہیں؟

مندرجہ بالا تحریر میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اس زمانہ کے اپنے مذہبی اور علمی مضامین میں بھی سرسید احمد خان صاحب کے خطرناک افکار کے اثرات موجود ہونے کا اعتراف فرمایا، اور ساتھ ہی سرسید احمد خان صاحب کے مذہبی خیالات سے طبیعت اچاٹ ہونے کا، جو ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرسید احمد کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی، ہوسکتا ہے کہ یہ صرف طبعی اکتاہٹ ہو اور ہوسکتا ہے کہ طبعی کے ساتھ ساتھ شرعی طور پر بھی اکتاہٹ وتنفر ہوا ہو، اصل حقیقت سے تو اللہ ہی واقف ہے۔

تاہم مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے جس تفصیل وتصریح کے ساتھ سرسید احمد صاحب کے افکار وخیالات سے متاثر ہونے، ان کا دفاع وتبلیغ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اگر اسی درجے میں، وہ سرسید احمد صاحب کے افکار وخیالات سے شرعاً بیزاری وتردید کا صراحتاً اظہار بھی فرما

دیتے، تو معاملہ صاف ہو جاتا، لیکن افسوس کہ موصوف نے اپنی اس ''خودنوشت'' کے آخر تک ایسی کوئی صراحت نہیں کی، جس کی وجہ سے اس ''خودنوشت'' کا قاری کچھ اور ہی تاثر لے گا۔

جہاں تک تحریک علی گڑھ یا سرسید احمد خان صاحب کی انگریز نواز پولیٹیکل پالیسیوں اور کانگریس سے اختلاف اور تردید کا تعلق ہے، تو وہ ایک الگ مسئلہ ہے، جس کا ذکر پہلے گزرا۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''لسان الصدق'' کا زمانہ، سرسید مرحوم کی تقلید واتباع کی سرمستی کا زمانہ تھا، طبیعت میں ان کی عقیدت، پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی، کوئی آواز، جس میں ایک شائبہ، اختلاف یا تنقیص ہو، طبیعت کو گوارا نہ تھی، سرسید مرحوم کے ساتھ ان کا حلقہ یا اس وقت میری اصطلاح کے بموجب نورتن بھی اسی درجے محترم تھا، جس قدر سرسید

(خودنوشت، صفحہ ۲۱۶، بعنوان ''معترضین سید سے مقابلہ''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا سرسید احمد خان صاحب کے ساتھ عقیدت کا یہ منظر بھی کم لوگوں میں ہی نظر آئے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

یہ زمانہ تھا اور ذہن ودماغ اس عالم میں کہ اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی، میرا اشارہ سرسید کے مصنفات کی طرف ہے، چونکہ اس واقعہ نے میرے عقائد وافکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا، اس لیے میں زیادہ تفصیل سے بیان کروں گا۔

والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت (جس سے یہاں مراد، ائمہ وفقہاء کی ترکِ تقلید ہے۔ ناقل) پھر نیچریت، نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل، جو الحادِ قطعی کی ہے، اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے، اس

لیے کہ وہ نیچریت ہی کو الحادِ قطعی سمجھتے تھے، لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے، اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا.....

سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں، تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آ گئی، طبیعت چونکہ موجودہ وسابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی، اور ماحول میں کوئی غالب موثر موجود نہ تھا، اس لیے قدرتی طور پر اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کرلیا، جوں جوں بڑھتا گیا، مسحوریت بھی بڑھتی گئی، حتی کہ اب ایک مسمریزم کے معنوں کی طرح میری دماغی فعالیت بالکل عامل کے قبضے میں تھی، تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں.....

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں ''ٹھیٹھ'' اسلام سے آشنا نہیں، قرآن کے اصل حقائق ومعارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں، جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجددِ اعظم (جیسا کہ میری اس وقت کی بول چال تھی، یعنی سرسید) نے پردہ ہٹایا ہے۔

میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس زمانے کی دماغی سرشاری اور قلبی مخموری کی پوری تصویر کھینچ سکوں، میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا، ان کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی، ان کا وجود میرے ذہن میں فضائلِ انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شائبہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا تھا، بارہا حسرت ہوتی تھی کہ ''یالیتنی کنت معہ'' میں سوچتا کہ اگر وہ اس وقت موجود ہوتے، تو میں کس طرح تمام علائق ترک کر کے ان کے پاس چلا جاتا، اور کس طرح ان کی پرستش کرتا۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان، تقلید سے کبھی باز نہیں آتا، ترکِ تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے، انھیں کی تقلید شروع کر دیتا ہے، میں نے سرسید

سے سب سے بڑی چیز، جو اس وقت پائی تھی، وہ یہی ترکِ تقلید تھی، مفسرین کی، فقہاء کی، محدثین کی، متکلمین کی، تمام علماء کی تیرہ سو برس کی تمام اجماعی عقائد و مسلّمات اور ان کروڑوں اور ان گنت مسلمانوں کی، جو تیرہ صدیوں میں گزر چکے، تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلدِ اعمیٰ تھا، بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا۔

میں اس قیمتی علم پر نازاں تھا کہ توحید کے معنیٰ نہ صرف توحید فی الذات کے ہیں، بلکہ توحید فی الصفات کے بھی، یعنی جو شخص خدا اور اس کے کلام کو مان کر پھر کسی دوسرے کے قول کو قرآن ہی کی طرح بلا دلیل واجب التسلیم سمجھتا ہے، قولاً وفعلاً، تو وہ بھی شرک کا مرتکب ہے، اسی طرح **شرک فی صفة النبوة**، **شرک فی صفة القرآن** وغیرہ کی ترکیبیں میری زبان پر چڑھی ہوئی تھیں، اور میرا خیال تھا کہ یہ نہایت قیمتی تعلیم مجھے سرسید سے ملی ہے۔

لیکن کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ''سرسید'' اس سے کیوں مستثنیٰ ہو جائیں گے، ان کے مجتہدات کے تسلیم واذعان میں اس درجے استغراق اور اس کے نفس وضعیف سے اس درجے مبرا ہونے پر یقینِ کامل، کیوں **شرک فی صفة القرآن** نہ سمجھا جائے؟ (خودنوشت، صفحہ ۲۶۶ تا صفحہ ۲۶۸، بعنوان ''سرسید کی تقلید کا دور، دماغی سرشاری''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے جو سرسید سے سب سے بڑی چیز پانے کا ذکر فرمایا ہے، یعنی تمام مفسرین، فقہاء، محدثین، متکلمین اور گزشتہ صدیوں کے تمام علماء اور کروڑوں مسلمانوں کے تمام مسلمہ عقائد و مسلمات کی ترکِ تقلید اور پھر اس نیچریت کے نتیجہ میں الحاد کا نقشہ کھینچا ہے، یہ بالکل حقیقت اور واقع کی ترجمانی ہے۔

لیکن ہمیں مولانا سندھی صاحب کی طرف سے سرسید صاحب کے متعلق اس طرح کے اثرات کا ذکر نہیں ملا۔

www.idaraghufran.org

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک جگہ فرماتے ہیں:

اسی زمانے میں میں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جس کے ناتمام اوراق، اس عہد کی یادگار اب تک موجود ہیں، سرسید کے اجتہادات کا ذوق یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ ایک مکمل اور مرتب سلسلۂ اصول وفروع اس کی بنا پر میں نے قرار دے لیا تھا، اور بطورِ استخراج واستنباط بہت سے نئی نئی چیزیں پیدا کی تھیں، اس وقت دماغ کے لیے یہی سب سے بڑا مشغلہ تھا، فقہاء کی تقسیم کے مطابق اگر سرسید مجتہد مطلق تھے، تو میں گویا مجتہد فی المذہب کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بہت سے اصول، بہت سے مسائل، بہت سے فروع ایسے تھے کہ انھوں نے بالتصریح کچھ نہیں لکھا ہے، لیکن ان اصول ومقدمات سے ان کا استنباط ہوسکتا ہے، یا کسی مسلک پر تاویلیں کی جاسکتی ہیں، میں یہ سب کچھ کرتا رہتا تھا، اور اپنے ذہن میں، میں نے بہت جلد ایک مکمل اصول وفروع کا ذخیرہ مدون کرلیا تھا، اب دو باتوں کا خیال ہوا، ایک تو یہ کہ اس مسلک کو بترتیبِ عقائد واصول مدون کیا جائے، دوسرا یہ کہ سرسید کے علمِ کلام پر ایک ریویو لکھا جائے۔

مولوی چراغ علی مرحوم کو ''تہذیبُ الاخلاق'' اشاعتِ سوم میں بجواب سوال واستفسار سرسید نے ایک بڑا سلسلہ ''العلوم الجدیدۃ والاسلام'' کا شروع کیا تھا، جس میں قدیم کلام کی تدوین اور علومِ یونانیہ کی ترویج بیان کی ہے۔

مجھے یہ نام بہت مناسب معلوم ہوا، اور اسی نام سے ایک کتاب لکھنا شروع کی، اس کے دو حصے کیے: پہلے حصے کا موضوع یہ قرار دیا کہ انقلابِ علوم اور اس کے لیے نئے کلام کی ضرورت، پھر اس باب میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جس قدر مواد فراہم ہوچکا ہے، اس سب کا ذکر، اور اس سب پر مسلکِ سرسید کی ترجیح کے وجوہ، اور اثباتِ ترجیح کے بعد اس پر ایک مکمل تبصرہ، دوسرا حصہ گویا

سرسید کے علمِ کلام کا ایک مکمل متن تھا، اور ارادہ تھا کہ تمام ابواب عقائد واصول قرار دے کر انھیں سرسید کے مسلک پر مرتب کیا جائے (خودنوشت، صفحہ ۲۷۸، بعنوان ''مجتہد فی المذہب''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

جو حضرات، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحبان کے تمام افکار میں کلی مناسبت وموافقت کا دعویٰ کرتے ہیں، ان پر یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب نے مذکورہ بالا طرزِ عمل میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی کتنی موافقت فرمائی؟

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

انھوں (یعنی نواب محسن الملک) نے کسی دوست کے اعتراضات، جواب کے لیے مہیا کیے، اور ایک سلسلہ مضامین، مکاتیب ہی کے سلسلے میں اس عنوان سے لکھنا شروع کیا کہ ''تحریر ایک دوسرے کے جواب میں'' (اس میں انھوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کے جو خیالات نئے سمجھے جاتے ہیں، وہ اصولاً نئے نہیں، پچھلے مسلمانوں کے بھی ایسے خیالات رہے ہیں، زیادہ تر اس میں انھیں ''اخوان الصفاء'' اور ''کتبِ ملل ونحل'' سے اقوالِ معتزلہ کے استناد کا موقعہ ملا)

میں نے جب مضمون دیکھا، تو مجھے بہت سے قدیم اقوال، سرسید کے ذوق کے یاد آ گئے، اور اس تحریک سے ذہن اس طرف گیا کہ کیوں نہ اس موضوع پر ایک زیادہ بڑی کتاب مرتب کی جائے؟ لوگوں کو جو وحشت، سرسید کے اختراع اور جدتِ خیال سے ہوتی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی، پھر اسی سلسلے میں خیال ہوا کہ اس رنگ کی سب سے بڑی جماعت، معتزلہ کی ہے، فی الحقیقت ان کا ظہور اور ان کے خیالات کا نشوء ٹھیک انہی ظروف واحوال میں ہوا، جو اس وقت سرسید اور ان کے

رفقاء کو پیش آئے ہیں، اس وقت یورپ کے نئے تمدن اور علوم سے مقابلہ ہے، اس وقت قدیم علوم سے تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مسلمان، صاحبِ حکومت وتمدن تھے، اس لیے اجتماعی دفاع اس درجہ منفعل نہ تھا، جس قدر موجودہ عہد تنزل میں ہے، اور اس لیے معتزلہ قدیم میں جتنی اسلامی فعالیت نظر آتی ہے، اس سے معتزلہ جدید خالی ہیں، بایں ہمہ عقائد کی نسل دونوں کی ایک ہے۔

بہرحال معتزلہ کی طرف انتقالِ ذہنی ہوا، اور پھر ان کا اعتراف واعتقاد روز بروز بڑھتا گیا، جس قدر ان کے اقوال وافکار مطالعے میں آتے، ان کا مسلک مرغوب ومالوف نظر آتا۔

اب شوق ہوا کہ ایک کتاب، معتزلہ کے حالات میں لکھی جائے، اور چونکہ عہدِ متاخر میں اشاعرہ کے شیوع وتسلط نے ان کے تمام مدونات وکتب معدوم کر دیئے ہیں، اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ جستہ جستہ جس قدر اقوال وآراء متفرق طور پر مل جاتے ہیں، تفحص وجستجو سے یکجا کیے جائیں، اور کوشش کی جائے کہ عقائد ومسائل کا ایک مکمل سلسلہ مرتب ہو جائے، چنانچہ اب تمام تر ہمت ''المعتزلہ'' کی ترتیب میں مشغول ہوگئی (خودنوشت، صفحہ ۲۸۰، وصفحہ ۲۸۱، بعنوان ''محسن الملک اور سرسید۔ معتزلہ کی طرف رغبت''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے مندرجہ بالا طرزِ عمل کی مولانا سندھی صاحب نے کس قدر موافقت فرمائی؟ اس سوال کا جواب بھی دونوں شخصیات کے مابین کلی موافقت کا دعویٰ کرنے والوں کے ذمہ باقی رہ جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

اس کے علاوہ متعدد مسائل پر بتقلیدِ سرسید طبع آزمائیاں کیں، مقصود یہ تھا کہ سرسید

کے ''علوم ومعارف'' (جیسا کہ اس زمانے میں میری اصطلاح تھی) زیادہ مدلل طریق پر لکھے جائیں، بعض اشخاص سے حقیقتِ معجزات پر بحث چھڑ گئی، مجھے اس زمانے میں سرسید کے مباحث بطریقِ تقریرات خوب مستحضر تھے، میں نے اس مسلک پر ایک تحریر لکھنی شروع کی، جس میں نبوت، معجزات، معجزے کے دلیلِ نبوت نہ ہونے کے دلائل، پھر معجزات کی حقیقت، خرقِ عادت کا شرعاً امتناع ''لاتبدیل لخلق اللہ'' سے استدلال فطرۃ اللہ اور سنۃ اللہ کا بھی قوانینِ مادیہ طبیعہ میں استعمال وغیرہ وغیرہ مباحث تھے۔

بمبئی سے ایک رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں عرصے تک نکلتی رہیں (یعنی تحریر) پھر حکیم محمد حسن، شاہجہاں پور کے ایک طبیب تھے، اور میری اس وقت کی تقریروں اور مشنریوں اور آریوں سے مباحثوں کے بڑے قدرداں، انھوں نے رسالے کی شکل میں چھاپ دیا (خود نوشت، صفحہ ۲۸۲، بعنوان ''سرسید کے علوم ومعارف''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے ''ارمغانِ آزاد'' کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے متعدد مضامین جمع کیے ہیں، اس میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی مذکورہ کتابوں کا تعارف کرایا ہے، جن میں ایک کتاب ''العلوم الجدیدۃ والاسلام'' اور دوسری کتاب ''المعتزلۃ'' اور تیسری کتاب ''حقیقتِ معجزات'' ہے۔

ان کتابوں میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے سرسید احمد کے افکار کو سراہا ہے۔

(ملاحظہ ہو: ارمغانِ آزاد، صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۹، مرتب ومؤلف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، بعنوان ''مولانا آزاد کی ابتدائی نثر نگاری''، مطبوعہ: ادارہ تحقیقاتِ وتحریکاتِ ملی، پاکستان، سنہ اشاعت: 1990 عیسوی)

''خود نوشت'' کی مذکورہ عبارت میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے تو سرسید کے زہریلے اثرات کا ذکر فرمادیا، لیکن ہمیں اپنے آپ کو سرسید کا مثنیٰ قرار دینے والی ہستی کی طرف سے

اس کا ذکر نہ ملا، نہ ہی مولانا آزاد اور مولانا سندھی کے افکار وخیالات، اندازِ فکر ونظر اور زندگی کی اٹھان میں سب سے زیادہ مناسبت وموافقت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کی طرف سے صراحت ملی۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں ہی آگے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

سرسید کے مسلک نے پوری طرح تمام پچھلی خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ وبُن سے اکھاڑ دیئے تھے، اور ذہن کو وادیِ مذہب میں ہر طرح کی آزادی وجولانی کا خوگر بنادیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک وکاوش نے اور مزید وسعت اختیار کی، اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ رہ گئیں۔

سرسید کی رہنمائی نے اس منزل تک پہنچادیا تھا کہ اہلِ مذاہب کے تمام دعاوی وعقائد اس رنگ وشکل میں، جو عام طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں، محض وہم وخیال ہیں، اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔

لیکن اب یہ منزل سامنے آئی کہ عقائد کے جتنے حصے کو سرسید بھی منوانا چاہتے ہیں، وہ بھی وہم وخیال نہ ہوں؟ وجودِ باری، ذات وصفات، بقائے روح، وحی والہام، نبوت، شرائع وادیان، کیوں نہ یہ سب بھی ناقابلِ تسلیم واعتراف ہوں؟

سرسید کے مسلک نے ان تمام عقائد کی حقیقت اتنی نازک وباریک کردی تھی کہ طبیعت کے لیے اسے بھی نکال باہر کرنا کچھ گراں نہیں ہوسکتا تھا، مثلاً قدیم خیالات کے مطابق وحی کی بابت جو تصور تھا، وہ اتنا وزنی اور مافوق عقل تھا کہ دماغ، اعتقاد واعتراف کے بعد پھر اس سے انکار کرنا سہل نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لیکن اب یہ ''روشن خیالی'' تو یہ کہتی تھی کہ یہ سب جہل واوہام کی اختراع ہے (خود نوشت، صفحہ ۲۸۳، بعنوان ''نشہ سال بھر رہا، سرسید کی رہنمائی''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

www.idaraghufran.org

ملاحظہ فرمایئے کہ سرسید صاحب کے مسلک اور نیچریت کے کتنے تباہ کن اثرات پڑے، جس سے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو اپنا دین محفوظ رکھنے کے لالے پڑ گئے۔

سرسید احمد اور نیچریت کے مذکورہ بالا افکار و اثرات کو ملاحظہ کر کے، ایک مسلمان یہی دعا کرنے پر مجبور ہوگا کہ ''اعاذنا اللہ منہ''۔ آمین۔

لیکن حیرت ہے کہ اپنے آپ کو سرسید صاحب کا ثنی قرار دینے والی ہستی کو یہ اثرات محسوس نہ ہوئے اور نہ ہی مولانا آزاد اور مولانا سندھی صاحبان میں کلی مناسبت و مطابقت اور زندگی کی اٹھان کا پرزور دعویٰ کرنے والوں کی طرف سے اس کا ذکر کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے چل کر ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

> جب نئی روشن خیالی کی ہوا لگی، اور سرسید کا رنگ چڑھا، تو اگرچہ اس کا اثر صرف عقائد و افکار ہی کے دائرے میں محدود نہ تھا، بلکہ اعمال پر بھی پڑتا تھا، اب صوم وصلاۃ کی حقیقت ہم وہ نہیں سمجھتے تھے، جو عام لوگ سمجھتے ہیں، ہمارا معیار اعمال واحکام اب فلسفیانہ وحکیمانہ تھا (خودنوشت، صفحہ ۲۸۹، بعنوان ''مسلکِ سید کا اثر''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے چل کر ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

> اب جو دور شروع ہوا، اس کی ضرب بیک وقت عقائد اور اعمال، دونوں پر لگی، اور یہ پہلا موقع ہے کہ عمل میں ضعف شروع ہوا، اِدھر عقائد شکوک واضطراب کے سیلاب میں بہہ رہے تھے، اُدھر عملی زندگی کا خاتمہ ہو رہا تھا، کچھ دنوں تک تو یہ حالت رہی کہ باوجود کامل ذہنی انقلاب کے بطور عادت ورسم کے معمولی اعمال جاری رہے، کوئی کیفیت اور دل کا اٹکاؤ باقی نہ رہا تھا، لیکن وقت پر عادتاً ہر بات یاد آجاتی تھی، صبح اٹھتے تو گو نہ مذہب پر اطمینان رہا تھا، نہ مذہب کے مبادیات واساسات پر، حتّٰی کہ اس خدا کے وجود پر بھی، جس کے لیے عبادت کی جاسکتی ہے

، تاہم طبیعت اس درجے عادی ہوچکی تھی کہ بلانماز پڑھے رہا بھی نہ جاتا تھا، گویا پہلے فقدانِ عمل میں معنوی فقدان ہوا، اوراس کے بعد صوری۔

چند دنوں کے بعد شک واضطراب نے انکار تک رسائی پیدا کرلی، تواب ذہن نے پوری جدوجہد، طبیعت کے مقابلے میں شروع کردی، صاف نظر آنے لگا کہ نہ صرف فعلِ عبث ہے، بلکہ ایک سخت فریب وریا ہے، ایک عمل جس پر ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں، اسے اہلِ یقین کی طرح کرنا، خود اپنے ساتھ فریب کھیلنا ہے، یہ نہیں ہوا، جیسا کہ معمولی حالات میں ہوتا ہے کہ تدریجی رفتار کے ساتھ ترکِ عمل تک پہنچے ہوں، بلکہ چند دنوں کی فکر وکشمکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کرلیا اور صبح سے نماز ترک کردی (خودنوشت، صفحہ ۲۹۰، بعنوان ''عقائد واعمال پر ضرب''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

گزشتہ اقتباسات کے ساتھ ساتھ مذکورہ اقتباس سے بھی معلوم ہوا کہ سرسید احمد کے افکار ایک مسلمان کے اعمالِ صالحہ کو ترک کرانے ، اوراس سے بڑھ کر، ایمان اور پختہ یقین کو مذہب کے مبادیات واساسات ، یہاں تک کہ اللہ کے وجود سے بھی شک واضطراب اور انکار والحاد سے تبدیل کرانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

اب یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اپنے آپ کو سرسید کا ثنی قرار دینے والی ہستی پر سرسید کے افکار کس نوعیت کے پڑے اور مولانا آزاد اور مولانا سندھی صاحبان کے مابین اس سلسلہ میں کتنی مناسبت ومطابقت پائی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' میں آگے چل کر ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

میرے خیالات کو ترتیب کے ساتھ ان سوالات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(1) اصحابِ ادیان وشرائع کے مبادیات، مثلاً وجودِ باری، بقائے روح اور

معاملاتِ معاد، ہم کیونکر اس کا یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور کیوں ماورائے احساس کے اعتراف پر مجبور ہوں؟

(2) لیکن اگر حقیقت، اثبات میں ہے، اور دین وشریعت، من جانب اللہ ہے، تو اس میں اختلاف وتعدد کیوں ہے، اور کیوں تمام نوع وعرض پر ایک ہی دعوت نہیں بھیجی گئی؟

(3) پھر ایک مذہب کے مان لینے کے بعد نزاع وکشاکش سے نجات نہیں ملتی، کیونکہ پھر وہی یکساں دعاوی کا تزاحُم موجود ہے، خود اس مذہب کی اصلیت وصداقت، متخالف دعووں میں گم ہوگئی ہے، اور ایک ایک مذہب کے پیرو، بے شمار مذہبوں میں بٹ گئے ہیں، اسلام میں سب سے پہلے بڑے بڑے اصولی مذاہب ہیں، مثلاً شیعہ، سنی، معتزلی، اہلُ الظواہر وغیر ذالک، پھر ان کے بھی بکثرت فروع وشعب ہیں، اصولی، اخباری، اشعری، حنبلی اور مذاہبِ فقہیہ وکلامیہ، ایک ہی دعویٰ اور بے شمار زبانیں، کون سا یقینی ذریعہ ہے کہ ایک کو مان لیں، اور سب کو پسِ پشت ڈال دیں؟

دعاوی یکساں، دلائل تقریباً یکساں، پیش کردہ ثمرات یکساں، جزم واعتقاد یکساں، اور قطعی ذریعۂ ترجیح مفقود، ٹھیک جس طرح ایک مسیحی صرف اپنے ہی کو مستحقِ نجات سمجھتا ہے، اسی طرح برہمن اور اسی طرح ایک مسلمان۔

یقین کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اس کے بعد یکا یک دوسرا سمندر موجیں مارنے لگتا تھا۔

خود یقین کیا ہے؟ اور یقین کیونکر حاصل ہوسکتا ہے؟ خود اس کے وسائل اور براہین میں بھی وہی اختلاف ونزاع موجود۔

خیالات کی بے قیدی ووحشت، پھر اچانک ایک دوسری وادی کی طرف رہنمائی

کرتی تھی، اور ان تمام گوشوں سے ہٹ کر بالکل ایک نئے گوشے میں قدم پہنچ جاتے تھے، خود زندگی کیا ہے؟ اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟.....

میں نے ابنِ رشد کا استدلال بقائے روح پر پڑھا، اور اس کے صرف ایک معنیٰ سمجھ میں آئے، یعنی روح کا وجود ہی نہیں ہے (خودنوشت، صفحہ ۲۹۳، ۲۹۴، بعنوان ''اسلام کا اندرونی اختلاف۔ زندگی کیا ہے؟''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے مذکورہ کلام سے بھی نیچریت اور سرسید احمد کے افکار کے تباہ کن مناظر سامنے آتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں حق و باطل کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے اور گدھے گھوڑے برابر محسوس ہونے لگتے ہیں، بلکہ مذہب کی صحیح باتوں سے بھی الٹے نتائج برآمد ہونے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی ''خودنوشت'' کے آخر میں اپنی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

الحاد وانکار، جو بسا اوقات سوفسطائیت کا بھی عنصر اپنے اندر رکھتا تھا، ایک مصنوعی طبیعت بن کر تمام افکار وعقائد پر غالب آ گیا (خودنوشت، صفحہ ۲۹۶، بعنوان ''بے بسی اور وہ بھی کیسی؟''، مصنفہ: مولانا ابوالکلام آزاد، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، سنِ اشاعت: 2002 عیسوی)

''سوفسطائی'' ایسا فرقہ ہے، جو حسیات اور بدیہیات کا انکار کرتا ہے۔

بعض حضرات نے ''سوفسطائیہ'' کی مندرجہ ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

ایک ''عنادیة'' جو عناد کی وجہ سے چیزوں کے حقائق کا انکار کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ یہ سب وہم اور باطل خیالات ہیں۔

دوسرے ''عندیة'' جو چیزوں کے حقائق کو اپنے اعتقاد کے تابع رکھتے ہیں، اسی

وجہ سے اگر کوئی یہ اعتقاد رکھے کہ انسان، جمادِ محض ہے، تو بھی جائز ہے۔

تیسرے ''لا أدرية'' جو عقل کی قدر و قیمت کا انکار کرتے ہیں، اور ہر بات میں توقف اور شک و وہم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو: حاشیہ تفسیر حقانی، جلد اول، صفحہ ۲، باب اول، فصلِ اول، وجودِ خدا اور انبیاء کی نبوت میں، ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی) [1]

اسی قسم کے ''سوفسطائی'' عنصر نے موصوف کے افکار و عقائد پر غلبہ حاصل کر لیا تھا، اور اس کا سبب پہلے موصوف ہی کے حوالے سے بار بار ذکر کیا جا چکا ہے، یعنی نیچریت اور سر سید احمد کے افکار۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو نیچریت اور سر سید احمد خان صاحب کی اتباع کے نتیجہ میں جو اعتزال اور انکار والحاد کی وادیوں میں حیراں و سرگرداں گھومنا پڑا، دراصل اس کے زہر کا تریاق ہمیں قرآن و سنت کی نصوص اور علمائے حق، اور خاص طور پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی فکر میں پوری طرح ملتا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے نیچریت اور سر سید احمد کے افکار کو بڑی اہمیت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا، اور اس موضوع پر مستقل رسائل ترتیب دیئے، اور ان کے افکارِ باطلہ و فاسدہ کو مدلل انداز میں نمایاں کیا، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

---

[1] (السوفسطائية) فرقة ينكرون الحسيات والبديهيات وغيرها الواحد سوفسطائی (المعجم الوسيط، ج ۱ ص ۴۳۳، باب السين)

(العنادية) فرقة من السوفطائية ينكرون حقائق الأشياء ويزعمون أنها وهم وخيال باطل.....

(العندية) فرقة من السوفسطائية يزعمون أن حقائق الأشياء تابعة للاعتقاد حتى إن اعتقد أحدهم أن الإنسان جماد جاز ذلک عندهم (المعجم الوسيط، ج ۲ ص ۶۳۰، باب العين)

(اللاأدرية) نزعة فلسفية ترمي إلى إنكار قيمة العقل وقدرته على المعرفة وتطلق على إحدى فرق السوفسطائية عند العرب (المعجم الوسيط، ج ۱ ص ۲۸۲، باب الدال)

لاأدرية [مفرد]: (سف) اسم مذهب فلسفي، منحوت من لاأدرى، فرقة من السوفسطائية، قالوا بالتوقف في علم الأشياء كلها (معجم اللغة العربية المعاصرة، ج ۳ ص ۱۹۸۶)

www.idaraghufran.org

تذکرہ سلیمان کے مصنف، غلام محمد، بی۔اے۔عثمانیہ، لکھتے ہیں:

مولانا ابوالکلام (آزاد) مرحوم، حضرت والا (مولانا سید سلیمان ندوی) کے قدیم رفیق، اور ان کے کمالات کے معترف تھے، مدت تک مل جل کر کام کرتے رہے، لیکن ادھر عرصے سے دونوں کی راہ الگ ہوگئی تھی اور ملنے ملانے تک کا موقع برسوں سے نہیں آیا تھا، مگر مولانا (آزاد) تک حضرت (سید سلیمان ندوی) کے روحانی انقلاب کی خبر بہرحال پہنچ چکی تھی، اور وہ بھی حیرت زدہ تھے کہ یہ کیا ہوگیا؟ خود حضرت والا (مولانا سید سلیمان ندوی) نے سنایا کہ برسوں بعد، جب مولانا ابوالکلام (آزاد) بھارت کے وزیر تعلیم بن چکے تھے، دہلی میں کسی دعوت میں، ان سے ملاقات ہوگئی، تو انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا:

''مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید ہو چکے ہیں اور ان کے خلیفہ مجاز بھی ہیں؟''

حضرت والا (مولانا سید سلیمان ندوی) نے دونوں باتوں کا اعتراف فرمایا، تو پھر مولانا (آزاد) نے سوال کیا، آخر تصوف میں ہوتا کیا ہے؟

حضرت والا (مولانا سید سلیمان ندوی) نے جواب دیا کہ:

یہ بات تو کسی تفصیلی صحبت میں پوچھنے کی ہے، اس مختصر وقت میں کیا بتاؤں۔

(بات ختم ہوگئی اور پھر کسی ملاقات کی نوبت نہیں آئی، سوال تشنہ جواب ہی رہ گیا، مگر اب سائل و مسئول دونوں وہاں پہنچ گئے ہیں، جہاں بغیر سوال کے ہر حقیقت خود بخود شاہد ہے)

غرض اس واقعہ کو سنا کر حضرت والا (مولانا سید سلیمان ندوی) نے فرمایا کہ یہ وہی مولانا ابوالکلام ہیں، جن کے والد ماجد، کلکتہ کے مشہور پیر تھے اور ان کے وصال پر لوگوں نے ان (مولانا آزاد) کو ان (کے والد) کا گدی نشین بھی کیا تھا، اگر

وہاں کچھ پایا ہوتا، تو آج یہ سوال کیوں کرتے؟ رسم ورواج نے حقیقت گم کردی اوراس رسمی پیری مریدی کو دیکھ کرلوگ حقیقتِ تصوف کے، جس کا صحیح عنوان تقویٰ واحسان ہے، منکر ہوگئے۔

(تذکرہ سلیمان، ص۱۵۴و۱۵۵، ناشر: ادارہ مجلس علمی، کراچی، تاریخ اشاعت: ۱۹۶۰، عیسوی)

جناب عبدالرزاق ملیح آبادی صاحب کی، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے ساتھ 38 سال رفاقت رہی، وہ مولانا موصوف کے ساتھ جیل میں بھی رہے، اپنی اس 38 سالہ رفاقت کے دوران پیش آنے والے حالات اور واقعات کو انھوں نے ''ذکرِ آزاد'' کے نام سے ایک مجموعہ میں پیش کیا ہے، جس میں انھوں نے مولانا آزاد صاحب کے جیل میں محبوس ہونے کے زمانہ میں ''مولانا میں مذہبی انقلاب'' کے عنوان سے مولانا آزاد صاحب کی ایک لمبی خود نوشتہ تحریر بھی نقل کی ہے، جو ان کی خواہش پر مولانا موصوف ہی نے خود اِن کو تحریر کرکے دی تھی، اس پوری تحریر کو جناب عبدالرزاق ملیح آبادی صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں نقل کیا ہے۔

اس میں مولانا آزاد صاحب نے اپنی حالت کا نقشہ درجِ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

''کیا فی الحقیقت خدا کا وجود ہے؟ اور کیا واقعی مذہب کے تمام بتلائے ہوئے عقائد حقیقت رکھتے ہیں؟''

''اگر ایسا ہی ہے، تو پھر اتنی بڑی حقیقت اور سچائی میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟ مذہب، اگر ہدایت اور امن کے لئے ہے، تو پھر وہی انسان کے تمام اختلافوں اور جھگڑوں، بلکہ انتہاء درجے خونریزیوں کا سبب کیوں بن گیا ہے؟ حقیقت ایک ہی ہوسکتی ہے۔ ایک سے جو زیادہ ہے، وہ تو حقیقت نہیں ہے۔''

''پھر اگر دنیا کے اتنے بے شمار مذہبوں میں سے کسی ایک مذہب کو مان بھی لیا جائے، تو بھی مشکل کہاں ختم ہوتی ہے؟ ہر مذہب کے اندر بھی تو بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں، اور بہت سی جماعتوں میں اس کے ماننے والے بٹ گئے ہیں؟ ایک کیوں حق پر ہے، اور دوسرا کیوں حق پر نہیں؟''

www.idaraghufran.org

یہ تین سوال تھے، جو 14 برس کی عمر میں مجھ پر اس طرح چھا گئے تھے کہ خون اور گوشت کی جگہ میرے اندر صرف اِنہی کی گونج ابھری ہوئی محسوس ہوتی تھی، گرہ کو جس قدر کھینچا جائے، اُتنا ہی اور زیادہ اُلجھ جاتی ہے، اسی طرح میں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اُتنا ہی زیادہ اُلجھاؤ بڑھتا جاتا تھا۔

میں نے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، مختلف مذہبوں کی کتابیں بار بار دیکھ ڈالیں، میں اُس وقت بمبئی میں تھا، وہاں مجھے متعدد عیسائی، یہودی، پارسی، بہائی، ناستک اور ہندو عالموں سے ملنے اور بحث ومباحثہ کا موقعہ ملا، لیکن اُن کی باتیں میری اُلجھن کو اور زیادہ کرتی تھیں۔ اُن کے جوابات اور مباحث سُن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری پریشانی اُس سے کہیں زیادہ ہونی چاہئے، جس قدر میں سمجھے ہوا تھا، بالآخر یہ اندرونی تکلیف یہاں تک بڑھی کہ میں بیمار ہوگیا، غذا بند ہوگئی، نیند اُچاٹ ہوگئی۔

اس اثناء میں میں نے ماڈرن فلاسفی اور سائنس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا، جس قدر مطالعہ مشرقی زبانوں میں تراجم سے کرسکتا تھا، اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کی طرف سے میری بے اطمینانی اور زیادہ گہری ہوگئی۔

اب مجھ پر وہ دروازہ کھلا، جو اس راہ میں ہمیشہ کُھلا کرتا ہے، یعنی مذہب اور عقل کی تطبیق واتحاد کا طریقہ۔ اس کے بھی متعدد اسکول ہیں، میں نے سب کا مطالعہ کیا، اور اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک عارضی سکون مجھے ہوگیا، اسی زمانے میں میں نے سرسید احمد خاں مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا، جن کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے موجودہ زمانے میں مذہب اور ماڈرن سائنس کو ملانے کے لئے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ہے، مجھ پر اُن کی تصنیفات کا بہت اثر پڑا۔ حتیٰ کہ کچھ دِنوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل اُن کا مقلد اور پیرو ہوگیا تھا۔

مگر یہ وقفہ عارضی تھا، بہت جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ منزل مذہب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے، بلکہ مذہب سے انکار کی ایک نرم اور ملائم صورت ہے۔

آخری نتیجہ میرے دل ودماغ پر حاوی ہوگیا تھا، یعنی گو میں زبان سے صاف صاف اقرار نہیں کرتا تھا، لیکن میرے اندر قطعی انکار والحاد کی آواز گونج رہی تھی۔

میں اب پکا دہری ہوگیا تھا، مٹیریلزم اور ریشنلزم کے اعتقاد پر میرے اندر فخر وغرور تھا، اور مذہب کے نام میں جہل وتوہم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، تاہم وہ چیز کہاں تھی، جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا؟ یعنی دل کا اطمینان؟ وہ تو اب اور زیادہ دُور ہوگئی تھی، میرے اضطراب کی اندھیاری میں تسلی کی ایک ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی!

14 برس سے لے کر 22 برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا۔ میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا، جو مذہب کو عقل وعلم کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتا ہے، لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق!

یہی منزل میری آخری مایوسی کی منزل تھی۔

اور اسی کے بعد اچانک امید کی روشنی میرے سامنے چمکی۔ میں جس طرح اُس ہاتھ کو نہیں بتلاسکتا، جس نے مجھے اندھیاری میں دھکیلا، اسی طرح میں اُس ہاتھ کے لئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جس نے اچانک مجھے اُجالے میں پہنچادیا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ روشنی نمودار ہوئی، اور نو برس خاک چھاننے کے بعد میں نے اپنی منزلِ مقصود خود، اپنے ہی پاس موجود پائی، تمام شکوک دُور ہوگئے، تمام دھوکے مٹ گئے، جس یقین اور اطمینان کی تلاش تھی، وہ مجھے حاصل ہوگیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں، اور دونوں کی ایسا پوزیشن نہیں ہے، کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی

جائے، مادہ اور محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کر سکتے ہیں، مگر مذہب جس عالم کا پیام لاتا ہے، اس کے لیے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے، اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی، سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم کرنا چاہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ جس مذہب کو دنیا ''اسلام'' کے نام سے پہچانتی ہے، فی الحقیقت وہی مذہبی اختلافات کے سوال کا اصلی حل ہے۔

اسلام، دنیا میں کوئی نیا مذہب قائم نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اُس کا مشن خود اُس کے بیان کے مطابق صرف یہ ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اپنی اصلی اور بے میل سچائی پر قائم ہوجائیں، اور باہر سے ملائی ہوئی جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں۔

اگر وہ ایسا کریں، تو جو اعتقاد ان کے پاس ہوگا، اُس کا نام قرآن کی بولی میں اسلام ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ سچائی ایک ہے، ابتداء سے موجود ہے، اور تمام انسانوں اور قوموں کے لیے یکساں طور پر آتی رہی ہے، دنیا کا کوئی ملک، کوئی گوشہ نہیں، جہاں خدا کے سچے بندے نہ پیدا ہوئے ہوں، اور انھوں نے سچائی کی تعلیم نہ دی ہو، لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ لوگ کچھ دنوں تک اس پر قائم رہے، پھر اپنے خیال اور وہم سے طرح طرح کی نئی اور جھوٹی باتیں نکال کر اس طرح پھیلا دیں کہ وہ خدا کی سچائی، انسانی ملاوٹ کے اندر گم ہوگئی۔

اب ضرورت تھی کہ سب کو جگانے کے لیے ایک عالم گیر صدا بلند کی جائے۔

یہ اسلام ہے، وہ عیسائی سے کہتا ہے کہ سچا عیسائی بنے، یہودی سے کہتا ہے کہ سچا یہودی بنے، پارسی سے کہتا ہے کہ سچا پارسی بنے، اسی طرح ہندوؤں سے کہتا ہے کہ

اپنی اصلی سچائی کو دوبارہ قائم کرلیں، یہ سب اگر ایسا کرلیں، تو وہ وہی سچائی ہوگی، جو ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ سب کو دی گئی ہے۔

کوئی قوم نہیں کہہ سکتی کہ وہ صرف اسی کی میراث ہے، اسی کا نام ''اسلام'' ہے، اور وہی ''دین الفطرۃ'' یعنی خدا کا بنا ہوا نیچر، اسی پر یہ تمام کارخانۂ ہستی چل رہا ہے، سورج کا بھی وہی دھرم ہے، زمین بھی اس کو مانے ہوئے ہر آن گھوم رہی ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی ہی اور کتنی زمینیں اور دنیا میں ہیں، اور ایک خدا کے ٹھہرائے ہوئے ایک ہی قانون پر عمل کر رہی ہیں۔

پس قرآن، لوگوں کو اُن کے مذہب سے چھڑانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کے اصلی مذہب پر اُن کو دوبارہ قائم کردینا چاہتا ہے، دنیا میں بے شمار مذہب ہیں، ہر مذہب کا پیرو سمجھتا ہے کہ سچائی صرف اُسی کے حصے میں آئی ہے، اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قوم اور نسل کی طرح سچائی کی بھی میراث ہے۔

اب اگر فیصلہ ہو تو کیونکر ہو؟ اختلاف دُور ہو تو کس طرح ہو؟

اس کی صرف تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

ایک یہ کہ سب حق پر ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ حق ایک سے زیادہ نہیں۔ اور حق میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔

دوسری یہ کہ سب باطل پر ہیں۔ اس سے بھی فیصلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر حق کہاں ہے؟ اور سب کا دعویٰ کیوں ہے؟

اب صرف ایک تیسری صورت رہ گئی، یعنی سب حق پر بھی ہیں، اور سب ناحق پر بھی، یعنی اصل ایک ہے، اور سب کے پاس ہے، ملاوٹ باطل ہے، موجبِ اختلاف ہے، اور سب اُس میں مبتلا ہوگئے ہیں، اگر ملاوٹ چھوڑ دیں، اور اصلیت کو پرکھ کے صاف کرلیں، تو وہ ایک ہی ہوگی، اور سب کی جھولی میں نکلے گی۔

''قرآن'' یہی کہتا ہے اور اُس کی بولی میں اسی مشترک اور عالمگیر اصلیت کا نام اسلام ہے۔

شک اور انکار کے بعد یقین اور اعتقاد کے حصول میں میرے نظر وفکر کا کیا عالَم رہا، اور میرے تمام لاینحل سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت لمبی چوڑی داستان ہے، اور میری موجودہ تصنیفات انہی کی شرح ہیں'' (انتہیٰ)

(ذکرِ آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال، ص۱۵۱، تا ص۱۵۴، بعنوان: قادیانی، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنِ اشاعت: 2006)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی مذکورہ تحریر کا جہاں اختتام ہوا ہے، ہم نے اس کو مکمل نقل کر دیا ہے۔

اب یہ بات غور طلب ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سندھی صاحبان کے مابین ہر طرح کی مناسبت ومطابقت کا دعویٰ کرنے والے حضرات اس سلسلہ میں کس طرح مطابقت ظاہر کر سکتے ہیں۔

پھر مذکورہ عبارت کے بعد متصل ہی جناب عبدالرزاق ملیح آبادی صاحب نے ''ذکرِ آزاد'' ہی میں ''قادیانی'' کی سُرخی قائم کر کے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا لکھا ہوا ایک فتویٰ نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف، قادیانیوں کو سخت گمراہ تو سمجھتے تھے، لیکن انھیں احتیاط کی بنا پر کافر قرار نہیں دیتے تھے۔

چنانچہ اس فتوے کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

خود اس (قادیانیوں کی) جماعت میں دو گروہ ہو گئے ہیں، اور دونوں مرزا صاحب کے اقوال وعقائد کے تعیین میں باہم دگر معارض ہیں، لاہوری جماعت، ان تمام باتوں کا کچھ دوسرا مطلب بتلاتی ہے، ایسی حالت میں کیونکر جائز ہوگا کہ ان پر ملت سے خارج ہونے کا حکم دے دیا جائے۔

میرے نزدیک ان کا شمار اسلام کے گمراہ فرقوں میں ہے، اور جو اُن میں غالی ہیں، ان کی گمراہی، کمال مرتبۂ ضلالت تک پہنچی ہوئی ہے، تاہم میں کسی ایسے فرد یا جماعت کو جو شہادتین کا اقرار کرتی ہو، یومِ آخرۃ پر ایمان رکھتی ہو، اور قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی ہو، اس معنیٰ میں کافر نہیں کہہ سکتا، جس سے مقصود ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو جانا ہے۔

میرے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ان سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا جائے، ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ بے جا تشدد ہوگا، بلکہ ان کی جماعتی تقویت کا موجب ہوگا (ذکرِ آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال، ص ۱۵۶، بعنوان: قادیانی، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنِ اشاعت: 2006)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا قادیانیوں کے متعلق موقف پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، جس میں تقابل کر کے دونوں حضرات کے افکار و خیالات اور عقائد و نظریات وغیرہ میں مطابقت و مناسبت کے مدعی حضرات، کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب فرماتے ہیں:

**وقال :ومن اعتقادی انه لاینزل المسیح بن مریم (علیه السلام) فقیل له فی ذلک کیف نعتقد ذلک وقد صح فی نزوله احادیث وتواترت فما قولک فیها .**

**فأجاب ذکر نزوله فی سلسلة اشراط الساعة ولیس مما یدخل فی العقیدة اهـ.**

**ویا للعجب أليس التصدیق بما جاء به نبینا القرشی محمد صلی الله علیه وسلم من العقیدة فاذا جاء رسولنا صلی الله علیه وسلم بأمر وأخبر بوقوعه وصح الاسناد واتصل به وتواتر عنه شرقا**

وغربا علی ظهر البسيطة فهل نرتقب بعده فی الايمان به والاذعان له لامر آخر حتی يامرنا صريحا بقوله وآمنوا بنزول ابن مريم علی انه لايكفی هذا عنده فی الحديث بل لا بد ان يكون فی القرآن وامنوا بنزول عيسی ابن مريم .أفليس يكفی قوله صلی الله عليه وسلم وكيف أنتم اذا نزل فيكم ابن مريم وای صراحة ابين منها وای اخبار اصرح منه ومع هذا تواتر معناه (ع) فی طلعة الشمس ما يغنيک عن زحل .

ولو كان الأمر كما زعم فأين الصلوات الخمس صراحة؟ و أين مقادير الزكاة؟ و أين مسائل كفارة الصيام؟ ثم و ثم الی ما يشكل استقصاء ه، أفليس اعتقاد فرضيتها من الامور التی عليها مدار النجاة؟ أو ليس يكفر من أنكر فرضيتها؟ قال شيخنا امام العصر رحمه الله فی رسالته "اكفار الملحدين فی ضروريات الدين": واذا علمت هذا فنقول: الصلاة فريضة، واعتقاد فرضيتها فرض، وتحصيل علمها فرض، وجحدها كفر، وكذا جهلها كفر، والسواک سنة، واعتقاد سنيته فرض، وتحصيل علمه سنة، وجحودها كفر، وجهله حرمان، وتركه عتاب أو عقاب اهـ.

وانما أطنبت و أسهبت فی غير ما كنت أحاوله من أول الامر اعلانا بما بدا لی من الكدر فی تفسيره والتدليس البين، ولم يكن عندی من الدين لو كنت أغمض و أضرب عنه صفحاً، فان سموم الالحاد قد هبت فی الهند و عمت ارجائها القاصية و اصبح اليوم مناط فهم القرآن المجيد علی امثال هذه التفاسير لتعبيراته الرائقة

www.idaraghufran.org

**العصرية، فقلما سلم منه أحد الا رجل أعطاه الله علماً صحيحاً، أو تزكى نفسه بأنفاس الذين لصحبتهم تأثير عظيم فى اصلاح النفوس، فثلج صدره بما جاء به النبى عليه الصلاة والسلام، ولم يحكم فيه رأيه الضئيل الواهى، و قد شرع أحد علماء الفنجاب من أهل الحديث فى تأليف تفسير فى الرد على "ترجمان القرآن" وطبع منه جزء لم أوفق بعد لمطالعته، وأظن أنه أشبع فى الرد عليه.**

**ويا ليت لو كان ابو الكلام ذا علم صحيح مولعا بالدين الذى جاء به محمد صلى الله عليه وسلم يكاد يعد من اعاظم رجال الدورة الحاضرة الذين يتباهى بهم العصر ولكان له فى القلوب مكانة، غير ان محبة الدين اعلق بقلب المؤمن من محبة ابى الكلام، فلا بد ان تصان الشريعة من الوسخ الذى يحط من قدرها،عند اولى البصائر النافذة واصحاب العقول السليمة** (يتيمةُ البيان فى شئ من علوم القرآن، ص ٦١ الى ٦٣، الناشر: مجلس الدعوة التحقيق الاسلامى بكراتشى، باكستان، الطبعة الثالثة 1416هـ، 1995م)

ترجمہ: مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بھی کہنا ہے کہ میرے عقیدہ کے مطابق مسیح ابنِ مریم علیہ السلام کا نزول نہیں ہوگا، جب ان سے یہ کہا گیا کہ ہم یہ عقیدہ کیسے رکھیں، جب کہ مسیح ابنِ مریم کے نزول کی احادیث صحیح ہیں اور متواتر ہیں، تو آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مسیح ابنِ مریم کے نزول کا ذکر، علاماتِ قیامت کے سلسلے میں آیا ہے، اور یہ عقائد کی چیزوں میں داخل نہیں۔

www.idaraghufran.org

لیکن ان کی یہ بات قابلِ تعجب ہے، کیا جو بات ہمارے نبیِ قرشی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہو، اس کی تصدیق کا عقائد سے تعلق نہیں؟ پس جب ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا حکم دے دیا، اور اس کے (قیامت سے قبل) واقع ہونے کی خبر دے دی، اور اس کی سند صحیح ہے، اور متصل ہے، اور مشرق اور مغرب میں تواتر کے ساتھ کھلے انداز میں پہنچ چکی ہے، تو کیا ہم اس کے بعد اس پر ایمان لانے اور یقین کرنے کے لیے کسی دوسری چیز کا انتظار کریں گے، یہاں تک کہ ہمارے پاس صریح طور پر یہ حکم آ جائے کہ تم ابنِ مریم کے نزول پر ایمان لاؤ، علاوہ ازیں ان (موصوف) کے نزدیک حدیث میں یہ بات کافی نہیں، بلکہ یہ ضروری ہے کہ قرآن میں یہ حکم ہو کہ تم عیسیٰ بن مریم کے نزول پر ایمان لاؤ، کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کافی نہیں کہ تم اس وقت کس حال میں ہو گے، جب تمھارے اندر عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا، اور اس سے زیادہ صراحت اور کون سی ہو سکتی ہے، اور اس سے زیادہ صریح حدیث اور کون سی ہو سکتی ہے، اس کے باوجود وہ ایسے تواترِ معنوی تک پہنچ چکی ہے، جیسا کہ سورج کا طلوع ہونا زحل سیارے کی رفعت سے مستغنی کر دیتا ہے، اگر موصوف کے وضع کردہ اس کلیہ کہ:

''وہ حکم جس کو صراحتاً عقائد میں شمار کیا گیا ہوگا، اس کا عقیدہ رکھنا تو ضروری ہے، وگرنہ دیگر احکام جو صراحتاً عقائد میں شمار نہ کئے گئے ہوں گے، ان کا عقیدہ رکھنا بھی کسی شخص پر ضروری نہ ہوگا''

کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پانچ نمازوں کا ذکر صراحتاً کہاں وارد ہوا ہے؟

اسی طرح مقادیر زکوٰۃ، کفارۂ صوم کے مسائل کہاں صراحتاً ارشاد فرمائے گئے ہیں؟

اسی طرح دیگر کئی احکام جن کا احصاء بھی دشوار ہے، وہ کہاں صراحتاً ذکر کئے گئے ہیں۔

اب کیا ان امور کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا، ان امور میں سے شمار نہ ہوگا، جن پر نجات اخروی کا دار ومدار ہے؟ کیا ایسا شخص کافر نہ ٹھہرے گا، جو ان امور کی فرضیت کا انکار کرے؟ ہمارے شیخ حضرت امام العصر رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''اکفار الملحدین فی ضروریات الدین'' میں فرماتے ہیں:

''جب اتنی بات جان لی گئی تب ہم کہتے ہیں کہ: نماز ایک فریضہ ہے، اس کی فرضیت کا اعتقاد بھی فرض ہے اور اس کا جاننا، سیکھنا بھی فرض ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح اس سے بے خبر رہنا اور نہ جاننا اور نہ سیکھنا کفر ہے۔ اسی طرح مسواک کرنا سنت، اور اس کی سنیت کا اعتقاد فرض اور اس کا جاننا، سیکھنا بھی سنت ہے، اور اس کا انکار کفر ہے، اس سے بے خبری محرومی ہے اور اس کا ترک کرنا خدائے پاک کا عتاب ہے یا پھر خدائے پاک کی جانب سے دنیوی عقوبت''

باوجود اس کے کہ اس رسالہ کے شروع ہی سے میں تفصیل واطناب سے کام نہیں لے رہا تھا، اس مقام پر میں نے خوب تفصیل کی، یہ صرف اس وجہ سے کہ موصوف کی تفسیر میں مجھے اس قسم کے واضح داغ اور خوب دھوکہ وفریب نظر آیا اور میں اس قسم کے اعتراضات سے چشم پوشی اور تسامح بڑی بددیانتی سمجھتا ہوں، اس لئے کہ الحاد وزندقہ کی زہریلی ہوائیں، اس وقت سارے ہند میں چل رہی ہیں اور اس قطعۂ زمین کو ان مہلک ہواؤں نے خوب بھر دیا ہے اور قرآن کے سمجھنے کا دارومدار ایسی تفاسیر پر رکھا جانے لگا، جن میں عصری تقاضوں کے مطابق لچکدار تعبیرات ہوں۔ ان مہلک عقائد ونظریات سے صرف وہی شخص بچ سکتا ہے جس کو خداوند کریم صحیح فہم عطا فرمائیں، یا وہ شخص جن کا نفس ان بزرگانِ دین کی صحبت میں پاک سے پاک تر ہوتا چلا گیا ہو، جن کی صحبت میں قلوب کی حیرت انگیز اصلاح ہوتی ہے۔

چنانچہ ان تمام شرائع واحکامات پر جنھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اس کا سینہ ٹھنڈا اور مطمئن رہتا ہے، اوران احکامات میں وہ اپنی کم زور رائے سے رائے زنی نہیں کرتا۔

پنجاب کے ایک اہلِ حدیث عالم محترم ابراہیم سیالکوٹی نے اس ''ترجمان القرآن'' کے رَد میں ایک تفسیر تالیف فرمانا شروع کی تھی، اوراس کی ایک جلد بھی طبع ہوچکی ہے، لیکن میں اب تک اس کا مطالعہ نہیں کرسکا ہوں، میرا خیال ہے کہ فاضل مذکور نے اپنے اس رَد میں خوب سیر حاصل ابحاث تحریر کی ہوں گی۔

اور کاش کہ اگر ابوالکلام صحیح علم اوراس دین سے پوری طرح سیراب ہونے والے ہوتے، جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، تو قریب تھا کہ ان کو موجودہ دور کے عظیم رجالِ کار میں شمار کیا جاتا، جن کی وجہ سے زمانہ فخر کرتا ہے، اوردلوں میں ان کی قدر ومنزلت بہت ہوتی، لیکن اصل بات یہ ہے کہ مومن کے دل میں دین کی محبت ابوالکلام کی محبت سے زیادہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ شریعت کو اس میل کچیل سے محفوظ رکھا جائے، جو اس کو اس درجے سے گرادے، جو انتہائی اہلِ بصیرت اور عقلِ سلیم والے حضرات کے نزدیک ہے (یتیمۃ البیان)

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے زمانہ کو پایا ہے، اوران کے زمانہ کی مطبوعہ تحریرات وحالات کو ملاحظہ کیا ہے، اس لیے ہم اس سلسلے میں مولانا بنوری صاحب کی رائے کو انتہائی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس میں مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے بعض متنازع افکار سے اختلاف کا اظہار کیا، دوسری طرف ان کی بعض اچھی صفات کا ذکر بھی فرمایا۔

عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں امور کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر فیصلہ کیا جائے، اورافراط یا تفریط میں مبتلا نہ ہوا جائے، جیسا کہ آج کل اس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں، اوراس کی وجہ

سے کئی مفاسد وجود میں آ رہے ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے اپنی مذکورہ عبارت میں ایک ایسے اہم نکتہ کو بھی واضح فرمادیا، جس میں افراط وتفریط پائے جانے کی وجہ سے آج طرح طرح کے دینی اور دنیاوی فتنے لازم آ رہے ہیں، اور وہ دین اور شخصیات کے مابین محبت وعقیدت میں افراط وتفریط اور غلو کا ارتکاب ہے۔

ایک مومن کو بحیثیت مومن کے، دینِ اسلام کی محبت، کسی بھی بزرگ شخصیت سے زیادہ ہونی چاہئے، اس کے دین وایمان کا تقاضا یہی ہے، اور دوسرے سے محبت دین واسلام کے تابع ہونی چاہئے۔

اس اہم اصول کی بنیاد پر اگر کسی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے محبت وتعلق ہے، تو وہ الگ معاملہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ دین کے مقتضیات اس محبت پر غالب رہنے چاہئیں۔

یہ اعتدال، اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، جو مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> نزولِ مسیح کے بارے میں میری جس تحریر کی نسبت آپ نے سوال کیا تھا، اس کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ نزولِ مسیح کے معاملے کو کوئی مسلمان شرائطِ ایمان ونجات میں سے نہیں سمجھتا، پس جو لوگ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کسی دوسرے انسان پر ایمان لانا شرطِ اسلام ونجات ہے، وہ اس سے احتجاج نہیں کر سکتے۔
>
> اور یہ جو میں نے لکھا تھا کہ اس معاملے کا تعلق آثار وعلائمِ قیامت سے ہے، تو یہ کوئی نئی تحقیق نہ تھی، بلکہ جمہور کے عقیدہ کا اظہار تھا۔

چونکہ نزولِ مسیح کی بعض روایات اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ ''**لاتقوم الساعة حتی ینزل المسیح و حتی یکون کذا و کذا**'' اس لیے عام طور پر

لوگوں نے اس معاملے کو بھی، اسی طرح ''اشراطِ ساعۃ'' میں سے سمجھا ہے، جس طرح دوسرے معاملات متذکرۂ روایات کو اور اس لیے محدثین اسے ''اشراطِ ساعۃ'' کے ہی باب میں لاتے ہیں، اور اس حیثیت سے اس پر بحث کرتے ہیں، نیز جن علماء نے خصوصیت کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا ہے، انھوں نے بھی ان کے لیے اشراط و آثارِ قیامت ہی کا نام وعنوان اختیار کیا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ پیشن گوئیوں کی حیثیت سے بھی ان کی نوعیت کیا ہے؟ اور تحقیق کا فیصلہ کیا ہونا چاہئے؟ تو یہ بالکل دوسرا سوال ہے، اور بلاشبہ روایات اس بارے میں قطعی اور فیصلہ کن نہیں، نیز اس میں بھی شک نہیں کہ اسلام سے پہلے مسیحی اعتقاد اس بارے میں موجود تھا، اور مسیحیت کے صدر اول ہی میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

''ترجمان القرآن'' جلد سوم کا انتظار کیجیے، اس میں بہ ضمن تفسیر سورۂ زخرف اس پر مفصل بحث ملے گی۔

ابوالکلام

(نقشِ آزاد، ص ۹۸ و ۹۹، مکتوب نمبر ۴۷، مرتبہ: غلام رسول مہر، ناشر: کتاب منزل، لاہور)

اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، اپنے مورخہ 16 اکتوبر 1963 عیسوی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

تعجب ہے کہ نزولِ مسیح کے بارے میں آپ کی خلش باقی ہے، میں نے اپنی رائے ظاہر کردی تھی، البتہ وجوہ و دلائل کے لیے کتاب کا حوالے دیا تھا، بغیر تفصیل کے ان کا استقصاء ممکن نہیں، بلاشبہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ عقیدہ اپنی نوعیت میں ہر اعتبار سے ایک مسیحی عقیدہ ہے، اور اسلامی شکل ولباس میں نمودار ہوا ہے، لیکن کیونکر نمودار ہوا؟ یہ بحث طلب ہے، اگر آپ کسی وجہ سے اسے بہت ہی اہم سمجھتے

ہیں، تو کوشش کروں گا کہ وقت نکال لوں، اور یہ تفصیل لکھوں (نقشِ آزاد، ص۱۰۲، مکتوب نمبر۴۹، مرتبہ: غلام رسول مہر، ناشر: کتاب منزل، لاہور)

قیامت سے قبل نزولِ عیسیٰ کے عقیدہ پر ایمان لانا احادیثِ کثیرہ بلکہ متواترہ کی وجہ سے ضروری ہے، جس پر اہلِ علم حضرات نے شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے نزولِ عیسیٰ کے انکار کے سلسلے میں اپنے مذکورہ بالا مکتوبات میں جو تاویل کی ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان پر نزولِ عیسیٰ کی احادیث کی کثرت اور اس عقیدہ کی مضبوطی مشتبہ رہی، ان کی تفسیر سے بھی اس کا واضح جواب نہیں ملتا۔ واللہ اعلم۔

اب یہ تاویل وتوجیہ کس درجے میں موثر ہے؟ ہم اس موضوع پر خود سے لب کشائی مناسب نہیں سمجھتے، تاہم ہمارا اپنا عقیدہ ونظریہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق قیامت سے قبل عیسیٰ ابنِ مریم کے نزول کے حق ہونے کا ہے۔

جہاں تک اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے نظریہ کا تعلق ہے، تو اس کا باحوالہ ذکر پہلے گزر چکا ہے، جس کے پیشِ نظر اس مسئلہ میں دونوں اشخاص کے موقف میں کافی حد تک مطابقت ومناسبت کا دعویٰ درست کہلایا جاسکتا ہے۔

ہمیں خدشہ ہے کہ مذکورہ بالا تصریحات کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا سندھی صاحبان کے افکار میں کلی موافقت ومناسبت کے مدّعی حضرات، بالخصوص جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب بھی نظرِ ثانی پر مجبور نہ ہوجائیں، البتہ اگر ان کی اپنی مراد یہی ہو کہ سرسید احمد کے جن افکار کے سنگین نتائج کا مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو سامنا کرنا پڑا تھا، اسی طرح کا سامنا مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو بھی کرنا پڑا، تو پھر الگ بات ہے۔

کیونکہ جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب سرسید احمد خان سے کافی متاثر اور ان کے معتقد تھے۔

چنانچہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے ''ارمغانِ آزاد'' کے نام سے مولانا

ابوالکلام آزاد صاحب کے متعدد مضامین جمع کیے ہیں، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا ایک مضمون ''ممالکِ اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات'' کے عنوان سے موجود ہے، جو ''الکلام، پٹنہ، 25 ستمبر 1960 عیسوی'' کے حوالے سے شائع کیا گیا، اس مضمون کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرماتے ہیں:

سرسید احمد خان مرحوم کی بے نظیر فطری قابلیت، بے مثل عالی دماغی اور ان کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اَب سے تیس چالیس برس پیشتر اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبانی سرزمینِ ہند میں بلند ہوئی تھی، آج مصر، اسلامبول (استنبول) اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار گزرتا تھا، اور جسے ہم اپنے خیال میں بے وقت کی راگنی سمجھ رہے تھے، آج ہمارے تفنّن پسند کانوں کو نہایت سریلا اور دل کش معلوم ہو رہا ہے، اور ہم ہیں کہ اس راگ پر مست ہوئے جاتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص اس راگ پر مٹا ہوا ہے، پچھلی مخالفت اب خود ہم کو شرمناک معلوم ہوتی ہے، اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور صریح باتیں، دیوِ تعصب اور جہالت کے رعب میں کیوں کر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں، اس زمانے میں سرسید کی مثال ایک روشن ضمیر مدبر کی سی ہے، جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے، جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو (ارمغانِ آزاد، صفحہ ۲۱۳، مرتب و مؤلف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، مطبوعہ: ادارہ تحقیقاتِ وتحریکاتِ ملی، پاکستان، سنہ اشاعت: 1990 عیسوی)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، اپنے ساتھ دوسرے کے اختلاف کرنے والے کے ساتھ کھلے ذہن اور وسعتِ ظرفی کے مالک تھے، جس کا اندازہ ان کے ایک مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے۔

www.idaraghufran.org

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب، اپنے مورخہ 7، اپریل 1940 عیسوی کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

عزیزی

خط پہنچا، اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے میرے خط کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ایک چیز عقائد و مسائل کا اختلاف ہے، ایک شخصی دیانت وعدمِ دیانت کا معاملہ، آپ یقیناً ایک شخص سے عقائد و مسائل میں سخت اختلاف رکھتے ہوئے بھی اخلاص ومحبت رکھ سکتے ہیں، اور یہ اخلاص اس سے مانع نہیں ہوسکتا کہ اس کے عقائد و مسائل پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں، امام بخاری نے عبدالرزاق کی نسبت کہا تھا ''لو ارتدّ عبدالرزاق '' اگرچہ عبدالرزاق مرتد بھی ہوجائے، جب بھی میں اس کی دیانت میں شک نہیں کروں گا، لیکن اگر آپ کے سامنے ایسی باتیں آئی ہیں کہ آپ کو اس کی دیانت پر اعتماد نہیں رہا، اور اختلاف صرف عقائد و مسائل ہی سے نہیں ہے، بلکہ شخصی اخلاق وخصائل سے ہے، تو اس صورت میں آپ اس سے اخلاص ومحبت نہیں رکھ سکتے، کیونکہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی، جس کے لیے اخلاص اُبھر سکے، جس شخص کے اخلاص وخصائل پر آپ کو اعتماد نہیں رہا، آپ بغیر مداہنت ونفاق کے کیونکر اس سے اخلاص ومحبت رکھ سکتے ہیں؟ (نقشِ آزاد، ص ۱۷۹، مکتوب نمبر ۹۳، مرتبہ: غلام رسول مہر، ناشر: کتاب منزل، لاہور)

البتہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے مذکورہ مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ نظر وفکر کے اختلاف اور باہمی اخلاص ومحبت کے جمع ہونے کے قائل تھے، جو اِن کی وُسعتِ ظرفی کی دلیل ہے، جس کا آج کل اکثر لوگوں میں فقدان پایا جاتا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے متعلق نظر وفکر کا اختلاف کرنے، نہ کرنے والے حضرات کے لیے، ان کا مذکورہ مکتوب اپنے طرزِ عمل میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے رہنما سبق کی

حیثیت رکھتا ہے۔

تاہم اس میں اتنا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر دوسرے سے عقائد میں اختلاف، اسلام اور کفر کی حد تک پہنچ جائے، تو پھر دوسرے سے قلبی محبت ولگاؤ کا تعلق رکھنا روا نہیں ہوگا۔

جس کی مدلل توضیح بندہ محمد رضوان نے اپنی کتاب ''سیاست وحکومت'' کے باب نمبر 7 میں ذکر کردی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے متعلق جو مذکورہ بحث ذکر کی گئی، اس کی وجہ پہلے ذکر کی جا چکی ہے، ورنہ اس کتاب کے موضوع سے اس کا تعلق نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے افکار پر نقد وجرح کی مزید تفصیل ہم نے اپنے دوسرے مضمون میں ذکر کردی ہے۔

## ذاتی اختلاف کے بجائے، علمی ودینی اختلاف

''ماہنامہ الجمعیۃ'' کے درج بالا مضمون میں فاضل ناقد نے مولانا تھانوی اور مولانا سندھی صاحب کے فکری اختلاف کو اتفاق سے تبدیل کرانے کی کوششوں کے بعد آخری کوشش کے طور پر خود یہ اعتراف کیا ہے:

> ''حضرت حکیم الامت بڑے آدمی تھے انھوں نے حضرت سندھی سے اختلاف کیا ہوگا تو علمی اختلاف ہوگا، ان کی ذات سے کبھی اختلاف نہیں کیا''۔

حضرت حکیم الامت تھانوی ہی بڑے آدمی نہیں تھے، بلکہ حضرت مدنی اور مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات سے دیگر کئی اختلاف کرنے والے اہلِ علم ومشائخ حضرات سب ہی دراصل بڑے آدمی تھے، اوران حضرات کی بڑائی کسی کے اعتراف کرنے پر موقوف نہیں۔

اور ہمارا اس سلسلے میں یہی گمان ویقین ہے کہ حضرت تھانوی اور دیگر اہلِ دیوبند اہلِ علم واہلِ دین اور اہلِ فکر حضرات نے مولانا سندھی صاحب، بلکہ سرسید احمد خان صاحب سے جو اختلاف کیا، وہ نفسانیت اوران کے ساتھ ذاتی وشخصی اختلاف پر مبنی نہیں تھا، بلکہ علمی ودینی

اختلاف تھا۔

اسی وجہ سے حضرت تھانوی نے مولانا سندھی اور سرسید احمد خان صاحبان کی قابلِ مدح چیزوں کا اعتراف فرمایا، لیکن جن چیزوں سے دینی وعلمی نکتۂ نظر سے اختلاف ہوا، ان کا بھی اظہار فرمایا۔

اسی طرح حضرت مدنی کا مضمون بھی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ان کا مولانا سندھی صاحب سے اختلاف ذاتی ونفسانی نوعیت کا نہیں تھا، بلکہ دینی وعلمی نوعیت کا تھا، اسی لیے حضرت مدنی نے بھرپور طریقے پر ایک طرف تو مولانا سندھی صاحب کی خدمات واوصاف کا اعتراف فرمایا، اور دوسری طرف آخری عمر میں دماغی انقلاب واختلال کو علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہونے کی صراحت فرمائی، اوراس کے بعد فرمایا:

''بنابریں تمام اہلِ فہم وارباب قلم وعلم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں، جب تک کہ اس کو اصول اور مسلماتِ اسلامیہ، ضروریاتِ دین اور عقائد واعمالِ اہل سنت والجماعت کے زرّیں قواعد وتالیف پر پرکھ نہ لیں، اور علیٰ ھٰذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف واکابرِ دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں۔ جب تک کہ وہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضراتِ اکابر جملہ عقائد واعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں، یا اُصول سے، سلفِ صالحین اوران کے اصول وقوانینِ مسلمہ اہلِ سنت والجماعت ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے ہیں''۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۹۸ و ۹۹، طباعتِ دوم :جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

www.idaraghufran.org

فاضل ناقد کا مولانا سندھی ور مولانا تھانوی صاحبان کے اختلاف کو ذکر کرنے والوں پر اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا الزام عائد کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

اسی بات کی صراحت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بھی فرمائی ہے۔ [1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی مولانا سندھی صاحب کی خدمات کا اعتراف تھا، ان کی ذات سے اختلاف نہیں تھا، لیکن اسی کے ساتھ ان کی نسبت سے جو افکار و خیالات منظرِ عام پر آئے، ان سے اتفاق نہیں تھا۔

اور مولانا احمد علی لاہوری صاحب کا بھی مولانا سندھی صاحب سے اختلاف اسی دین کی خاطر تھا۔

جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اس کی وضاحت فرمائی ہے، اور اس کا ذکر فصل نمبر 4 میں ''مولانا لاہوری کا مولانا سندھی سے اختلاف'' کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ [2]

---

[1] فرماتے ہیں:

''قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہو جاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں، بلکہ دین کا ہے، پھر گو وہ خود اس دنیائے دَنی سے رخصت ہو گئے، مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لئے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے، تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی، اور اس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے اندر بڑا جوش تھا''۔

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۱۹ و ۲۲۰، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

[2] چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا (احمد علی لاہوری) اگرچہ اپنے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی کو اپنا سب سے بڑا محسن و مربی سمجھتے تھے، اور اپنے کو ان کا ساختہ و پرداختہ جانتے تھے، ان سے اخذ کیے ہوئے طرزِ تفسیر کو انھوں نے پورے طور پر اپنا لیا تھا، اور اس کی اشاعت و تعلیم کو وہ اپنے فرائضِ زندگی میں سمجھتے تھے، لیکن ان کا یہ سارا تعلق دین کے تابع تھا، اور وہ اپنی اس نیازمندی، وفاداری میں عقیدہ اہلِ سنت اور مسلکِ سلف سے بال برابر ہٹنا بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری صاحب فقہی واجتہادی امور میں اتنی وسعت رکھتے تھے کہ جماعت اہلِ حدیث اور اس جماعت کے علماء اور صلحاء سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور وہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب سے بھی غیر معمولی عقیدت وتعلق رکھتے تھے، لیکن ان کا مولانا عبیداللہ سندھی صاحب سے یہ تعلق دین کے تابع تھا، اسی لیے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے آخری دور کے ان افکار وخیالات میں متابعت نہیں فرمائی، اور ان سے اختلاف کا صاف اظہار فرمادیا، جو مولانا لاہوری کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار ومسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ اہلِ دیوبند میں سے ابتدائی زمانہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے جو مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے غلط افکار کی تردید پر سب سے زیادہ تفصیلی مضمون لکھا، وہ بھی مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف کے بجائے، دینی وعلمی اختلاف کی بنیاد پر لکھا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب، دیوبند کے مشاہیر فضلا میں سے تھے، تحصیلِ علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے آرگن رسالہ ''القاسم'' کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کیے گئے، اور عرصۂ دراز تک قلمی خدمات سے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

چنانچہ جب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے بعض اپنے خیالات وافکار کا اظہار فرمایا جو مولانا کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار ومسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور ان میں مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت، انفعالیت اور جذباتیت، طویل مسافرت اور زندگی کی ناکامیوں اور ہمت شکن تجربوں کا اصل دخل تھا، اور ان سے مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تو مولانا نے ان کے خیالات میں متابعت نہیں فرمائی، بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کردیا، جس سے مولانا سندھی کو رنج بھی ہوا، اور شکایت بھی پیدا ہوئی، اس لیے کہ وہ مولانا سے اس کی بالکل توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن مولانا احمد علی صاحب نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی''۔ (''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۱۳۷، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

www.idaraghufran.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت وحکمت تحریر وتعبیر اور استدلال ہی میں تھی، عقائد ونصوص اور حدودِ دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلّب ومتشدّد اور ویسے ہی غیور وحساس واقع ہوئے تھے، جیسے ان کے اساتذہ و شیوخِ کرام اور علمائے حق۔

جب کبھی وہ تحریفِ دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے، تو برداشت نہ کر سکتے۔

مولانا سندھی مرحوم ہندوستان واپس آئے تو ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا جن میں توازن کی بڑی کمی تھی، اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہوسکتے تھے۔ ان کے کسی مضمون میں قرآن وحدیث وفقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و''تحقیقات'' تھے، جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے، یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی۔ مولانا (مناظر احسن گیلانی) نے مدرسی وجماعتی عصبیت سے بالکل بے نیاز وبالاتر ہوکر اس مقالے کی تردید میں ایک پرزور مقالہ لکھا۔ بعض اہلِ علم معاصرین مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت کی بنا پر ان کو اس شدید مخالفت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی طرف سے کچھ صفائی پیش کی اور اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر ان کے ساتھ نرمی اور حسنِ ظن کی تلقین کی۔ مولانا (گیلانی) نے اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت کی اور مولانا سندھی مرحوم سے اظہارِ اختلاف اور ان کے افکار وآرا کی کھلی ہوئی تنقید وتردید کو دین کی حمایت کا تقاضا سمجھا۔

مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے دینی جذبہ اور تصلّب فی الدین کا اندازہ کیا

جاسکتا ہے:

''میرا مقصود ہی اس سے ع ''ہدی را تیز ترمی خواں چو ذوق نغمہ کم یابی'' تھا، یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہو، لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا، تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ کوئی ہو'' **ولو أن فاطمة بنت محمد أعاذها الله تعالیٰ سرقت لقطعت یدها** '' ہمارے دین کا امتیازی نشان ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرنے سے پہلے العیاذ باللہ میں بھی اس کا قائل ہو جاؤں گا کہ ابوحنیفہ کی فقہ عجمیوں کے قانون سے متاثر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سرزمینِ عرب کے ایک خاص تاریخی دور کی اصلاح کی حد تک محدود ہے، قرآنی قوانین کی حیثیت صرف مثالی باتوں کی ہے، بخاری و مسلم، انجیل و توراۃ جیسی محرف کتابوں کے ہم وزن ہیں، العیاذ باللہ، کیا میں اپنی خودی کے اعتماد کو خدا اعتمادی سمجھنے لگوں۔

قبل اس کے کہ میرے اندر خدانخواستہ اس قسم کے خیالات کی صداقت واضح ہو، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے''۔

(یکم نومبر 1945ء)

اس اقتباس سے جو اپنی حمیت اور حفاظتِ دین کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے، اندازہ ہوسکتا ہے کہ عقائد و نصوص اور دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں۔ (''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۷۳ تا ۷۵، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

مذکورہ تبصرہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کی طرف سے

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے ساتھ اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟ اور انھوں نے مولانا سندھی صاحب کی نسبت سے منظرِ عام پر آنے والے غلط افکار ونظریات کے اوپر، تردید، حمیتِ دینی اور حفاظتِ دین کی خاطر کی تھی، اوران کا یہ طرزِ عمل، دینی جذبہ اور تصلب فی الدین پر مبنی تھا۔

لیکن افسوس کہ آج ایک طبقہ ان خدامِ دین ومحافظِ دین کی ہستیوں کو ہی کارہائے نمایاں انجام دینے پر متّہم کرنے بیٹھ گیا ہے۔

اس بات کا اعتراف مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص، پروفیسر محمد سرور صاحب نے بھی کیا ہے کہ اختلاف کرنے والے اہلِ دیوبند حضرات نے شخصی احترام کو ملحوظ رکھا، جو ان اہلِ دیوبند کا خصوصی امتیاز ہے۔ [1]

جناب ماہر القادری صاحب ''مولانا عبید اللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' مؤلفہ پروفیسر محمد سرور پر تبصرہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا سندھی کے افکار کیا تھے؟ اس پر ہماری تنقید آگے آرہی ہے، مگر اُن کی نیک نیتی اور اخلاص میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ ملتِ اسلامیہ کے وہ خیر خواہ تھے، اور دنیا میں اسلام کا غلبہ چاہتے تھے۔ لیکن اخلاص ونیک نیتی اور اصابت رائے لازم وملزوم نہیں ہیں''۔ (ماہنامہ ''فاران'' کراچی، صفحہ 38، اکتوبر 1974ء)

اس قسم کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ جمہور مشائخ و اکابرِ دیوبند اور و دیگر اہلِ علم وفکر حضرات کو مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف نہیں تھا، جیسا کہ سرسید احمد خان

---

[1] وہ لکھتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اوران کا پوری طرح شخصی احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اوراذیتیں اٹھا اٹھا کران کا دماغ چل گیا ہے۔ (افادات وملفوظات، صفحہ ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعات میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

www.idaraghufran.org

صاحب سے بھی ذاتی اختلاف نہیں تھا، ان حضرات کے نزدیک مولانا سندھی اور سرسید احمد صاحبان کے ساتھ یہ اختلاف، دینی وعلمی نوعیت کا تھا، اسی وجہ سے انھوں نے مولانا سندھی اور سرسید احمد خان صاحبان کے اوصاف وخدمات کا اعتراف بھی فرمایا، اوران کے متنازع و شاذ افکار وخیالات کی بنیاد پر اختلاف کا اظہار بھی کیا، اور ضرورت پڑنے پر دلائل سے ان کی تردید بھی کی۔

ان تمام تصریحات کے باوجود اگر کوئی بلا دلیل اس اختلاف کو ذاتی نوعیت کا قرار دینے، یا اس کا الزام دینے کے درپے رہے، تو اس کا کیا علاج ہے۔

اگر یکسوئی، توجہ اور اعتدال کے ساتھ مذکورہ حضرات کے حالات اور اختلافات کو ملاحظہ کیا جائے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

اور اس کے باوجود بھی اگر کسی صاحب کو اختلاف باقی رہے، تو وہ اپنے موقف کے ذمہ دار ہیں، اور ہم اپنے موقف کے، ہمارا اس سلسلے میں مولانا سندھی صاحب یا فاضل ناقد وغیرہ سے بحمد اللہ تعالیٰ کوئی ذاتی ونفسانی اختلاف نہیں۔

Idara Ghufran

## (فصل نمبر 6)

# مولانا مسعود عالم ندوی کے اختلاف سے متعلق الزام

فاضل ناقد اپنے مضمون ''جماعتِ دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' میں لکھتے ہیں:

راولپنڈی والے مفتی صاحب نے جناب مسعود علی ندوی کا مضمون بھی اپنی مطلب برآری کے لیے مولانا سندھی کی مخالفت میں "دلیل کبریٰ" کے طور پر لگایا ہے۔

یہ دیکھا نہیں کہ یہ شخص کون ہے؟

اور ان کا اپنے مکتوب میں اس سے انکار کہ میں جماعت اسلامی کے کہنے پر یہ کام نہیں کر رہا، یہ گلے پڑ گیا ہے، اور بہ قول ان کے، اس کا حساب یوم محشر میں ہوگا۔

مسعود علی ندوی کیسے اکابر میں سے ہو سکتے ہیں؟ انتہائی مختصر طور پر عرض کروں۔

یہ شخص خانقاہ تھانہ بھون کے حاضر باش تھے، مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع تحریر فرماتے ہیں:

16 جمادی الاولیٰ 1361ھ کو احقر (مفتی محمد شفیع) حاضر آستانہ عالی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون ہوا تو مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی من جملہ اور بہت سے حضرات کے وہاں مقیم تھے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳، ص ۸۲)

خانقاہ تھانہ بھون کے حاضر باش ہونے کے باوجود حضرت حکیم الامت کے مسلک و مشرب سے رنگین نہ تھے حضرت حکیم الامت مودودی صاحب کی فکر و نظر کو امت کے لیے فتنہ سمجھتے تھے، لیکن مسعود علی ندوی، مودودی صاحب کے عقائد و نظریات کے مؤید اور جماعت اسلامی کا قیمتی سرمایہ تھے۔

مکتبہ ظفر گجرات نے مسعود عالم ندوی، سوانح اور مکاتیب شائع کی تھی اس کا ایک اشتہار کتاب "حاجی امداد اللہ مہاجر مکی" مکتبہ ظفر گجرات میں میرے سامنے ہے، اس کے صفحہ

۸۵ پر درج ہے:

"محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان (مسعود عالم ندوی) کی وفات پر لکھا تھا:

اس کے سوا کیا لکھوں کہ اس کے بعد سے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ شاید جسم کے بازو ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے سے محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے اور اپنے دین کے لیے ویسا ہی کوئی خادم پیدا کرے، بہ ظاہر تو یہ جگہ پر ہونی مشکل ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے "۔

حوالہ میں نے دے دیا، راولپنڈی والے مفتی صاحب کی کتاب کی اشاعت پر جس جس بڑے چھوٹے نے خوشی کا اظہار کیا ہے، جس کا چرچا صاحبِ کتاب بھی فرما رہے ہیں وہ جواب دیں کہ مسعود علی ندوی اکابر تو کیا، بزرگوں میں بھی شامل ہونے کے قابل ہیں؟

دوسرا حوالہ بھی ملاحظہ فرمایے، یقیناً یہ ایک نیا انکشاف ہوگا۔ سنیے اور سر دھنیے:

علامہ سید سلیمان ندوی کے برادر نسبتی جناب سید محمد سلیم مرحوم نے ایک طویل خط امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھا تھا جب وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس خط کے بعض اقتباسات میری دلیل کی پختگی کے لیے ملاحظہ فرمایے:

۱۔ "دارالمصنفین میں حضرت سید (سلیمان ندوی) صاحب 34 سال رہے، انھوں نے بڑے بڑے علمی کام کیے، لیکن میں (سید محمد سلیم) ان کے علمی کام کو کچھ بھی نہیں سمجھتا ان کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا مسعود علی ندوی کی تمام سختیاں برداشت کر کے ان سے نباہا جو اس وقت دارالمصنفین کو اپنی ذاتی ملکیت بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سید صاحب کو جس طرح ستایا بلکہ خود سرمایہ دار بن کر اور ان کو محض ایک علمی مزدور بنا کر کس کس طرح سے کچلا وہ ایک خونچکاں داستان ہے "۔

۲۔ "سید صاحب مولانا مسعود علی سے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ پہلے تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رقم (جو سید صاحب کی دارالمصنفین کی طرف نکلتی تھی) وہ قبول نہ کریں لیکن مولوی مسعود علی نے ان کے ساتھ یہ فریب کیا کہ ان کا وظیفہ بجٹ میں دکھاتے رہے کہ ان کو دیا جا رہا ہے لیکن جب سید صاحب نے بجٹ کے مطابق مطالبہ کیا تو انھوں (مسعود علی) نے یہ کہہ کر دینے

سے انکار کیا کہ وہ تو لینے سے انکار کر چکے ہیں۔ "

۳۔ "دارالمصنفین میں مولوی مسعود علی کے کام کی نوعیت بھی ملاحظہ فرمائیں۔ آٹھ بجے صبح دفتر تشریف لاتے ہیں، دس بجے تک انتہائی عابد وزاہد کی طرح نمازیں پڑھتے ہیں۔ دس بجے ان کا دربار لگتا ہے اس میں یا تو شہر کی سیاست زیر بحث ہوتی ہے یا پھر دارالمصنفین کے رفقا کو آپس میں لڑانے کی اسکیم تیار ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو لڑانے میں بڑے ماہر ہیں، شہر کے مختلف خاندانوں کو ایک عرصے تک لڑاتے رہے۔ سید ریاست علی ندوی صاحب جب تک دارالمصنفین میں رہے شاہ معین الدین صاحب سے مولوی مسعود علی کے اشارے پر برسرپے کار رہے..... "

.....خود سید صاحب کے گھر میں مولوی مسعود علی کسی نہ کسی طرح آپس میں کوئی فتنہ کھڑا کرادیتے۔ کبھی سید صاحب کی پہلی اہلیہ اور دوسری اہلیہ کی اولاد میں جنگ کرادیتے۔ کبھی مجھ میں اور ہمشیرہ میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کرتے کبھی سید صاحب کے دونوں دامادوں میں تصادم کرادیتے۔ غرض انھی باتوں میں ان کا سارا وقت گزرتا۔ "

۴۔ "مولوی مسعود علی کا مقولہ ہے کہ میں اخلاص کا قائل نہیں ہوں، میں ہر شخص سے تجارتی تعلقات رکھتا ہوں میری مطلب برآری میں جو مفید ہوتا ہے، اس سے میں بہ ظاہر مخلصانہ ملتا ہوں۔ اور اگر مفید نہیں ہوتا تو اس سے نظریں نیچی کر کے آگے بڑھ جاتا ہوں۔ "

۵۔ "۱۹۵۰ء کے مئی میں سید صاحب بھوپال سے دارالمصنفین تشریف لے گئے۔ بھوپال کے انقطاع تعلق کے بعد وہ دارالمصنفین واپس آنا چاہتے تھے، لیکن آپ شاید یقین کرنے میں تأمل فرمائیں اور مولوی مسعود علی بھی اس سے انکار کردیں کہ اس قیام دارالمصنفین میں مولوی مسعود علی نے سید صاحب سے اصرار کیا کہ وہ اپنے قلم سے انھیں دارالمصنفین کے ناظم بنادیں۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ دارالمصنفین کے ضوابط میں ہے کہ اس کا ناظم صاحب علم ہوگا۔ مولوی مسعود علی نے اسی وقت اٹھا کر دیا کہ آپ اس قانون کو کاٹ کر لکھ دیں کہ تجربے کار اور دارالمصنفین کا ہم درد بھی ناظم ہوسکتا ہے لیکن سید صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ "

آپ نے یہ اقتباسات دیکھے۔ ایسا شخص جو لڑانے کا ماہر ہو، اس نے حضرت سندھی کے معاملے پر علمائے دیوبند کو لڑا دیا یہ ایک حقیقت ہے۔ تلافی کی صورت بھی انھی کے ہاتھ میں ہے جو حضرت سندھی پر آوازیں کستے ہیں۔ اب بھی آنکھیں کھول لینی چاہئیں ورنہ حضرت شیخ الہند اور حضرت نانوتوی کے واسطے سے امام شاہ ولی اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ ہاں! کوئی واقعی علمی اختلاف ہو تو اسے علمی اختلاف کے طور پر کرنا چاہیے، علمی اختلاف سے علم میں اضافہ ہوتا ہے، یہ علمی اختلاف آپ مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی کر سکتے ہیں اور مولانا حسین احمد مدنی سے بھی، مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی کر سکتے ہیں امام ابوحنیفہ تک سے بھی۔ بقول حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی اس علمی اختلاف سے جس سے اختلاف کیا جا رہا ہے اس کی شان گھٹتی نہیں ہے، بلکہ بڑھتی ہے۔

## مولانا سندھی صاحب سے اختلاف کی بنا مسلکی اختلاف نہیں

فاضل ناقد کے مذکورہ بالا خیالات کو ملاحظہ کرنے کے بعد اس موقع پر سب سے پہلے تو مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کے مکتوب کے درجِ ذیل جملوں کو ملاحظہ کر لینا چاہیے:

''وہی دیوبندی یہی نہیں کہ مولانا سندھی کے ان عقائد و خیالات کو سُن کر تردید سے خاموشی اختیار کرتے ہیں، بلکہ کسی کو اگر تردید کی ہمت ہوتی ہے، تو ان کی گروہی حمیت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے۔ اور ہر طرف شور برپا ہو جاتا ہے کہ دیوبند کے ایک عالمِ جلیل کی توہین کی گئی۔ اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس غریب پر دھاوا بول دیا جاتا ہے۔ بے چارے مولوی مسعود عالم جنھوں نے (مولانا سندھی کے افکار کی تردید میں تفصیلی مضمون لکھا تھا) پر ندوی ہونے کا جرم عائد کر کے ان کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن جب ان ہی دیوبندیوں میں سے ایک دیوبندی نے یہ دیکھ کر کہ جن کے بڑوں پر چھوٹی باتوں میں شیطان اخرس بننے کا خوف مستولی رہتا تھا، آج اتنی بڑی بات پر جب وہ چُپ ہیں، تو ان

میں سے جو سب سے چھوٹا ہے، وہی جماعت کے اس فرضِ کفایہ کو ادا کر کے گونگے شیطان کے الزام کا تو ازالہ کر دے، تو اب اس کو تنگ نظری اور دقیانوسیت سے متّہم کیا جا رہا ہے''۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص۱۶۰،۱۶۱)

فاضل ناقد کو اگر مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون سے ان کے دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے، تو مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب پر بھی نظر کر لینا چاہیے کہ کیا وہ بھی دیوبندی مکتبِ فکر سے نہیں؟ اور انھوں نے اپنے درج بالا مکتوب میں جو شکایت کی ہے اور دیوبندیت کے ماضی وحال کا جو محاکمہ کیا ہے، اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

پھر ایک طرف تو فاضل ناقد مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون کو دلیلِ کبریٰ کے طور پر شامل کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی خانقاہ تھانہ بھون کا حاضر باش بھی قرار دیتے ہیں، ساتھ ہی اس جواب کا بھی مطالبہ فرماتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب اکابر تو کیا بزرگوں میں بھی شامل ہونے کے قابل ہیں؟ اور پھر کوئی واقعی علمی اختلاف ہو، تو اسے علمی اختلاف کے طور پر ذکر کرنے کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فاضل ناقد نے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے برادرِ نسبتی سید محمد سلیم صاحب کے خط کے حوالے سے جو مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے ساتھ اختلاف کا ذکر کیا، اور اس کو نیا انکشاف قرار دے کر سر دھننے کی دعوت دی ہے، انھوں نے اس خط کا مستند حوالہ پیش نہیں فرمایا، تاکہ اس کے سیاق وسباق سے **مالہٗ و ما علیہ** کا جائزہ لیا جاتا۔

دوسرے اگر کسی کا دوسرے سے ذاتی اختلاف ہو، تو اس سے دینی اختلاف کا ہونا لازم نہیں

آتا، جب کہ یہاں بحث ذاتی اختلاف کے بجائے، دینی اختلاف سے ہے، جس کی طرف خود فاضل ناقد بھی دوسروں کو متوجہ فرماتے ہیں، لیکن اس کے برعکس وہ ذاتی اختلاف کو درمیان میں لاکر خود اپنے اس دعوے کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

تیسرے فاضل ناقد کو اس موقع پر ''مولانا مسعود عالم ندوی'' اور ''مسعود علی ندوی'' صاحبان کے مابین اشتباہ ہوگیا ہے، جو شاید خود ان کے لیے نیا انکشاف ہوگا، اور دوسروں کے بجائے، خود اپنا سر دھننے بلکہ پیٹنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ ع

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے ساتھ دارالمصنفین میں کام کرنے اور مولانا اشرف علی تھانوی سے تعلق رکھنے اور تھانہ بھون حاضر باش رہنے والے ان صاحب کا نام ''مولانا مسعود علی ندوی'' ہے، جن کا ذکر ''مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب'' نے ''پرانے چراغ'' کے حصہ دوم میں کیا ہے۔ ان کی ولادت 1889ء کی ہے، ندوہ کے قدیم فضلاء میں سے ہیں، اور یہ دارالمصنفین کے ابتدائی پانچ اراکین میں سے تھے، ان کی وفات قیامِ پاکستان کے بعد اعظم گڑھ ہندوستان میں ہوئی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب ''مولانا مسعود علی ندوی صاحب'' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ان کی عملی صلاحیتوں اور ترکتازیوں کی بنا پر ماجد میاں ان کو ''غازی مسعود'' کہتے، اس نام کا لطف وہی لے گا، جو اودھ کے حضرت سید سالار مسعود غازی کے مقام اور کام سے واقف ہو، مولانا نے تحریکِ خلافت میں قائدانہ حصہ لیا تھا، وہ مولانا محمد علی، شوکت علی کے معتمدِ خاص اور تحریکِ خلافت کے بڑے متحرک وفعال اور سرگرم کارکنوں میں تھے.....
>
> جب دارالمصنفین کے ادارے کا قیام عمل میں آیا، تو اس کی نظامت بلا اختلاف ان ہی کے سپرد ہوئی، اور انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کو بہت جلد

منظّم و مستحکم ادارہ بنادیا.....

یکم شعبان 1385ہجری (26نومبر 1965ء) کو بزمِ شبلی کی یہ شمع بھی آخری طور پر بجھ کر رہ گئی، اور وہ مولانا شبلی کے مرقد سے چندگز کے فاصلے ہی پر آسودۂ خاک ہوئے، رحمہ اللہ وغفرلہٗ'' (''پرانے چراغ'' حصہ دوم، ص۹۰ و۱۰۰، مکتبۃ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431ہجری، 2010ء)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی وفات کے بعد ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں اُن کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا، جس کا ''پاجا سراغِ زندگی'' (مؤلفہ: مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب) میں درجِ ذیل الفاظ میں ذکر ہے:

ندوہ کے سپوت، شبلی کے شاگردِ رشید، تھانوی کے حلقہ بگوش مولانا مسعود علی ندوی کے انتقال کی خبر سے ندوہ کی متحرک فضا پر آج ایک غم ناک سکوت طاری ہوگیا۔ اساتذہ وطلباء سارا کام روک کر دارالعلوم کی اس وسیع وپُرشکوہ مسجد میں جمع ہوئے، جس کی تعمیر کا سہرا مولانائے مرحوم کی اَن تھک کوششوں کے سر ہے۔

ساڑھے نَو بجے تلاوتِ کلام پاک سے جلسۂ تعزیت کا آغاز ہوا، سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اُستاذ تفسیر مولانا محمّد ادریس ندوی نے اپنے تاثرات کا اِظہار کیا، اس کے بعد مولانا علی میاں نے مَرحوم کو اِن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

مولانا مسعود علی ندوی کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے لیے ایک سعادت ہے۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں اس مسجد کی ایک ایک اینٹ اور اس کے گارے چونے کا ایک ایک ذرّہ ان کے لیے دعائے خیر کرتا ہوگا۔ یہاں ہر نماز پڑھنے والے اور ہر تلاوت کرنے والے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کے لیے اپنی حق شناسی اور شکرگزاری کا کچھ نہ کچھ حصہ ادا کرے۔ ان پر ایک عہد کا خاتمہ ہے جس کی آج

پوری طرح تصویر کشی بھی نہیں کی جاسکتی، حق ناشناسی اور سیاسی اغراض نے اس تصویر کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے، وہ پہلا اور آخری دور تھا جس میں مسلمان دراصل ہندوستان میں بے تاج بادشاہی کر رہے تھے۔

مولانا مسعود علی ندوی ان فقیران بے نوا میں سے تھے جن کی سلطنت کے نقوش اس ملک کے قلب وجگر پر ثبت ہیں۔ وہ تحریک خلافت کے رکن رکین تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی، حاضر دماغی، نکتہ رسی اور ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ جس مجلس میں ہوتے (خواہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی دیو پیکر شخصیت کی مجلس کیوں نہ ہوتی) اس میں بلبل کی طرح چہکتے اور شمع انجمن کی طرح چمکتے رہتے۔ (پا جا سراغ زندگی، ص ۷۵، مطبوعہ: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی)

یہ تفصیل تو مولانا مسعود علی ندوی صاحب کے متعلق تھی، جب کہ مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے دوسری شخصیت ''مولانا مسعود عالم ندوی صاحب'' کا ذکر ''پرانے چراغ'' کے حصہ اول میں کیا ہے، ان کی ولادت 1328 ہجری ۱۳۲۸ھ، اور 1910ء ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے 1947ء میں قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان ہجرت فرمائی، اور رجب 1373 ہجری، مارچ 1954ء کو کراچی میں وفات پائی۔ (ملاحظہ ہو: ''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۳۱۷، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

پس فاضل ناقد کا بلا تحقیق اس طرح کی بے سروپا متضاد باتیں کرنا، اور کسی کا الزام کسی پر رکھنا، اور کسی کے ذاتی اختلاف کی بنا پر اس کی دینی رائے اور مقام کو مجروح قرار دینا مبنی بر انصاف نہیں۔

اس کے بعد عرض ہے کہ معلوم نہیں، فاضل ناقد نے ہماری کس عبارت سے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون کو دلیلِ کبریٰ اور یہ سمجھ لیا کہ ہمیں یا مولانا مسعود عالم ندوی صاحب یا متعدد اہلِ علم یا اکابر اہلِ دیوبند کو مولانا سندھی صاحب سے علمی و دینی اختلاف کے بجائے ذاتی اختلاف ہے۔

ہمارے نزدیک ان تمام اکابر واصحابِ علم حضرات کے مضامین بشمول حضرت تھانوی اور حضرت مدنی کے اس سلسلے میں مجموعی طور پر دلیلِ کبریٰ کی حیثیت رکھتے ہیں، اوران حضرات کا مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف نہیں، اور مولانا مناظر احسن گیلانی ہوں، یا سید سلیمان ندوی، یا مولانا مسعود عالم ندوی، وہ سب حضرات مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف کے بجائے ان کے آخری دور کے متعدد افکار سے اختلاف پر متفق ہیں۔

فاضل ناقد نے حکیم الامت اور مولانا سندھی صاحب کے اختلاف کے ذیل میں خود ہی ''ماہنامہ الجمعیۃ'' کے مضمون میں اس کا درج ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

> ''حضرت حکیم الامت بڑے آدمی تھے انھوں نے حضرت سندھی سے اختلاف کیا ہوگا تو علمی اختلاف ہوگا، ان کی ذات سے کبھی اختلاف نہیں کیا''۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا رسالہ ''التقصیر فی التفسیر'' جو ہماری کتاب میں بھی شاملِ اشاعت ہے، اس کا واضح ثبوت ہے۔

اسی طرح معلوم نہیں کہ فاضل ناقد نے خود سے ہماری کون سی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا شمار اکابرِ دیوبند کے حلقہ میں ہوتا ہے، انھیں ہماری کتاب سے اس کا حوالہ ذکر کرنا چاہیے تھا۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا شمار تو درحقیقت ''ندوۃ العلماء'' کے فضلاء، وعلماء میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر انھیں ''ندوۃ العلماء'' کے فضلاء، وعلماء میں شمار کیا جائے، اور خود ندوۃ العلماء کے حضرات اس کا اعتراف واظہار کریں، تو اس پر فاضل ناقد کو اعتراض کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟

ضرورت اس بات کی تھی کہ فاضل ناقد مولانا سندھی صاحب سے حضرت مدنی، حضرت تھانوی، حضرت لاہوری اور دیگر مشائخِ دیوبند اور خود مولانا مسعود عالم ندوی صاحبان کے ذاتی اختلاف کو ثابت کرتے، جن حضرات کے مضامین کے جواب میں وہ مذکورہ اور اس جیسی گفتگو فرمارہے ہیں۔

اسی طرح فاضل ناقد، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے متعلق اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے

کے بجائے ان کے مضمون کے حقائق کی طرف توجہ فرماتے، اور اس بات کی طرف بھی توجہ فرماتے کہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا مضمون، خود مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی تائید وتصدیق کے ساتھ شائع ہوا تھا، اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی تردید میں یہ مضمون مسلکِ دیوبند کو ہدف بنا کر اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی ذات سے اختلاف کی بنیاد پر بھی نہیں لکھا تھا، بلکہ مولانا سندھی صاحب کی طرف سے سامنے آنے والے غلط افکار کے پیشِ نظر لکھا تھا۔

علاوہ ازیں ہماری کتاب میں بڑے بڑے اصحابِ علم، مشائخِ دیوبند یا اکابرِ دیوبند کے کئی مضامین بھی شامل ہیں، جن میں حضرت تھانوی اور حضرت مدنی بھی داخل ہیں، ان کو نظر انداز کر کے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب پر مبہم یا غیر موثر جرح پر تکیہ وسہارا حاصل کرنے سے اصل مقصود میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ کہ جرح میں ملتے جلتے نام سے مغالطہ کھا کر کسی اور کی ذاتیات اِن مرحوم کے سر لا کر منڈھ دی جائیں، تو یہ کس حد تک انصاف ہے؟

## مولانا مسعود عالم ندوی کا اختلاف اور شخصی احترام

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضامین کا سلسلہ ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' کے نام سے جو کتابی شکل میں شائع ہوا، اس کی تقریب میں خود مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے 25 رمضان المبارک 1363 ہجری کو درج ذیل مضمون تحریر کیا، جس کو ملاحظہ کر کے ان کی مولانا سندھی صاحب سے متعلق اختلاف کی نوعیت کو احسن طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر کتاب میں راقم (مسعود عالم) کے دو مضمون شائع ہو رہے ہیں، جو اس نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ومغفور کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی

تحریک'' اور پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار و تعلیمات'' پر تنقید اور استدراک کے طور پر لکھے تھے، پہلا مقالہ مولانا کی زندگی میں شائع ہوا۔ (معارف، فروری، مئی 43ء) اور ان کی نظر سے گزر چکا تھا، اس سلسلے میں انھوں نے ناقد کو مسلسل پانچ خط بھی لکھے، جس میں انھوں نے اپنے افکار کی مزید توضیح کی تھی، وہ خطوط بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں، تاکہ مولانا کے افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو، نیز اسی ''استدارک'' کے سلسلے میں مولانا نے بسترِ علالت سے (وفات سے تقریباً دو ہفتے پیش تر) بھی ایک خط اپنے پرائیویٹ سیکرٹری (پرسنل اسسٹنٹ) سے لکھوا کر بھجوا دیا تھا، وہ بھی ان ''خطوط'' کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے، ان خطوط کے علاوہ مولانا نے برہان دہلی (مئی 43ء) میں بھی اپنے افکار کی مزید تشریح اور استدراک، کے بعض شبہات کی تصحیح کی تھی، برہان کے اس مضمون اور ان کے تمام خطوط میں تقریباً ایک ہی خیال کا اعادہ کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون جون (44ء) میں لکھ کر معارف کو بھیجا جا چکا تھا، مگر اتفاق یہ کہ وہ جولائی یا اگست میں نہ چھپ سکا، اور اسی دوران میں مولانا سندھی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

خبر سنتے ہی دل بیٹھ گیا، اور افکار و عقائد کے انتہائی اختلاف کے باوجود یہ صدمہ صبر آزما ثابت ہوا۔

اللہ ان کا مقام بلند کرے، اور ان کی خدمات کے عوض، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ایسے بالغ نظر، اَن تھک کام کرنے والے اور وسیع القلب انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

www.idaraghufran.org

یوں تو ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' پر استدراک، کے چھپتے ہی کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا تقاضا شروع ہوگیا تھا، مگر کاغذ کی کم یابی اور دوسری مشکلات کے باعث یہ تقاضا اب سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا، خیال تھا کہ اشاعت کے وقت بعض مضامین کا اضافہ ہوسکے گا، نیز ''برہان'' میں مولانا کی بعض جدید توضیحوں کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جاسکے گا، مگر اب (جب) کہ مولانا ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، دل ودماغ مزید کاوش کے لیے تیار نہیں، یہ مقالے بھی احساسِ فرض سے مجبور ہوکر شائع کیے جارہے ہیں، اور حاشا و کلّا !! ان سے مولانا کی تردید نہیں، بلکہ ان کے افکار وخیالات کی تنقید وتنقیح مقصود ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ ہم مولانا کے ''نئے افکار'' سے متفق نہیں، اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ ان کے ''جدید نظریے'' کتاب وسنت کے صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، اس لیے ہم ان نظریوں کی تنقید وتنقیح پر مجبور ہیں، خواہ اس میں جذباتِ محبت وعقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو؟ کہ حق کی تائید، تعلقات ومحبت کی پاس داری پر مقدم ہے۔

فالحق اولی من ولیک حرمة  واحق منک بنصرة و کفاح (شرقی) ''

(مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر، صفحہ ۱۴ و ۱۵، مطبوعہ: دارالدعوۃ السلفیۃ، لاہور، تاریخِ اشاعت: صفر 1406 ہجری، نومبر 1985 عیسوی)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے خود تصریح کردی ہے:

''حاشا و کلّا !! ان سے مولانا کی تردید نہیں، بلکہ ان کے افکار وخیالات کی تنقید وتنقیح مقصود ہے''۔

اس کے علاوہ دوسرے جملے بھی درج بالا عبارت میں قابلِ توجہ ہیں۔

اس قسم کے حلفیہ کلمات ہم جیسے دل کے حال سے ناواقف لوگوں کے یقین کے لیے بڑی

www.idaraghufran.org

اہمیت رکھتے ہیں، اگرچہ فاضل ناقد کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی مذکورہ عبارت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یہ مضامین کس مقصد کے لیے لکھے، آیا مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ذاتی ومسلکی اختلاف کی بنا پر یا ان کے متنازع افکار کی تردید کی بنا پر، اور مولانا سندھی صاحب کا شخصی احترام ان کے ہاں کس درجے تھا؟ اس سب کچھ کے بعد وہی ''مرغے کی ایک ٹانگ'' ہانکے جانا کیا معنیٰ اور کیا وزن رکھتا ہے؟

اس سے زیادہ حقیقت کی گہرائی کا حساب تو آخرت میں ہونا ہے، اور ہر شخص کو اپنے قول وفعل کی حقیقت کا سامنا کرنا ہے، اس کا ہی انتظار کرنا باقی رہ جاتا ہے۔

## مولانا سید سلیمان ندوی کے تاثرات

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون پر مولانا سید سلیمان ندوی نے جو تفصیلی ''مقدمہ'' تحریر فرمایا، اس کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ فرماتے جایے، فرماتے ہیں:

> ''افسوس ہے کہ مولانا سندھی جیسا عالم متبحر یورپین انقلابات اور جدید سیاسی افکار میں الجھ کر حجاز سے ترکستان کی راہ چل پڑا۔ ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے خیالات کی بھی وفات ہوجاتی، مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات کی ترتیب وتہذیب واشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کرلیا ہے۔
>
> ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کیے گئے، اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب واشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا، یہاں تک کہ ان کے پہلے رسالے میں شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تک کے پورے سلسلے کو آج کل کے لینن اور ٹراٹسکی اور اسٹالن کی شکل میں پیش کیا گیا، اور ان خدا پرستوں کو دنیا پرست سیاسی پارٹیوں کے طریقِ دعوت کا نمائندہ بنایا گیا، اور یورپ کے سیاسی پارٹیوں کے اصول کو پیش کر کے اپنی مخالف پارٹی کے علماء کے قتل کی تحسین کی گئی۔ انا للہ!

یہ سب کچھ اس ہندوستان میں ہوا، جہاں بحمد اللہ علمائے دین اور مجاہدینِ حق کی کمی نہیں۔ مگر پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی۔ انھوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پرزور مضامین لکھے، اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی۔ اور اب ان کے یہ متفرق نمبر ایک مستقل رسالے کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناقدِ مجیب کے اس رسالے کو قبول اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ نصیب فرمائے۔ والسلام۔ سلیمان ندوی''

(مقدمہ ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر'' تالیف مولانا مسعود عالم ندوی، از صفحہ ۱۹ تا ۲۹، دار الدعوۃ السّلفیہ، شیش محل روڈ لاہور، تاریخِ اشاعت، صفر، ۱۴۰۶ھ، نومبر ۱۹۸۵ء)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے خود ہی مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضامین کو پوری متانت، سنجیدگی اور تحقیق پر مبنی قرار دیا ہے۔

جبکہ فاضل ناقد نے بے خبری سے مولانا مسعود عالم ندوی کو لڑانے کا ماہر ہونے سے متّہم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن درج بالا اقتباس سے ظاہر ہو گیا کہ سید سلیمان ندوی صاحب کو مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے اس مضمون سے اختلاف نہیں تھا، اتفاق تھا، بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے تو اس کا شکوہ کیا ہے کہ ایسے باطل اور مغالطہ آمیز افکار کی اشاعت پر ایک مسعود عالم صاحب نے ہی تعاقب کیا، حالانکہ یہ اوروں کی بھی ذمہ داری تھی، پھر کسی دوسری چیز میں ان دونوں حضرات کے مابین اختلاف سے اصل مدعا پر کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ فاضل ناقد نے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے جس شخصیت کے اختلاف کا ذکر کیا ہے، وہ مولانا مسعود علی ندوی صاحب ہیں، اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب ان کے علاوہ الگ وجدا شخصیت ہیں، جس سے بے خبر ہونے کی وجہ سے موصوف نے کسی کا غصہ کسی پر اتارا۔

علاوہ ازیں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے ساتھ خوشگوار تعلقات اور روابط وابستہ تھے، اور آپس میں مکاتبت کا سلسلہ بھی تسلسل کے ساتھ قائم تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے اپنے نام ان مکاتیب کو مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے ''مکاتیبِ سید سلیمان ندوی'' کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا ہے، جن کو پہلی مرتبہ 1954 عیسوی میں ''مکتبہ چراغِ راہ، لاہور'' نے شائع کیا تھا۔

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''راقم نے (مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے) دریافت کیا تھا کہ کیا مولانا سندھی کی وفات کے بعد سرور صاحب کی کتاب پر تبصرہ بے موقع تو نہ ہوگا؟

(جس کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے تحریر فرمایا)

عزیزم مکرم! السلام علیکم

خط ملا۔

مولانا سندھی کی وفات کے سبب سے میں بھی پس وپیش میں تھا، مگر ظاہر ہے کہ ہم ان کی ذات کی نہیں، بلکہ ان کے خیالات کی تردید کر رہے ہیں''۔ (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 158، مکتوب نمبر: 97، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

اس مکتوب سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحبان کا مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف نہ تھا، بلکہ ان کے مخصوص خیالات وافکار سے اختلاف تھا، اور ان ہی کی تردید میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے، مولانا سید سلیمان

ندوی صاحب کی مشاورت سے یہ تنقیدی مضمون لکھا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اپنے ایک اور مکتوب میں جو انھوں نے یکم اپریل 1945ء کو لکھا، تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ''قدیم حلقہ'' جو آج سے پہلے دین کی حفاظت کا ذمہ دار تھا، تجدّد کے سیلاب میں بہہ جانے کو آمادہ ہے، ''مولانا سندھی'' اور ان کے معاصرین و مادحین و متاثرین کا رنگ کھلتا جاتا ہے۔

کچھ لوگ ابھی قدامت عہد پر باقی ہیں، مثلاً مجلس علمی ڈابھیل کے ارکان۔

مولانا مناظر صاحب نے بھی آپ سے زیادہ سخت تنقید لکھ کر ''برہان'' کو بھیجی تھی، مگر غیر موثر رہی، اصل تحریر میں نے حیدرآباد ہی میں مولف کے ایما سے پڑھی تھی، سنا ہے کہ ''منشور دہلی'' میں وہ چھپ بھی گئی ہے''۔ (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 179، مکتوب نمبر: 106، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی)

اپنے ایک مکتوب میں ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' سے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو تحریر فرمایا کہ:

عزیز مکرم۔ دعاہائے خیر۔ السلام علیکم ورحمۃ۔

دونوں کارڈ ملے۔

آپ کے پُر اثر خط نے مجھے متاثر کیا، مجھے پہلی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ آپ کے قلب میں تأثر کی استعداد ہے، یہ معمولی چیز نہیں ہے، بہت اہم ہے، جس قلب سے یہ صلاحیت جاتی رہتی ہے، اسی کی نسبت ہے ''بل طبع اللہ علیٰ قلوبھم'' اور ''ختم اللہ علیٰ قلوبھم'' کیونکہ آئندہ کی ترقی بلکہ ساری ترقی اسی تخمِ صالح کے نشوونما کا نتیجہ ہے۔

عزیز من! عقل یہیں رہ جاتی ہے، وہ ساتھ نہیں جاتی ہے، جو چیز ساتھ جاتی ہے وہ

صرف علمِ صحیح اور عملِ صحیح ہے۔

آپ نے اپنی علالت اور ضعف پر جس بناء پر تحسُّر ظاہر کیا ہے، یہ دوسری دولت آپ کے پاس ہے۔ تحسُّر کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کو اس کے نہ ملنے یا اب تک نہ پاسکنے کا دلی افسوس ہے، اور یہی دلی افسوس، توبہ وانابت کا دروازہ ہے ''واتبع سبیل من أناب'' کی دعوت ہر ایک کے لیے عام ہے۔

آپ کے اس دوسرے خط نے مجھے بہت باامید بنا دیا، میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وہابیوں کی خشکی آپ پر ایسی غالب آگئی ہے کہ عشق ومحبت کی گنجائش آپ کے دل میں نہیں رہی، الحمدللہ کہ میری یہ غلطی آپ کی نسبت آج جاتی رہی۔

میرا ایک پرانا شعر ہے:۔

اظہار کر کے عشق ومحبت کے راز کو　　پھر سے بنا دیا مجھے امیدوار آج

(مکاتبت سلیمان، ص ۱۸۰، انتخاب وترتیب، محمد زید مظاہری ندوی، استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، ناشر ۔ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگا، ہردوئی روڈ، لکھنو، سن اشاعت: ۱۴۲۹ھ)

یہ مکتوب ''مکاتیبِ سید سلیمان ندوی'' صفحہ 149 (مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی) میں بھی موجود ہے۔

اور یکم اپریل 1945 عیسوی میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت دے، میں تو اپنے کو عمر کی اخیر منزل میں سمجھتا ہوں، ساٹھ سے جو اوپر ہوا ہے، اس کی عمر کا پیالہ لبریز ہی سمجھئے، اگر کوئی تسکین کا سرمایہ ہے، تو آپ جیسے چند محبّین کا وجود ہے۔

سید سلیمان، یکم اپریل، 1945 عیسوی۔

(مکاتبت سلیمان، ص ۱۷۷، انتخاب وترتیب، محمد زید مظاہری ندوی، استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، ناشر۔

www.idaraghufran.org

ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگّا، ہردوئی روڈ، لکھنو، سن اشاعت: ۱۴۲۹ھ)

یہ مکتوب ''مکاتیبِ سید سلیمان ندوی'' صفحہ 177 (مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول مئی 1954 عیسوی) میں بھی موجود ہے۔

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ہمارے علمائے دیوبند میں سے مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر میں بھی بکثرت تفردات ہیں، اور جس زمانے میں وہ باہر سے آکر دہلی میں مقیم تھے، اور بعض فضلائے دیوبند نے بھی ان کے تفردات کی تائید کردی تھی، تو محترم مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے راقم الحروف کو لکھا تھا ''بڑے درد کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ دیوبند کدھر جارہا ہے؟'' یعنی جس جماعت کا بڑا طرۂ امتیاز احقاقِ حق تھا، اس کے افراد ایسی مداہنت کا شکار کیوں ہوئے؟ (ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ ۱۹۱ ''علامہ فراہی، شیخ محمد عبدہٗ ومولانا آزاد وغیرہ پر نقد''، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ربیع الاول 1431ھ)

## مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات

اس کے علاوہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی کتاب اور مضمون پر جو رَد لکھا تھا، اس میں برّصغیر کی ایک اور علمی شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی منشا اور مشورہ کا بھی دخل تھا، جن کی نظر اور علمی حیثیت یقیناً فاضل ناقد سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔

چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اسی عرصے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی

تحریک'' نکلی، اس کتاب میں بعض ایسے ''نئے حقائق وانکشافات'' تاریخی رنگ میں پیش کیے گئے تھے، جو ہم سب لوگوں کے لیے موجبِ حیرت بھی تھے، اور باعثِ تکلیف بھی، اس کتاب میں سید صاحب کی بے تکلف تحریک و تنظیم کو ''ایک خیالی اسٹیٹ'' کے رنگ میں پیش کیا گیا تھا، جس کے سید صاحب محض ''فوجی افسر اور آلہ کار'' تھے، اور حضرت شاہ اسحاق صاحب جن کو مولانا الصدر الحمید کے نام سے یاد کرتے ہیں، صدر ریاست اور نگرانِ اعلیٰ۔

نیز اس میں اہلِ مغرب یا مرکزی بورڈ (حضرات دہلی) اور اہلِ مشرق (اہلِ صادق پور) کے درمیان ایسی رقابت دکھائی گئی تھی، جو کبھی سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان میں تھی، اور اسی رقابت اور اہلِ صادق پور کی خودرائی کو تحریک کی ناکامی کا سبب گردانا گیا تھا۔ [1]

اس بارے میں خود سید صاحب کے متعلق فاضل مصنف کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں کہ گویا وہ بھی دہلی کے مرکز کے مشوروں اور ہدایتوں کے پابند نہ رہے، اور اس سے نقصان پہنچا۔

یہ محض ایک خیالی ریاست کا نقشہ تھا، جس میں تاریخی تحقیق سے زیادہ مولانا کی ذہانت، قوتِ تخیلی اور تنظیمی دماغ کام کر رہا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، اور بالخصوص اس جماعت کی بڑی حق تلفی ہوئی، جو ہندوستان کی سب سے بڑی مجاہد

---

[1] مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تالیف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی تیسری جلد میں تفصیل کے ساتھ دہلی اور صادق پور کے دو مراکز پر روشنی ڈالی ہے، اور اس اختلاف کو تقسیمِ کار کی نوعیت کا قرار دے کر باعثِ رحمت بتلایا ہے، اور مرکز صادق پور (وہابی تحریک) کے رہنماؤں اور سرگرمیوں ونتائج کی تعریف وتوصیف کی ہے، جس سے مولانا سندھی صاحب کے مندرجہ بالا موقف کی تردید اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے اس اصولی موقف کی تائید ہوتی ہے۔
محمد رضوان

www.idaraghufran.org

اور سرفروش جماعت اور سید صاحب کے حقیقی جانشین اور فدائی تھے۔

میں نے مسعود صاحب کو اس کتاب کی طرف توجہ دلائی، اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس کا جواب لکھیں، اس کا جواب دیتے ہوئے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جی ہاں مولانا سندھی کا رسالہ ایک ہفتہ ہوا میں نے دیکھا، اور مطالعے کے دوران یہ ارادہ کرتا جاتا تھا، اب ارادہ ہوتا ہے کہ اسے لکھ ڈالوں، ان شاء اللہ مفصل اور طویل مضمون ہوگا، جی چاہتا ہے کہ یہ نوٹ آپ کے پاس بھیج دوں، اور آپ اسے دیکھ کر فوراً واپس کر دیں، مگر شرط یہ ہے کہ جلد''۔

22 صفر 1362 ہجری کے خط میں میری کوتاہ قلمی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہاں تو میں آپ سے بے حد خفا تھا، خط پر خط لکھے مگر جواب ندارد، آخر یہ کہاں کی مولویت ہے، آپ نے تو مجھے مولانا سندھی سے بھڑا دیا اور خود الگ جا بیٹھے۔

خیر خاکسار نے اس سلسلے کے دو مضمون لکھ لیے، پہلا مضمون فروری کے معارف میں چھپ گیا، اس میں صرف، سید صاحب (اور مودودی صاحب کی زبان میں) سید مظلوم کی مدافعت کی گئی ہے، ضمنی طور پر ان کے ثنا خوانوں اور منقبت نگاروں کی بھی مدافعت ہوگئی ہے۔

پہلا مضمون صرف سید صاحب کے متعلق ہے، معارف کے 35 صفحوں میں آیا ہے۔

دوسرا اس کا جواب ضرور لکھوں گا، صرف تامل اس بات سے تھا کہ کہیں اہلِ دیوبند اس تنقید کو ''مدرسہ'' اور دبستان کے اختلاف پر محمول نہ کریں، بہر حال لکھنا ضرور ہے، آج کل میں فارغ بھی ہوں، آپ آجائیں تو مشورہ کر کے لکھ ہی ڈالوں''۔

(''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۳۰۴ و ۳۰۵، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

www.idaraghufran.org

مذکورہ عبارت میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے اپنے مکتوب میں اپنے جس تامل کا اظہار کیا تھا کہ:

''کہیں اہل دیوبند اس تنقید کو ''مدرسہ'' اور دبستان کے اختلاف پر محمول نہ کریں''

فاضل ناقد نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب پر اسی نوعیت کی تنقید فرما کر، کوئی پون صدی بعد ان کے خدشے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں مولانا سندھی صاحب کے متعلق اسی قسم کا شکوہ درج ذیل الفاظ میں تحریر کیا تھا:

''تحزّب، و تعصّب للتحزّب'' مدارس کی طرح جماعات کا بھی پسندیدہ نہیں۔

''بغضک للشئ یعمی و یصم و کذلک حبک للشئ یعمی ویصم'' (مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، صفحہ 185)

چند صفحات کے بعد اسی مکتوب میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

آپ نے سچ کہا کہ مولانا شبلی کی پیش گوئی کہ آخر دیوبند بھی کب تک دیوبند رہے گا، برہان والوں کے مضامین نے اسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کے ان ہی خیالات کی اس تشریح کو اگر سرسید اور شبلی کا قلم بیان کرے، تو بے دینی، اور اگر فضلائے دیوبند لکھیں، تو عین دین۔ ع

بسوخت عقل از حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

(مکاتیب سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ، صفحہ ۱۸۷، مکتوب نمبر 108، مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول: مئی 1954 عیسوی)

اگر کسی کو مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی بعض باتوں سے اختلاف ہوسکتا ہے، جیسا کہ فاضل ناقد نے ذکر کیا ہے، تو ان کی بعض صفات سے اتفاق بھی ہوسکتا ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ

نے بعض اعلیٰ صفات سے نوازا تھا، جو خال خال حضرات میں ہی ہوتی ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مسعود صاحب نے ایک دینی ماحول، اور علماء کے ایک حلقے میں زندگی کا وہ حصہ گزارا تھا، جو اثر قبول کرنے کا زمانہ ہوتا ہے، علماء میں سے ان کو اپنے محبوب و استاذ و مربی مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے بعد ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ سے گہری محبت و عقیدت تھی، اداروں اور دبستانوں میں ندوۃ العلماء کے ساتھ ان کی حمایت، حمیت کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی، وہ متقشف نہ تھے، لیکن دینی شعائر و اتباع سنت کی ان کے دل میں بڑی اہمیت اور عظمت، اور اس کی پابندی اور اہتمام کرنے والوں کی محبت و وقعت تھی، اس لیے جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے اور سال ہا سال اس کی ترجمانی کرنے کے باوجود ان کا دینی فکر اور ذہنی سانچہ کلیتاً تبدیل نہیں ہوا تھا، وہ جماعت کے ارکان کا دینی معیار، اتباعِ سنت کا اہتمام اور عبادت کا ذوق اس سے زیادہ بلند دیکھنا چاہتے تھے، جتنا عام طور پر نظر آتا تھا، ان کے ذہن نے کام کرنا اور ان کے قلب نے محسوس کرنا ترک نہیں کیا تھا، جن دوستوں نے ان سے ان کی زندگی کے آخری دور میں ملاقات کی، اور جن سے وہ اپنے ان احساسات کا اظہار کر سکتے تھے، انھوں نے بیان کیا کہ وہ تنہائی کی گفتگو میں اپنے دل کی اس خلش کو چھپا نہیں سکے، اور ان سے انھوں نے اپنے ان دینی جذبات کا اظہار کیا، جن سے ان کی قدر و عظمت، اور خلوص و وفا شعاری میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا ہے۔ (''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص۳۱۱، مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ لکھنؤ، بارِ ششم، 1431ہجری، 2010ء)

www.idaraghufran.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی وفات سے متعلق مزید لکھتے ہیں:

علمی وادبی ودینی حیثیت سے یہ ایک بڑا خسارا تھا، بلاشبہ ایک بڑا صاحبِ قلم اور اس برصغیر ہندوپاکستان کا سب سے بڑا عربی کا انشا پرداز اٹھ گیا، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن میرے لیے یہ حادثہ ذاتی نوعیت کا ہے، میرا تئیس برس کا مخلص رفیق، چاہنے والا دوست، شفقت کرنے والا بھائی میری کامیابی سے خوش ہونے والا، لغزشوں پر متنبہ کرنے والا ساتھی، دنیا سے اٹھ گیا، زمانہ جس رخ پر جارہا ہے، اور جس خودغرضی اور مادیت کا دور دورہ ہے، اس کے پیشِ نظر اس کی بہت کم امید ہے کہ ایسے سچے دوست، باوفا رفیق اور مخلص ساتھی پیدا ہوں گے۔

اگر ہماری قوم بیدار ہوتی، اور اس میں جوہر شناسی اور فراخ حوصلگی کا مادہ ہوتا، تو ان کی ذات سے بڑا نفع اٹھایا جاسکتا تھا، ان سے نصاب کی ترتیب میں مدد لی جاسکتی تھی، ان سے عربی مدارس، عربیت وانشا کے بارے میں استفادہ کرسکتے تھے، طلباء اور علومِ عربیہ کے شائقین اطراف واکناف سے ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے آتے، لیکن افسوس ہے کہ ان سے ان کے شایانِ شان فائدہ نہ اٹھایا گیا، اور ایک محدود حلقے کے سوا بہت کم لوگوں نے ان کو پہچانا، اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی عمر چوالیس سال سے زیادہ نہیں ہوئی، اس عمر میں انھوں نے بڑے بڑے کام کیے، اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں، جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحبِ علم وصاحبِ قلم بنانے کے لیے کافی ہیں (''پرانے چراغ'' حصہ اول، ص ۳۱۷ و ۳۱۸، مکتبۃ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، بارِ ششم، 1431 ہجری، 2010ء)

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب (شیخ الحدیث، جامعہ عربیہ امدادیہ، مرادآباد، وخلیفہ مجاز: حضرت مولانا

شاہ حکیم محمد اختر صاحب) تحریر فرماتے ہیں:

مولانا مسعود عالم ندوی سے مولانا (سید ابوالحسن علی ندوی صاحب) کا ربط 1929 عیسوی میں دورانِ تعلیم شروع ہوا، ان کے عربی ذوق کا اس وقت ندوۃ العلماء میں شہرہ تھا، عربی رسائل وجرائد کا مطالعہ کرنے کے لیے مولانا کئی بار ان کی قیام گاہ گئے، اس طرح یہ تعلق بڑھتا گیا، پھر ندوۃ العلماء میں تدریس کے زمانہ میں بھی ان دونوں رفقا کا اجتماع رہا۔

1932 عیسوی میں عربی پرچہ ''الضیاء'' نکلنا شروع ہوا، تو دونوں نے مل کر اس کے معیار کو بلند تر اور مقبول بنانے کی ساتھ ساتھ کوشش کی۔

1937 عیسوی میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوۃ العلماء سے علاحدہ ہوئے، مگر ربط برابر باقی رہا، اور بہت سی باتوں میں وہ مولانا کے ہم خیال بھی رہے۔

1941 عیسوی میں مولانا مودودی لکھنو آئے اور مولانا علی میاں کے سامنے ایک عربی رسالے کی تجویز رکھی اور ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی، مولانا نے بلاتکلف مولانا مسعود عالم صاحب کا نام لے کر انھیں اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا، چناں چہ خط وکتابت کے ذریعہ سے مولانا نے انھیں یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرلیا، پرچہ تو جاری نہ ہوسکا، لیکن 1942 عیسوی میں مولانا مسعود عالم صاحب جماعت اسلامی کی عربی نشر واشاعت کے شعبے کے ذمہ دار بن کر جالندھر گئے، اور ''دار العروبة للدعوة الإسلامية'' قائم کیا۔ جماعت اسلامی کے تئیں وہ شروع سے مخلص تھے اور جماعت کے استحکام وترقی میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔

بعض نظریات میں اختلاف اور فکر ومسلک میں کچھ تفاوت کے باوجود، مولانا مسعود عالم صاحب کا تعلق مولانا سے بڑا گہرا رہا اور محبت میں کبھی کمی نہ آئی،

جماعت اسلامی کی مجلسوں میں جب بھی ذکر آیا، انھوں نے مولانا سے اور علامہ سید سلیمان ندوی سے محبت وقربت کا ایسی جرأت وصفائی کے ساتھ بلند الفاظ میں اظہار کیا، جس سے دوسروں کو حیرت واستعجاب بھی ہوا۔

1953 عیسوی میں مولانا مسعود عالم صاحب اسیرِ زنداں ہوئے، چار ماہ کے بعد رہا ہوئے، تو مولانا علی میاں نے مسرت وتہنیت کا ایک خط لکھا، جس کا مولانا مسعود عالم صاحب نے بڑا اچھا جواب دیا، لکھا:

آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گزرے، محبت واخلاص کے نقوش اور گہرے ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرے، مجھ فقیر کے لئے یہ بس ہے کہ ایک پاک باز نوجوان سید کے دامن الفت سے وابستہ رہے (پرانے چراغ، ج۱، ص۳۵۳، ۳۵۴)

مولانا مسعود عالم ندوی کا یہ امتیاز تھا کہ وہ لادینی رجحان اور دین وعقیدہ کی گمراہی کو کبھی برداشت نہیں کر سکے۔ (مفکر اسلام، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص۱۴۸، و۱۴۹۔ طبع اول: جولائی 2004 عیسوی)

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب (شیخ الحدیث، جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد، وخلیفہ مجاز: حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب) مزید تحریر فرماتے ہیں:

جنوری 1941ء میں مولانا مودودی لکھنؤ تشریف لائے، ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام ہوا، لکھنؤ کے لوگوں میں وہ سب سے زیادہ مانوس مولانا علی میاں ہی سے تھے، اس موقع پر مولانا علی میاں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی شگفتگی، اخلاق اور مقصد کی لگن اور تڑپ سے بے حد متأثر ہوئے۔

اس دوران جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آچکا تھا، مولانا علی میاں اپنے رفیقِ قدیم مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ جماعت میں شامل اور مولانا مودودی کے ہم

خیال ہو گئے تھے۔

1942ء مولانا مودودی پھر لکھنؤ آئے، اور مولانا علی میاں کی خواہش پر انھوں نے جمعیۃ الاصلاح طلبہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اپنا مقالہ نیا تعلیمی نظام کے عنوان سے پڑھا، اور مولانا ہی کی سفارش پر انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں نوعِ انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل کے عنوان سے وقیع مقالہ پیش کیا، لکھنؤ میں مولانا مودودی کا پروانہ وار استقبال ہوا۔

فروری 1942ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا، مولانا علی میاں، اس میں شریک ہوئے، اس وقت مولانا مودودی کے بعض افکار ونظریات کی مخالفت ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم فاضل افراد کر رہے تھے، اس لئے یہ تجویز بھی آئی کہ مولانا مودودی فی الحال جماعت کی امارت سے سبک دوش ہو جائیں، اور مولانا امین احسن اصلاحی کو امیر مقرر کر دیا جائے، اس موقع پر مولانا علی میاں کی تائید مولانا مودودی کے حق میں تھی، مولانا علی میاں کا یہ خیال تھا کہ اس مصنوعی ردوبدل کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جماعت کا وجود، مولانا مودودی ہی کی کوششوں اور تحریروں کا رہین منت ہے، اس کا انتساب بدستور انھیں کی طرف رہے گا، اس رائے کے مطابق فیصلہ ہوا، اور مولانا مودودی ہی امیر جماعت رہے۔

اکتوبر 1942ء میں جماعت کی مجلس انتظامیہ کا دوسرا اجلاس دہلی میں ہوا، مولانا علی میاں، اس میں شریک رہے، اس کے بعد مولانا مودودی کے ہمراہ علی گڑھ میں ایک دو دن قیام رہا، اور یونیورسٹی میں مولانا مودودی کی مقبولیت اور محبوبیت کا اندازہ ہوا، اس دوران مولانا مودودی جماعت کا ایک عربی آرگن نکالنا چاہتے تھے، مولانا علی میاں نے یہ رائے دی کہ پرچہ کے اجراء سے پہلے کا کام یہ ہے کہ

عربی میں مضامین کا ترجمہ کر کے انھیں عالم عربی کے موقر جرائد میں طبع کرالیا جائے، مولانا مودودی نے یہ ذمہ داری مولانا علی میاں ہی کو سپرد کرنا چاہی، لیکن انھوں نے مولانا مسعود عالم ندوی کو اس کام کے لئے موزوں بتایا، چناں چہ انھیں کا انتخاب ہوا، اور پہلے جالندھر میں پھر مغربی پنجاب میں ''دار العروبة'' قائم ہوا اور یہ کام شروع کر دیا گیا، مولانا مسعود عالم ندوی نے جماعت کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے جماعت کو عالمِ عربی میں متعارف کرانے کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔

مولانا علی میاں تقریباً تین سال تک لکھنؤ کی جماعت کے امیر رہے۔

اس دوران انھیں تین چیزوں کا شدت سے احساس ہوا۔

ایک تو یہ کہ مولانا مودودی کے سلسلے میں جماعت کے معتقدین و منتسبین بڑے غلو ومبالغہ سے کام لے رہے ہیں، جس کا نتیجہ دوسرے داعیوں اور مفکرین سے بیزاری اور بیگانگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، جو بہت ہی خطرناک ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ تنقید میں بہت بے باک ہو گئے ہیں اور علمائے کرام اور دیگر دینی حلقوں پر طعن و تشنیع کا مزاج رکھتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ان میں کوئی دینی تڑپ، اصلاح کا نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں اضافہ کی کوشش سنجیدگی سے نہیں ہو رہی ہے۔

یہ وہ اسباب تھے جو مولانا کے لئے مولانا مودودی کی تحریروں سے متأثر ہونے اور انجذاب کے احساس کے ساتھ افسردگی اور تکلیف کا سبب بنے، اور یہ احساس ہوا کہ کام عملی حدود تک نہیں پہنچ پا رہا ہے۔

چناں چہ جماعت سے تعلق میں فرق آنا شروع ہوا، دوسری طرف 1940ء کے بعد ہی سے مولانا کا ربط شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی تحریک دعوت

سے بڑھا، یہ رجحان بڑھتا گیا اور مولانا کے دل کو وہاں تسلی ملی، اس ذہنی کشمکش کی اطلاع مولانا نے خود ہی مولانا مودودی کو دی، جس کے جواب میں مولانا مودودی نے انھیں یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ 1943ء میں مولانا علی میاں جماعت سے علاحدہ ہو گئے اور جماعت تبلیغ سے منسلک ہو کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے، علاحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا اور پھر بھی مولانا مودودی اور جماعت کے افراد خصوصاً اپنے رفیق مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سے مولانا علی میاں کے روابط آخر تک بڑے اچھے رہے، اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مارچ 1944ء میں مولانا علی میاں، پٹھان کوٹ میں دارالاسلام میں مولانا مودودی کے مہمان بھی رہے، مولانا مودودی نے غایت محبت و تعلق کا معاملہ کیا، اسٹیشن پر آ کر رخصت کیا، مولانا کے رسالہ ''دعوتان متنافستان'' کو بے حد پسند کیا اور سراہا۔

یہ صرف رائے اور نظریہ کا اختلاف تھا، جو کبھی نفرت و عداوت اور ذاتی بغض و عناد کی سرحد سے نہیں مل سکا (مفکر اسلام، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۰۷۔ طبع اول: جولائی 2004 عیسوی)

بعض نظریاتی اختلافات اور فکر و مسلک میں تفاوت کے باوجود، مولانا علی میاں ندوی صاحب کا، سید ابوالاعلی مودودی، اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحبان کے ساتھ تعلق میں بگاڑ اور ذاتی بغض و عناد پیدا نہ ہوا، اور محسوس ہونے والے دینی و علمی اختلاف کی وجہ سے ان کی اچھی صفات اور ان سے حسن سلوک کی نفی بھی نہیں کی، یہی عدل و انصاف ہے، جس میں ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھا جاتا ہے۔

لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم من أحب لله، وأبغض لله. وأعطى لله، ومنع لله، فقد استكمل الإيمان.

www.idaraghufran.org

# مولانا عبدالماجد ندوی کے تاثرات

مولانا عبدالماجد ندوی صاحب ''المتوفیٰ: 1405 ہجری، 1985 عیسوی'' (ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا، صاحب ''معلم الانشاء'') مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

آہ! کہ ندوہ کا ایک لائق ترین فرزند، دعوت اسلامی کا مردِ مجاہد، ملک وملت کا درد مند، دین کا داعی، اسلام کا سپاہی، دینی غیرت واسلامی حمیت کا پیکر، اردو اور عربی کا ایک بلند پایا انشا پرداز و باکمال صحافی، اخلاص وعمل کا نمونہ، سنتِ رسول کا شیدائی مسعود عالم ندوی 16 مارچ کی شب کو یکا یک ہم سے جدا ہو گیا۔

مولانا مسعود عالم ندوی کو ندوۃ العلماء کے مثالی تخیل کا نمونہ کہا جا سکتا ہے، اور فی الواقع وہ تھے بھی، مولانا مسعود عالم جدید وقدیم کی جامعیت کی نمائندگی کرتے تھے، اور ندوہ کے فقہی مسلکِ اعتدال کی بھی! وہ مسلکاً سلفی العقیدہ تھے، مگر گروہی اہلِ حدیث نہ تھے، وہ ہر قسم کی گروہی عصبیتوں سے پاک تھے، ان کا فقہی مذہب حضرت شاہ ولی اللہ کا ''مسلکِ اعتدال'' تھا۔

قدرت کی طرف سے بڑا اچھا دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، روشن فکر، دردمند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا، ذہن وذکاوت کے ساتھ قوتِ حافظہ بھی بہت قوی تھی۔

27 سال سے وہ ضیق النفس کے مریض تھے، اس لیے قدرتی طور پر بہت زیادہ کم زور اور نحیف تھے، مگر اس نحیف وناتواں جسم میں وہ ایک چیتے کا جگر اور شیر کی طرح مضبوط دل رکھتے تھے۔

تری الرجل النحیف و تزدریه
وفی اثوابه اسد مزید

ٹھوس اور تحقیقی مطالعے ان کا سرمایہ علم تھا، تاریخ پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے، اور ملکی سیاسیات سے نہ صرف یہ کہ باخبر تھے، بلکہ اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے تھے، سیاسی اور غیر سیاسی تحریکات کے پس منظر سے واقف تھے، ادب عربی کا بہت اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، لغت وقواعد پر ان کی گہری نظر تھی، اس کی باریکیوں کے مبصر تھے۔

الفاظ کی تحقیق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، عربی کے وہ بلند پایہ اور فطری انشا پرداز تھے، قلم برداشتہ تحریر کا ان کو عجیب ملکہ تھا، تحریر میں برجستگی، سلاست اور روانی ہوتی، جچے تلے الفاظ، چست ترکیبیں، اچھوتے استعارات، نادر تشبیہیں مولانا کی تحریر کی خاص خصوصیت تھی، تحریر حشو وزوائد سے پاک ہوتی، موقع موقع سے محاورات وامثال بھی استعمال کرتے، مگر اس میں کوئی تکلف نہ ہوتا، پڑھنے والا محسوس کرتا کہ جیسے جگہ جگہ موتی جڑ دیے گئے ہیں۔

دینی غیرت وحمیت کی مولانا ایک زندہ مثال تھے، حق کے معاملے میں کسی قسم کی معمولی مداہنت کو بھی وہ جائز نہیں سمجھتے تھے، حق گوئی وبے باکی ان کی امتیازی صفت تھی، لگی لپٹی بات کرنے کے عادی نہ تھے، ہمیشہ کھری اور دوٹوک بات کہتے، جس بات کو حق سمجھتے، اس کو پوری قوت اور زور کے ساتھ پیش کرتے، اور اسی شدت کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے، اور جس بات کو وہ غلط سمجھتے، برملا اس کو غلط کہتے، اس معاملے میں کسی عزیز اور دوست کی بھی رعایت نہ کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب کو مداہنت فی الدین سے پاک بنایا تھا، یہ ان کی سیرت وکردار کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، تملق کی باتوں سے انھیں سخت نفرت تھی، وہ اپنی مدح وستائش سننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ (مولانا مسعود عالم ندوی، حیات اور کارنامے، ص ۱۲۱و۱۲۲، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، طبع اول، جولائی 1998)

# مولانا ریاست علی ندوی کے تاثرات

مولانا ریاست علی ندوی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون پر ''ماہنامہ معارف، کے جنوری 1945ء'' کے شمارہ میں نقد وتبصرہ تحریر کیا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی نے جب ابتداً اپنے خیالات ظاہر کیے، تو ان کے دیرینہ عقیدت مند حلقوں میں ان کے مفہوم ومعانی پر شک وشبہ کی نظر ڈالی گئی۔ الفرقان کے ''ولی اللہ نمبر'' میں مدیر الفرقان نے ان کی عبارتوں کے مختلف مفہوموں کے اعتبار سے ایسے پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہا، جو مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہوں، اور دبی زبان سے ان کے مخالف پہلوؤں کے مطالب سے اختلاف کر کے ان کی تردید کی۔ لیکن مولانا سندھی اپنے افکار کی اشاعت کے لیے ایک مستقل مجلس کی تاسیس عمل میں لا چکے تھے، چنانچہ وہ مستقل تصنیفات کی شکل میں بڑی آب وتاب سے شائع کیے گئے، اور ملک کے سنجیدہ حلقوں میں ان کی مستقل تردید کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے معارف میں ان کی دو کتابوں پر اپنا سلسلہ مقالات شائع کرایا۔ اب ان مضامین کا مجموعہ عام افادے کے لیے عنوانِ بالا سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ موصوف کا پہلا سلسلۂ مضامین مولانا سندھی کی زندگی میں شائع ہوا تھا، چنانچہ مولانائے مرحوم اور ناقد کے درمیان بعض خیالات کی تشریح وتوضیح میں مراسلت بھی ہوئی، یہ خطوط بھی رسالے میں منسلک کر دیے گئے ہیں، جن سے رسالے کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ نیز رسالہ کی ابتداء میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کا ایک مختصر وجامع مقدمہ ثبت ہے''۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک،

www.idaraghufran.org

صفحہ ۱۵۱ و ۱۵۲، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان، طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ 1438ھ، اگست 2017ء)

مزید لکھتے ہیں:

''لائق ناقد (مولانا مسعود عالم ندوی) نے اس رسالے میں مولانا کے اسی قسم کے افکار و خیالات کا جائزہ پوری کامیابی کے ساتھ لیا ہے''۔ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک، صفحہ ۱۶۰، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان، طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ 1438ھ، اگست 2017ء)

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب اور ان کے مضمون کے متعلق مشاہیر اہلِ علم کے مذکورہ بالا خیالات و تبصرہ جات ملاحظہ کرنے سے متعدد شبہات دور ہو جاتے ہیں۔

## مولانا مسعود عالم ندوی سے مولانا سندھی کی مکاتبت

نیز مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی خود بھی مولانا مسعود عالم ندوی صاحب سے مکاتبت ہوئی، مگر مولانا سندھی صاحب نے ان کو فاضل ناقد کی طرح کا کوئی الزام لگا کر تردید نہیں کی، بلکہ ان کو فراخ دلی سے تنقید کرنے کی اجازت دی، چنانچہ مولانا سندھی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو تحریر کیا:

''آپ فراخ دلی سے تنقید کریں، ہم آپ کی جماعت سے علاحدگی اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ ہماری اغلاط کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہ ہو۔

میں اس قدر کم زور ہو چکا ہوں کہ جنھیں میں اپنا سمجھتا ہوں، وہ بھی منہ نہیں لگاتے، اس لیے اوروں پہ کیوں نزولِ بلا اپنے ساتھ ہو۔

اب ہم مکان شہر سے باہر بنائیں گے کا معاملہ ہے۔ والسلام

www.idaraghufran.org

## عبیداللہ سندھی

## بیت الحکمت، دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا)

## 22 اپریل 943 ہندی [1]

(مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ ۴۷، مکتوب نمبر ۱۹، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ناشر: مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی، پاکستان، اشاعت: 1997ء)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کی طرف سے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو آخر میں درجِ ذیل مکتوب تحریر کیا گیا:

''بجناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی دام عنایتہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی اس وقت علالت پر ہیں، چند دن تک ان کی حالت نہایت تشویش ناک رہنے کے بعد اب پھر اللہ کے فضل سے روبہ صحت ہے۔

کل آں ممدوح نے آپ کا استدراک، جو آپ نے ان کی تاریخ تحریک ولی اللہ محدث دہلوی پر ماہ فروری تا مئی 943 ہندی میں ''معارف'' میں شائع کرایا تھا، پڑھوا کر سنا، اور آج مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حضرت مولانا کی طرف سے تحریر کروں کہ:

ہم شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی دعوت کو اسلام اور اول درجے کی چیز مانتے ہیں، ان کے بعد امام ولی اللہ کی تحریک کو دوسرے درجے کی دعوت کا مقام دیتے ہیں، آج کل ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہم نے اطمینان کے ساتھ امام ولی اللہ کی

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے اپنے خطوط میں جو ''ہندی'' سن تحریر کیا ہے، وہ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کے اعتبار سے ہے، اس کے حملوں کا آغاز 1000 عیسوی میں ہوتا ہے، اس لیے مولانا سندھی صاحب کے تحریر کردہ ''ہندی سن'' میں موجودہ عیسوی سن کے لحاظ سے ایک ہزار سال کا فرق ہے، اس اعتبار سے مندرجہ بالا خط میں تحریر کردہ ''943 ہندی'' سے مراد، عیسوی سن ''1943'' ہوگا۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

تابعداری میں اپنا پروگرام (PROGRAMME) بنا لیا ہے، اب کہ اس میں کسی دوسرے پروگرام (PROGRAMME) کو تداخل کا موقع دینا نہیں چاہتے، براہ مہربانی ہمیں معاف فرمائیں''۔

فقط والسلام

المخلص

بشیر احمد بی اے

معتمد خصوصی حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی

(مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ ۴۹، مکتوب نمبر ۲۲، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ناشر: مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی، پاکستان، اشاعت: 1997ء)

یہ مکاتیب مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کی طرف سے ان کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' میں بھی شائع ہوئے ہیں، اور انھوں نے ان کو ملاحظہ کیا ہے (ملاحظہ ہو: مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر، صفحہ ۳۰ تا ۳۵، مطبوعہ: دارالدعوۃ السلفیۃ، لاہور، تاریخ اشاعت: صفر 1406 ہجری، نومبر 1985 عیسوی)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا مضمون ملاحظہ کر کے، ان کو لڑانے کا ماہر وغیرہ الزام دینے کے بجائے سنجیدہ انداز سے ان کو خطاب کیا ہے، اور ان کی تنقید کو ان کا کوئی جرم یا بدنیتی وغیرہ قرار نہیں دیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب (المتوفیٰ: 1977 عیسوی) اپنے مضمون ''ایک سرگرم وکیل'' میں لکھتے ہیں:

ایک محترم بزرگ کا مکتوب

''مولانا عبیداللہ سندھی پر، پروفیسر سرور کی جو کتاب شائع ہوئی تھی، اس پر مولوی مسعود عالم صاحب ندوی نے، خدا انھیں جزائے خیر دے ''معارف'' میں خوب

www.idaraghufran.org

لکھا، لیکن ''برہان'' کی طرح ''گواہ چست'' بن کر اس ''مدعی سست'' کی نصرت وتائید کی جو سعادت حاصل کر رہے ہیں، امید ہے کہ وہ بھی آپ کی نظر سے مخفی نہ ہوگی، کیا ''صدق'' میں اس پر کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں؟''

ارادہ اگر ہوتا بھی، تو اس ''گواہ چست'' کے بلیغ فقرہ کے بعد کچھ لکھنا اب تحصیلِ حاصل سا ہوگیا ہے، ایسا جاندار وسرگرم وکیل ہر بزرگ کو نصیب بھی تو نہیں ہوتا۔ ؎

دل روزِ حشر اس کا طرف دار ہوگیا　　بگڑا معاملہ مرا جھوٹے گواہ سے

(ہفتہ وار ''صدق، لکھنؤ'' صفحہ ۸، جلد نمبر 11، شمارہ نمبر 1، دوشنبہ، 23 جمادی الاولیٰ 1364 ہجری، بمطابق 7 مئی 1945 عیسوی)

مذکورہ تحریرات سے واضح ہے کہ متدین، مستند اور سنجیدہ اہلِ علم واہلِ قلم حضرات کا مولانا سندھی صاحب سے ذاتی اختلاف یا بغض نہ تھا، اور نہ ہی ہے، بلکہ مولانا سندھی صاحب سے ان کا اتفاق یا اختلاف دین کی خاطر تھا، اور اب بھی ہے۔

اب کوئی صاحب خود سے ہی اس اختلاف کو دین کے بجائے ذاتی نوعیت کا اختلاف بنالیں یا سمجھ لیں، یا اس کے متعلق ذاتی بغض کا فیصلہ فرمادیں، تو یہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے، جو نہ تو دوسروں پر حجت ہے اور نہ ہی اس کا واقعہ کے موافق ہونا ضروری ہے۔

اور فاضل ناقد نے ماہنامہ ''الجمعیۃ'' میں شائع ہونے والے مضمون میں جو یہ تحریر کیا ہے کہ:

''ان کا اپنے مکتوب میں اس سے انکار کہ میں جماعت اسلامی کے کہنے پر یہ کام نہیں کر رہا، یہ گلے پڑ گیا ہے، اور بہ قول ان کے، اس کا حساب یوم محشر میں ہوگا''۔

تو اس کا جواب اگلی فصل کے آخر میں آتا ہے۔

www.idaraghufran.org

## (فصل نمبر 7)

# چند مزید الزامات پر کلام

فاضل ناقد نے اپنی مرتب فرمودہ کتاب اور اپنے مضمون میں چند مزید ایسے الزامات بھی ذکر یا نقل کیے ہیں، جو بعض لوگوں کے لئے غلط فہمی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

ذیل میں اس طرح کے چند الزامات کا ذکر اور ان پر کلام کیا جاتا ہے۔

## الزام نمبر 1 پر کلام

فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب میں ایک جگہ درجِ ذیل سرخی قائم ہے:

''مولانا ابن الحسن عباسی سے آخری نصیحت:

اس سرخی کے حاشیے میں فاضل ناقد لکھتے ہیں:

''یہ نصیحت ہماری طرف سے مولوی محمد رضوان صاحب راولپنڈی والے کے لیے بھی ہے''۔

پھر درجِ بالا سرخی کے ذیل میں درجِ ذیل متن ہے:

آخر میں ہم مبصر موصوف (مولانا ابن الحسن عباسی صاحب) کے لیے بطور نصیحت حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا ایک فرمان نقل کرنا چاہتے ہیں، مولانا ندوی مرحوم فرماتے ہیں:

''بدگمانی بہت بری چیز ہے، اور بدگمانی ہی عقل مندی کی پہلی منزل ہے، دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، نری بدگمانی تو بے شبہ بہت بری بات ہے، مگر جس بدگمانی کے ساتھ کچھ دلیلیں ملیں اور کچھ نشانیاں بھی پائی جائیں، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی تحقیق کر لی جائے، تا کہ سفر کی پہلی ہی منزل میں قدم غلط راستے پر پڑ کر منزلِ مقصود سے دم بہ دم دوری ہوتی نہ

چلی جائے۔(ماہنامہ الفرقان، بریلی)'' (''یادگارِ اکابر''، صفحہ ۸۲۰)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا فرمان نقل کر کے دوسروں کو نصیحت کی طرف متوجہ کر دیا گیا، جس سے مولانا سندھی صاحب کی طرف متعدد غلط افکار کی نسبت کا ارتکاب کرنے سے بچنے کی نصیحت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

لیکن مذکورہ نصیحت کی روشنی میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ہی کے درجِ ذیل فرمان کو ملاحظہ کر کے، یہ فیصلہ کرنے کی بھی ضرورت ہوگی کہ خود حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب تو مولانا سندھی صاحب کے متعلق بدگمانی اور تحقیق نہ کرنے کی کم زوری میں مبتلا نہیں، جن کے حوالہ سے دوسروں کو نصیحت پیش کی جارہی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے بعض رفقا نے ہندوستان سے نکل کر آزاد سرحد اور افغانستان کا رخ کیا۔

قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے، پھر گو وہ خود اس دنیائے دَنی سے رخصت ہوگئے، مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لیے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے۔.....

افغانستان پہنچ کر ان کے مذہبی خیالات کے تغیّر کی خبر خواص کو برابر پہنچتی رہی، اور تردید کرنے والے تردید کرتے رہے، اور روس وٹرکی پہنچ کر تو ان کے خیالات کا انقلاب اوج کمال تک پہنچ گیا۔ ان کے قیامِ حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندوستان سے حجاز کو جاتے رہے، اور ان سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور

بیگانہ خیالات کو سن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے۔ ان کی ہندوستان واپسی کا سیاسی و مذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا، لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے، اور نہ دوسرے گروہ میں۔

یہ خاکسار بھی ان لوگوں میں ہے جو ان کی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اپنے بزرگوں کے اور ان کے تعلقات کے سبب سے ان کے ساتھ عقیدت رکھتا تھا، اور مولانا بھی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن جب سے ''معارف'' نے ان کے خیالات کی تردید میں حصہ لیا، وہ ارتباط باقی نہیں رہا۔.....

افسوس ہے کہ مولانا سندھی جیسا عالم متبحر یورپین انقلابات اور جدید سیاسی افکار میں الجھ کر حجاز سے ترکستان کی راہ چل پڑا۔ ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے خیالات کی بھی وفات ہو جاتی، مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی ترتیب و تہذیب و اشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کر لیا ہے۔

ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کیے گئے، اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب و اشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا، یہاں تک کہ ان کے پہلے رسالے میں شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک کے پورے سلسلے کو آج کل کے لینن اور ٹراٹسکی اور اسٹالن کی شکل میں پیش کیا گیا، اور ان خدا پرستوں کو دنیا پرست سیاسی پارٹیوں کے طریقِ دعوت کا نمائندہ بنایا گیا، اور یورپ کے سیاسی پارٹیوں کے اصول کو پیش کر کے اپنی مخالف پارٹی کے علماء کے قتل کی تحسین کی گئی۔ انا للہ!

یہ سب کچھ اس ہندوستان میں ہوا، جہاں بحمد اللہ علمائے دین اور مجاہدینِ حق کی کمی نہیں۔ مگر پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی۔ انھوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پرزور مضامین لکھے، اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی۔ اور اب ان کے یہ متفرق نمبر ایک مستقل رسالے کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناقدِ مجیب کے اس رسالے کو قبول اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ نصیب فرمائے۔ والسلام۔ سلیمان ندوی

(مقدمہ ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' تالیف مولانا مسعود عالم ندوی، از صفحہ ۱۹ تا ۲۹، ملخصاً، دار الدعوۃ السّلفیہ، شیش محل روڈ لاہور، تاریخِ اشاعت، صفر، ۱۴۰۶ھ، نومبر ۱۹۸۵ء)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے تو خود مولانا سندھی صاحب کی فکر کے متعلق واضح فیصلہ بھی فرما دیا، اور آخر میں مسلمانوں کے لیے دعاء بھی فرما دی، اگر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے نزدیک مولانا سندھی صاحب کے متعلق مذکورہ فیصلہ بدگمانی اور تحقیق نہ کرنے میں داخل ہوتا، تو وہ خود ایسا کیوں کرتے، جس سے معلوم ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے کلام کو صحیح محمل میں پیش نہیں کیا گیا۔۔

اس کے بعد موصوف کو اس موقع پر یہ وضاحت فرمانے کی بھی ضرورت تھی کہ مولانا سندھی صاحب کے متعلق حضرت مدنی، حضرت تھانوی اور دیگر کئی بڑے بڑے حضرات اور خود مولانا سندھی صاحب کے بعض اپنے معتمد رفقا، مولانا احمد علی لاہوری وغیرہ، کیا ''العیاذ باللہ'' سب ہی بدگمانی اور تحقیق نہ کرنے کے مرض میں مبتلا رہے، نیز مولانا سندھی کے علاوہ جن دوسرے افراد وشخصیات کے افکار سے مشائخِ دیوبند نے اختلاف کیا، مثلاً سر سید احمد خان وغیرہ، کیا وہاں بھی ان حضرات نے بدگمانی کا ارتکاب کیا، یا وہاں معاملہ کچھ اور رہا؟ اور یہ حضرات ''سوئے ظن'' کی حقیقت بھی نہ سمجھ سکے، جب کہ یہ حضرات، زندگی بھر ان بُرے اخلاق سے

دوسروں کو بچنے بچانے کی تلقین اور اصلاح کی فکر کرتے رہے، اور اس سلسلے میں ''حسنِ ظن'' رکھنے کی توفیق ان مذکورہ معتبر فیصلہ کُن حضرات سے ہٹ کر ''ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے والے'' چند حضرات ہی کے حصہ میں آئی، جو ''سوئے ظن'' کی حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں گے۔ [1]

# الزام نمبر 2 پر کلام

فاضل ناقد صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ، ان ہی کی تحریک پر مفتی محمد رضوان (صاحب راولپنڈی) نے ''مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے افکار اور تنظیم ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کتاب ترتیب دی، جس میں رطب ویابس جمع کر دیا گیا ہے۔

---

[1] قوله :(إياكم والظن) معناه :اجتنبوه، قال المهلب :هذا الظن ليس هو الاجتهاد على الظن وإنما هو الظن المنهى عنه فى الكتاب والسنة وهو الذى لا يستند إلى أصل .وقال الكرمانى: والأظهر أن المراد به ظن السوء بالمسلمين لا ما يتعلق بالأحكام.(عمدة القارى شرح صحيح البخارى، ج۲۳،ص ۲۳۲،باب تعليم الفرائض)

سوء الظن جائز عن أهل العلم لمن كان مظهرا للقبيح وجانبا لأهل الصلاح وغير مشاهد للصلوات فى الجماعة، وقد قال ابن عمر :كنا إذا فقدنا الرجل فى صلاة العشاء والصبح أسأنا الظن به.(شرح صحيح البخارى لابن بطال، ج۹،ص ۲۶۲،باب ما يجوز من الظن)

(إياكم والظن) أى احذروا اتباع الظن واحذروا سوء الظن بمن لا يساء الظن به من العدول والظن تهمة تقع فى القلب بلا دليل.(فيض القدير شرح الجامع الصغير،تحت رقم الحديث ۲۹۰۱)

باب النهى عن ظن السوء بالمسلمين من غير ضرورة كأن يظن بهم نقصاً فى دين، أو مروءة من غير أن يدل لذلك دليل.(دليل الفالحين لطرق رياض الصالحين، ج۸،ص ۴۱۵،باب فى النهى عن سوء الظنّ بالمسلمين من غير ضرورة)

ذكر القرطبى أن للظن حالتين :حالة تعرف وتقوى بوجه من وجوه الأدلة فيجوز الحكم بها، وأكثر أحكام الشريعة مبنية على غلبة الظن، كالقياس وخبر الواحد، وغير ذلك من قيم المتلفات وأروش الجنايات.

والحالة الثانية أن يقع فى النفس شىء من غير دلالة، فلا يكون ذلك أولى من ضده، فهذا هو الشك، فلا يجوز الحكم به، وهو المنهى عنه فى قوله تعالى :(يا أيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن)، وفى قوله صلى الله عليه وسلم :إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث.(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج۲۹،ص ۱۸۱،مادة " ظن ")

www.idaraghufran.org

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب مدظلہٗ خود یہ کام کر نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ تصنیفی صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو علم عطا فرمایا ہے، اس کے شایانِ شان نہیں ہے، انھوں نے اس کے لیے پہلے ابن الحسن صاحب عباسی کا انتخاب کیا، جو خیر سے مفتی صاحب موصوف کے شاگرد بھی ہیں، انھوں نے انتہائی جھوٹی باتیں حضرت سندھی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیں، اور اس پر خوب بغلیں بجائیں، سونے پر سہاگا عباسی صاحب کو اسی دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کی صحبت قریبہ نصیب ہوگئی، اور ان کے مدرسہ میں ملازم ہوگئے، مولانا کی بزرگی میں شک تو کوئی نہیں ہے، لیکن مولانا نے مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کو اپنی طویل زندگی میں پڑھا تک نہیں تھا، ان سے روک ٹوک کی کیا امید کی جاسکتی تھی؟ اسی لیے موصوف نے عباسی صاحب کی تحقیق پر اعتماد کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور لغزشوں کو معاف فرمائے۔ آمین!

عباسی صاحب اپنی غلطیوں اور مالی خامیوں کی وجہ سے جب طعن کا شکار ہونے لگے، تو حسن اتفاق سے حضرت مفتی صاحب مدظلہم کو راولپنڈی کے خانقاہی نظام کا ایک شخص مفتی محمد رضوان نامی کا مل گیا، اور ''مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے افکار اور تنظیم ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' انھوں نے کتاب مرتّب کردی، اس میں مضامین بعض ایسے حضرات کے بھی لگائے گئے ہیں، جو حضرت سندھی رحمہ اللہ کے معتقد ہیں، بلکہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا تو رجوع بھی ثابت ہو چکا ہے۔

مولانا زرولی خان صاحب، جو بخاری شریف کے سمجھنے والوں میں اپنا تیسرا نمبر بتاتے ہیں، حضرت سندھی رحمہ اللہ سے حد درجے بغض رکھتے ہیں، میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کی فکر کو سمجھ ہی نہیں سکے، اور شاید سمجھنے کی کوشش بھی نہیں فرمائی، جب فکرِ شیخ الہند رحمہ اللہ کو نہیں سمجھے، تو حضرت سندھی رحمہ اللہ کو کیا سمجھنے کی کوشش کی ہوگی؟'' (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۴۲، ۴۳)

www.idaraghufran.org

مذکورہ بالا عبارت میں اولاً تو یہ فیصلہ کردیا گیا کہ بندہ محمد رضوان نے مذکورہ کتاب، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ کی تحریک پر ترتیب دی ہے، اور مفتی صاحب موصوف، گویا کہ جب ابن الحسن عباسی صاحب سے یہ کام لینے سے عاجز ہوگئے، تو ان کو بندہ محمد رضوان دستیاب ہوگیا۔

لیکن ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی طرف نسبت کردہ اس قسم کی باتوں کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔

بندے کی تالیف کی پہلی طباعت ذوالقعدۃ 1435 ہجری، بمطابق ستمبر 2014 عیسوی کو ہوئی، جس کی اشاعت سے پہلے بندہ محمد رضوان کی حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے اس سلسلے میں کبھی نہ کوئی بات ہوئی، اور نہ ہی مشاورت ورابطہ ہوا، البتہ کتاب کی اشاعت کے بعد بندہ کی طرف سے دوسرے متعدد حضرات کی طرح حضرت مفتی صاحب موصوف کو بھی، رائے حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب ارسال کی گئی، اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب موصوف نے 29 ربیع الاول 1436 ہجری کو جو رائے ارسال فرمائی، اور وہ کتاب کے ضمیمے میں شائع بھی ہوچکی ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے صاف یہ تحریر فرمایا:

> ''الحمدللہ یہ کتاب موصول ہوئی، اور علالت کے باوجود بندہ نے اس کے بڑے حصے کا مطالعہ کیا، آپ نے الحمدللہ یہ بڑا کام کیا کہ جو مضامین عرصۂ دراز سے نایاب تھے، ان کو یک جا کردیا، بندہ کے لیے بھی اس کے متعدد مضامین معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث ہوئے''۔

اگر حضرت مفتی صاحب موصوف کو کسی دوسرے سے اس کام کو لینے کی خواہش ہوتی، تو ان کے پاس، یقیناً بندہ محمد رضوان سے زیادہ بہتر اور باصلاحیت افراد میسر تھے۔

علاوہ ازیں بندہ محمد رضوان نے اپنی تالیف کے پسِ منظر کو خود کتاب کے شروع میں ذکر کردیا ہے، جس سے مذکورہ الزام کی نفی ہوتی ہے۔

www.idaraghufran.org

دوسرے فاضل ناقد نے بندے کی تالیف کے متعلق یہ فیصلہ بھی فرمایا کہ اس میں رطب و یابس کو جمع کردیا گیا ہے، اس میں مضامین بعض ایسے حضرات کے بھی لگائے گئے ہیں، جو حضرت سندھی صاحب کے معتقد ہیں، بلکہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا تو رجوع بھی ثابت ہو چکا ہے۔

فاضل ناقد نے ان دعووں کے بھی دلائل پیش نہیں کیے، وہ الگ بات ہے کہ فاضل ناقد محض اپنے دعووں کو ہی ''شیخ چلی کے خیالی پلاؤ'' کی طرح دلائل سمجھے ہوئے ہوں، بقول کسے: ع

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب بے شک مولانا سندھی صاحب کے معتقد ہیں، جنھوں نے کئی رسائل ومضامین مولانا سندھی صاحب کی حمایت یا ان کے دفاع میں تالیف کیے ہیں، اور ان کے تقریباً تمام ہی رسائل ومضامین سے فاضل ناقد نے اپنی مرتب کردہ کتاب کا پیٹ بھر کر اس کے حجم وضخامت کا سامان کیا ہے، لیکن معتقد ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود وہ مولانا سندھی صاحب کے آخری دور کے تمام متنازع افکار سے بھی متفق ہوں، اور اگر کوئی متفق بھی ہو، تو اس کی کتاب سے کوئی حوالہ یا عبارت لکھنا اس حوالے کے مردود یا غیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں، بالخصوص جب کہ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کی گئی ہو، اور اس سے مطلوبہ نتیجہ صحیح ثابت ہوتا ہو، بلکہ بعض جہات سے اس کا حوالہ زیادہ مؤثر ہے، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب، پروفیسر محمد سرور صاحب اور ان کی خدمات کو اور اسی طرح ایسے کئی حضرات کی تحریرات کو معتمد قرار دیتے ہیں، جن سے مولانا سندھی صاحب کے کئی غلط افکار کا ثبوت ہوتا ہے۔

تیسرے فاضل ناقد نے یہ تجزیہ بھی فرمادیا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ میں تصنیفی صلاحیتوں کی کمی نہیں، بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم عطاء فرمایا، تو یہ کام اس کے شایانِ شان نہیں۔

حالانکہ حضرت مدنی کی جو اس سلسلے میں فیصلہ کن تحریر ہے، اس کو بھی حضرت مفتی صاحب موصوف نے ہی شائع کیا (جس کے متعلق فاضل ناقد نے یہاں تک لکھ دیا ''انھوں نے اس سے اپنا الوسیدھا کیا'' جیسا کہ آگے آتا ہے)

نیز اس سلسلے میں اصولی انداز میں حضرت مفتی صاحب موصوف نے اپنا موقف بھی واضح فرمادیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب موصوف کے متعدد حوالہ جات پہلے ذکر کیے جاچکے ہیں، تو یہ سب کچھ حضرت مفتی صاحب کے شایانِ شان کیسے ہوگیا۔

فاضل ناقد ایک جگہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے متعلق لکھتے ہیں:

> حضرت سندھی کی مخالفت پر کمربستہ ہونے میں حضرت مولانا (مفتی محمد تقی عثمانی) کے لیے یہ مصروفیات سدّ راہ نہ بنیں؟ مولانا نے ابن الحسن کو اسی کے لیے تیار کیا، اب راولپنڈی کے مولانا رضوان سے حضرت سندھی کے خلاف ''کالی کتاب'' لکھوائی، اس کے لیے وقت کہاں سے آیا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تعمیر کے لیے وقت نہیں، البتہ تخریب جتنی چاہیں کرالیں۔
>
> (حاشیہ ''یادگارِ اکابر'' ص ۶۷۷)

یہاں آکر وہ شایانِ شان والی بات ختم ہوگئی، اور تخریب کرانے کا وقت بھی نکل آیا۔

اس پر افسوس کے سوا کیا، کہا جاسکتا ہے۔

چوتھے فاضل ناقد کا یہ بھی فرمانا ہے کہ بندہ محمد رضوان سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے، مولانا عبیداللہ سندھی صاحب پر کام کرنے کے لیے مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کا انتخاب کیا۔

ایک مصنف، صاحبِ قلم، جس کے مختلف موضوعات پر مختلف وقتوں میں متعدد علمی مضامین ہیں، جو ظاہر ہے ہر صاحبِ علم، صاحبِ فکر کی طرح اپنی ہی منشا و ترجیحات پر لکھنا شمار ہوں گے۔ ان پر بغیر دلیل کے ایسا حکم لگادینا، بظاہر حسن ظن کے موافق نہیں۔

www.idaraghufran.org

علاوہ ازیں مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کا مولانا سندھی صاحب کے سلسلے میں معتدل موقف شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے، جس پر اعتراض کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں۔

فاضل ناقد، مولانا سید محمود میاں صاحب کے متعلق بھی یہ فرما چکے ہیں کہ انھوں نے ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں حضرت مدنی کا مضمون، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تحریک ومنشاء پر شائع کیا، جس کا ذکر دوسرے مقام پر کیا جاچکا ہے۔

پانچویں فاضل ناقد نے عرصۂ دراز تک ملک بھر کے وفاق المدارس کے صدر اور پوری زندگی علمی مشاغل سے وابستہ رہنے والی شخصیت شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے متعلق بھی یہ دعویٰ فرمادیا کہ انھوں نے اپنی طویل زندگی میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو پڑھا تک بھی نہیں، اوپر سے انھوں نے روک ٹوک نہ کرنے کا جرم بھی کیا، اور بلا تحقیق ابن الحسن عباسی صاحب کی تحقیق پر اعتماد بھی کیا۔

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب میں، مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری کے متعلق بھی یہ دعویٰ فرما چکے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مسئلہ پر ان کی نظر نہیں۔

شاید ان سب حضرات کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی سعادت صرف فاضل ناقد کے ہی حصہ میں آئی۔

چھٹے فاضل ناقد نے ایک اور مشہور عالمِ دین مولانا زرولی خان صاحب کی طرف بھی یہ نسبت کی کہ وہ مولانا سندھی صاحب سے حد درجے بغض رکھتے ہیں، نیز اس بات کا بھی یقینی فیصلہ کردیا کہ مولانا زرولی خان صاحب، حضرت شیخ الہند کی فکر کو سمجھ ہی نہیں سکے، بلکہ شاید سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

حالانکہ فاضل ناقد نے ماہنامہ ''نور علیٰ نور'' کراچی میں شائع مولانا زرولی خان صاحب کے ایک مضمون کا جو حوالہ اپنی کتاب میں دیا ہے، اور وہ پورا مضمون ہم نے مقدمہ میں نقل کیا ہے، اس میں شیخُ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب نے مولانا سندھی صاحب کی آخری عمر کے

بعض فکری رجحانات کو جمہور علماء کے موقف ومسلک سے الگ ہونے کا ذکر کیا ہے، اور ساتھ ہی مولانا سندھی صاحب کے ان خیالات پر حوادثات ومصائب کے گہرے اثر ہونے کا ذکر کیا ہے، اور اس کے بعد انھوں نے یہاں تک فرمادیا کہ:

''اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے مقام ومرتبے میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے، یا حضرت کے معاصرین اور بعد ہم اکابرین میں ان کا اکرام روبہ تنزل ہوگیا تھا، ہرگز نہیں۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ الحدیث مولانا زرولی خان صاحب کو مولانا سندھی صاحب کی ذات یا شخصیت سے اختلاف یا بغض نہیں، بلکہ ان کے بعض افکارِ شاذہ سے اختلاف ہے، اور اگر ان افکارِ شاذہ سے اختلاف ہی بغض قرار دیا جائے، تو یہ محمود بغض ہے، جو الحب للّٰہ و البغض للّٰہ کی فرع ہے اور ایمان کے شعبوں میں کا ایک شعبہ ہے، اور مسلمان کے لئے احکامِ تکلیفیہ میں سے ہے۔

اگر کسی صاحبِ علم یا کسی بھی شخصیت کو مولانا سندھی صاحب کی ذات سے بغض نہ ہو، بلکہ اُن کے ایسے افکار وخیالات سے بغض ہو، جو قرآن وسنت یا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہوں، اور اسی کے ساتھ اس کو مولانا سندھی صاحب کی اچھی صفات سے محبت بھی ہو، اور ان کے مقام ومرتبے کا اعتراف بھی ہو، بلکہ اس سے بڑھ کر حسنِ ظن کے لیے حوادثات ومصائب کے سبب دماغی عارضے کی تاویل کا بھی قائل ہو، تو یہ شریعت کی نظر میں مذموم نہیں، بلکہ محمود، اللہ کا پسندیدہ عمل اور ایمان کے مضبوط ہونے کی نشانی ہے۔

بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے سرسید احمد خان صاحب کے متعلق بھی اس قسم کا مضمون فصل نمبر 5 میں گزر چکا ہے، اور احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَنَّہٗ قَالَ: مَنْ أَحَبَّ لِلّٰہِ،

وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ، وَأَعْطَى لِلّٰهِ، وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ. (سنن أبی داود، رقم الحديث ۴۶۸۱، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الإيمان ونقصانه) [۱]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھا، اور اللہ ہی کے لیے دیا، اور اللہ ہی کے لیے منع کیا، تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَوْثَقَ عُرَى الْإِيْمَانِ أَنْ تُحِبَّ فِي اللّٰهِ، وَتُبْغِضَ فِي اللّٰهِ. (مسند احمد، رقم الحديث ۱۸۵۲۴) [۲]

ترجمہ: ایمان کا سب سے مضبوط حلقہ یہ ہے کہ آپ اللہ کے سلسلے میں محبت رکھیں، اور اللہ کے سلسلے میں بغض رکھیں۔ (مسند احمد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ، وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ. (سنن ابی داؤد، رقم الحديث ۴۵۹۹، كتاب السنة، باب مجانبة أهل الأهواء وبغضهم) [۳]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال میں سب سے زیادہ افضل عمل، اللہ کے سلسلے میں محبت رکھنا اور اللہ کے سلسلے میں بغض رکھنا ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں درجِ ذیل الفاظ ہیں:

---

[۱] قال شعيب الارنؤوط:
حديث صحيح، وهذا إسناده حسن (حاشية سنن ابی داؤد)

[۲] قال شعيب الارنؤوط:
حديث حسن بشواهده، وهذا إسناد ضعيف (حاشية مسند احمد)

[۳] قال شعيب الارنؤوط:
حسن لغيره، وهذا إسناد ضعيف (حاشية سنن ابی داؤد)

www.idaraghufran.org

إِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ، وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ.

(مسنداحمد، رقم الحديث ۲۱۳۰۳) [1]

ترجمہ: اللہ کے نزدیک اعمال میں سب سے زیادہ محبوب عمل، اللہ کے سلسلے میں محبت رکھنا اور اللہ کے سلسلے میں بغض رکھنا ہے۔ (مسند احمد)

معلوم ہوا کہ کسی کے ایمان یا اعمالِ صالحہ کی وجہ سے محبت رکھنا اور اس کے کفر یا عصیان وغیرہ کی وجہ سے بغض رکھنا، اللہ کا پسندیدہ اور محبوب ترین وافضل ترین عمل اور مضبوط وکامل ایمان کی نشانی ہے۔ [2]

اس قسم کی احادیث کے مطابق اللہ والوں کا تعلق دین کے تابع ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا احمد علی لاہوری کے بارے میں بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا مولانا لاہوری کا مولانا سندھی صاحب سے سارا تعلق دین کے تابع تھا، اسی وجہ سے انھوں نے مولانا سندھی صاحب کے تمام تر تعلقات کے باوجود بعد کے ان افکار وخیالات میں متابعت نہیں فرمائی، جو مولانا لاہوری کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخُ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار ومسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کردیا، جس سے مولانا سندھی صاحب کو رنج بھی ہوا، اور شکایت بھی پیدا ہوئی، جس کی تفصیل مولانا ابوالحسن ندوی صاحب کے حوالے سے پہلے گزر چکی ہے۔

---

[1] قال شعيب الارنؤوط:
حسن لغيره، وهذا إسناد ضعيف(حاشية مسند احمد)

[2] (من أحب لله) أى لأجله ولوجهه مخلصا لا لميل قلبه وهوى نفسه (وأبغض لله) لا لإيذاء من أبغضه له بل لكفره أو عصيانه .(فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ۸۳۰۸)
"أحب الأعمال إلى الله الحب فى الله، والبغض فى الله (حم) عن أبى ذر (ح) ."
(أحب الأعمال إلى الله الحب فى الله والبغض فى الله) كلمة فى للتعليل، مثلها فى حديث: " أن امرأة دخلت النار فى هرة "أى الحب لأجل الله وهو أن يحب من يحبه الله وهم أهل طاعته وتبغض من يبغضه الله وهم أهل معصيته فتحب أنبيائه وصالحى عباده وتبغض أعدائه وأعداء رسله كالكفار والفساق وتأتى أحاديث يحصر فيها الإيمان على ذلك .(التنوير شرح الجامع الصغير للصنعانى، تحت رقم الحديث ۲۰۱)

www.idaraghufran.org

# الزام نمبر 3 پر کلام

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک طبقہ ہے (جس میں کچھ علمائے کرام دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں، اور کچھ بہ اصرار اور زبردستی اپنا تعلق علمائے دیوبند سے جڑا ہوا دکھاتے ہیں) جو بعض علماء اور عوام کو یرغمال بنا کر حضرت سندھی رحمہ اللہ سے انھیں برگشتہ کر رہا ہے، یہ طبقہ بجائے حضرت سندھی رحمہ اللہ کے مطالعے کے صرف دشنی میں الزام تراشیوں کی حد تک جانے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہودیوں کی تنظیم فری میسنری کا مشن بھی یہی ہے'' (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۱۰، ۱۱)

فاضل ناقد کی مرتب کردہ کتاب میں اس طرح کے الفاظ وکلمات سے ناواقف حضرات کے جذبات تو بھڑکائے جا سکتے ہیں، لیکن تحقیق کے متلاشی حضرات کے لیے سوقیانہ اندازِ تحریر تارِ عنکبوت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

'' وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ. لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ''

یہ بات واضح ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف خود مولانا سندھی صاحب کے دور میں اور ان کے بعد بڑے بڑے اصحابِ علم حضرات کو ہے، جنھوں نے اس سلسلے میں خود اپنے مشاہدات بھی بیان کیے ہیں، جن میں حضرت مدنی، حضرت تھانوی اور حضرت لاہوری جیسے ذمہ دار اہلِ دیوبند داخل ہیں، اور ان حضرات نے اس سلسلے میں اور پھر بعد کے حضرات نے مذکورہ مشائخِ دیوبند کی اتباع میں، نیز مولانا سندھی صاحب کی تحریرات وتقریرات کے مطالعہ سے متنازع اور شاذ افکار کا پتہ چلایا ہے، محض الزام تراشیوں سے کام نہیں لیا، اور انھوں نے یہ سب کچھ دینِ اسلام کے تحفظ کے لیے اعتدال و اکرام کے ساتھ کیا ہے۔

کیا اہلِ دیوبند کے مشائخ وترجمان اور ان کے متبعین تمام مہذب ومعتدل حضرات کے دیوبند سے تعلق کو زور زبردستی جڑا ہوا قرار دینا اور ان کی مساعیِ جمیلہ کو یہودیوں کی کسی سازشی

تنظیم کے ساتھ ملا کر ذکر کرنا منصفانہ طرز کہلائے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔

اس کے علاوہ حضرت مدنی، حضرت تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبان وغیرہ بھی اگر اپنا دیوبند سے تعلق زبردستی جڑا ہوا دکھانے والوں میں شامل ہوں، تو پھر دیوبند آخر نام کس چیز کا ہے، جو محض فاضل ناقد کے عالی دماغ میں اپنا وجود رکھتا ہے۔

## الزام نمبر 4 پر کلام

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہٗ، ابن الحسن، مولوی محمد رضوان اور ان کی فکر کے حامل بڑے چھوٹے بزرگوں نے حضرت سندھی علیہ الرحمہ پر یلغار تو ایسی کی ہے کہ شاید اسلام پر دھبہ ہیں''۔ (''یادگارِ اکابر'' حاشیہ صفحہ ۶۳۰)

پہلے تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ نے مولانا سندھی صاحب کے متعلق اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر نہیں فرمایا، بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے بزرگ واکابر حضرات کی ہدایات ذکر کی ہیں، نیز مولانا سندھی صاحب کے متعلق انھوں نے حضرت مدنی کی رائے کے متعلق یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ:

> ''حضرت مولانا سندھی کے بارے میں اس سے زیادہ معتدل، مستند اور قابلِ اعتماد رائے اور کیا ہوسکتی ہے؟''

نیز مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کا انتہائی معتدل اصولی موقف بھی شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے۔

جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس فکر کے حاملین نے، خواہ وہ بڑے ہوں، یا چھوٹے، خود سے مولانا سندھی صاحب پر کوئی یلغار نہیں کی، اور اگر پھر بھی کوئی اس بات کو تسلیم نہ کرے، تو پھر

یہی فیصلہ اس فکر کے حامل بڑے حضرات، حضرت تھانوی، حضرت مدنی، حضرت لاہوری وغیرہ جیسے حضرات کے متعلق بھی لازم آئے گا، اگرچہ فاضل ناقد کے درج ذیل جملہ:

''ان کی فکر کے حامل بڑے چھوٹے بزرگوں''

میں اس طرف ایک اشارہ ملتا ہے، **واللہ اعلم بحقیقۃ الحال.**

## الزام نمبر 5 پر کلام

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''علم وتحقیق سے محروم بعض ناعاقبت اندیش حضرات بالخصوص ابن الحسن صاحب، راولپنڈی کے مولانا رضوان صاحب، ان کے حوالے سے حضرت سندھی رحمہ اللہ کو ملعون کرنے کا ٹھیکہ اٹھائے ہوئے ہیں''۔ (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۶۶۹)

فاضل ناقد نے علم وتحقیق سے محروم اور ناعاقبت اندیش ہونے اور مذکورہ ٹھیکہ اٹھانے کا دعویٰ تو صراحت کے ساتھ فرمادیا، لیکن نہ تو فاضل ناقد نے باحوالہ ملعون کے الفاظ نقل کیے، اور نہ ہی اس پر غور کیا کہ اگر کوئی اپنے سے پہلے بزرگوں کی اتباع میں کوئی بات کہے، یا کوئی موقف اختیار کرے، تو پھر کیا اس الزام سے سابق حضرات اور خود حضرت مدنی اور حضرت لاہوری جیسے مشائخ بھی بچ پائیں گے؟

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ انھوں نے حضرت مدنی وغیرہ مشائخِ دیوبند کی اتباع میں موقف اختیار کیا ہے، جبکہ بندے کی ترتیب شُدہ کتاب میں متعدد اکابر ومشائخ کے مضامین جمع ہیں، جن میں علم وتحقیق کے بلند مقام پر فائز، فکرِ دیوبند کے رقیب وترجمان حضرات بھی داخل ہیں، اگر کوئی غلط فکر کا حامل یہ چاہتا ہے کہ دیوبندی مکتبۂ فکر کے اس کے زعم میں ان رقیب حضرات کو مطعون کرکے خود غلط افکار کا دیوبند کی طرف سے ٹھیکہ دار بن جائے، تو دیوبند کے اصل محافظ ورقیب اس کو ہرگز ایسا کرنے نہیں دیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فاضل ناقد کے اس نوعیت کے طرزِ عمل سے بعید نہیں کہ وہ دیوبند کے بڑے بڑے مشائخ واکابر کو نظر انداز کر کے، ان کے علی الرغم خود ہی دیوبند کے ٹھیکے دار ہونے کا دعویٰ نہ کر دیں۔

## الزام نمبر 6 پر کلام

فاضل ناقد اپنی مرتب کردہ کتاب میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں بہت کم ہیں، لیکن جو ہیں وہ مستند ہیں، اور ان پر اعتماد بھی کیا جاسکتا ہے، البتہ ان کے شاگردوں کی مرتب کردہ تحریریں جو انھوں نے مولانا سندھی کی طرف منسوب کردی ہیں، ہر صاحبِ عقل وخرد اس بات کو بہ خوبی جانتا ہے کہ ان کے صحت وسقم کی تمام تر ذمہ داری ان کے مرتبین پر ہی عاید ہوتی ہے، نہ کہ مولانا سندھی پر! (''یادگارِ اکابر'' صفحہ ۲۹)

اس سلسلے میں تیسرے ضمیمے کے اندر ہم نے واضح کر دیا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کے حوالہ سے بعض تحریرات وتالیفات ایسی ہیں، جو مولانا سندھی صاحب کی حیات میں شائع ہوئیں، یا ان پر مولانا سندھی صاحب نے تصدیق فرمائی، یا وہ مولانا سندھی صاحب کے معتمد تلامذہ ورفقاء کے حوالہ سے املائی طور پر منقول ہیں، ان سب کے متعلق یہ حکم لگا دینا کہ ان کی تمام تر ذمہ داری ان کے کاتبین ومرتبین اور سامعین پر عاید ہوتی ہے، نہ کہ مولانا سندھی صاحب پر، اس عذرِ لنگ کا تاویلِ بارِد ہونا گزشتہ صفحات میں اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے بعد کے زمانہ کے افکار کا ذکر صرف مولانا سندھی صاحب کے شاگردوں کی تحریروں سے ہی ثابت نہیں، بلکہ دیگر معتبر ومستند حضرات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، جنھوں نے مولانا سندھی صاحب کے اس قسم کے افکار کو خود اپنے کانوں سے براہِ راست سنا، اور ان پر نکیر وتنقید فرمائی، مولانا سندھی صاحب کے سب سے معتمد شاگرد حضرت لاہوری بھی اس فہرست میں شامل ہیں، اس قسم کے مضامین ہماری کتاب میں شاملِ اشاعت ہیں۔

www.idaraghufran.org

اس تقسیم کی کوئی معقول بنیاد نہیں کہ مولانا سندھی صاحب کی تصدیق وتائید اوران کے معتبر ومستند تلامذہ کی طرف سے شائع تحریرات وتالیفات میں جو افکار صحیح ہیں، وہ تو مولانا سندھی صاحب کے اپنے ہیں، اوران ہی تحریرات وتالیفات میں، مولانا سندھی صاحب کے نام سے یاان ہی تلامذہ کی طرف سے بیان کردہ جوافکار غلط اور غیر اسلامی شامل ہیں، ان کی تمام تر ذمہ داری، مولانا سندھی صاحب کے بجائے ان تحریرات وتالیفات کے ناقلین، کاتبین ومرتبین پر عائد ہوتی ہے۔ [1]

حضرت مدنی جیسی شخصیت اپنے مشاہدے کی روشنی میں یہ فیصلہ فرما چکی ہے کہ حجاز میں مولانا سندھی صاحب بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے، ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا۔

لہٰذا اگر مولانا سندھی کی کسی تحریر وتالیف میں صحیح اور غلط افکار میں تضاد ہو، تو وہ دونوں متضاد چیزیں مولانا سندھی صاحب کی طرف ہی منسوب سمجھی جانی چاہییں، اگرچہ اس کا سبب مولانا سندھی صاحب کا دماغی عارضہ کیوں نہ ہو، جس کی وضاحت ہم نے شروع میں کردی ہے۔

بعض چیزیں مولانا سندھی صاحب کی حیات میں ہی ان کی تحریرات کی روشنی میں سامنے آئیں، اور مولانا سندھی صاحب نے ان کی تردید نہیں کی۔

اس موقع پر مولانا سندھی صاحب کی حیات میں شائع شدہ مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب کی کتاب کی درجِ ذیل عبارت بھی قابلِ توجہ ہے:

> ”مولانا عبیداللہ سندھی کی تعلیمات اور افکار سیاسی اور ان کے سوانح حیات پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر محمد سرور صاحب نے جو کتاب ”مولانا عبیداللہ

---

[1] لقوله تعالى:
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ(سورة البقرة،رقم الآية،٨٥)
ولقوله تعالى:
وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ. وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا(سورة النساء،رقم الآية،١٥٠)

www.idaraghufran.org

سندھی‘‘ نامی شائع کی ہے، اس کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا سندھی کی طرف قرآن وحدیث کے جن افکار کا انتساب کیا گیا ہے، وہ اتنے غلط اور غیر اسلامی ہیں کہ ان کے متعلق اپنے قدیم حُسنِ ظن کی بنا پر ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ یہ واقعی مولانا کے افکار ہوسکتے ہیں۔

میرے لئے یہ سہل تھا کہ ان افکار کے متعلق مولانا سندھی سے نجی طور پر استصواب کر لیتا، مگر اس کتاب کی اشاعت کا معاملہ نجی حد سے آگے بڑھ چکا ہے، اور مولانا سندھی کے انتساب کے ساتھ یہ افکار عوام تک پہنچ چکے ہیں، اب ضرورت اس کی ہے کہ عوام کو مولانا سندھی کی زبان وقلم سے اس کی تصویب اور تغلیط معلوم ہوجائے۔

مولانا سندھی نے اگر ان افکار کے انتساب کی تغلیط کردی، تو معاملہ ختم ہے، ورنہ پھر ہم ایسے بے مایہ اور کم فہم انسان کے لیے بجز اس کے کیا چارۂ کار ہوسکتا ہے کہ ان افکار کے پسِ منظر کو مولانا سندھی کی خدمت میں پیش کرکے پوچھیں کہ ولی اللّٰہی فکر جس کے مولانا سندھی علم بردار ہیں، ان افکار کا متحمل ہوسکتا ہے؟‘‘ (ہفتہ وار ’’صدق، لکھنؤ‘‘ جلد نمبر 9، شمارہ نمبر 43، 13 مارچ 1944 عیسوی، مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۲۶۹ و ۲۷۰، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان، طباعتِ دوم: جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ اپریل 2016ء)

مولانا سندھی صاحب کی ایک کتاب جو پروفیسر سرور صاحب نے ترتیب دی تھی، اور اس کی خود مولانا سندھی صاحب نے بھی تصدیق وتوثیق فرمائی تھی، جس سے مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات کی ترجمانی ظاہر ہوتی ہے، اس میں بھی مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار وخیالات متنازع اور شاذ ہیں، جن کی متعدد اصحابِ علم وقلم حضرات نے تردید کی ہے۔

مولانا سندھی صاحب کے افادات وملفوظات پر مشتمل کتاب بھی پروفیسر محمد سرور صاحب کی ترتیب شدہ ہے، جن کی ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب نے توثیق کی ہے، اور

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب کو فاضل ناقد وغیرہ مولانا سندھی کا معتبر محقق ومفکر اور ترجمان سمجھتے ہیں، اپنی تالیف شدہ کتاب میں بھی فاضل ناقد نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے متعدد مضامین شامل کئے ہیں۔

## الزام نمبر 7 پر کلام

فاضل ناقد اپنے مضمون ''جماعت دیوبند کا ایک مظلوم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ہیں مولانا عبیداللہ سندھی نوراللہ مرقدہٗ جن کا نام مبارک بعض علماء اور بزرگوں کی زبان پر آتا ہے تو ایسا منہ بن جاتا ہے جیسا منہ میں لیموں نچوڑ دیا ہو، اور وہ یہ لوگ ہوتے ہیں جو حضرت امام شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا محمود حسن علیہما الرحمۃ پر انگلی اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو پتلی گردن مولانا عبیداللہ سندھی کی انھیں ملتی ہے''۔

جن علماء اور بزرگوں کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے، معلوم نہیں کہ ان میں حضرت مدنی، حضرت تھانوی، حضرت لاہوری، مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ جیسی شخصیات بھی شامل ہیں یا نہیں؟

پھر یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ ان حضرات نے مولانا سندھی صاحب کے متنازع وشاذ افکار وخیالات سے منہ بنایا، یا پھر خود مولانا سندھی صاحب کی ذات سے ہی منہ بنایا؟

یہ بات واضح ہے کہ مستند ومعتمد اہلِ علم، اکابر ومشائخ حضرات نے مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ذاتی اختلاف نہیں فرمایا، اور نہ ہی پتلی یا موٹی گردن ہونے کی بنیاد پر ان سے اختلاف فرمایا، بلکہ مولانا سندھی صاحب کے ساتھ ان کا اختلاف علمی ودینی نوعیت کا ہے، جس میں انھوں نے مولانا سندھی صاحب کی خدمات واوصاف کی بھی رعایت کی ہے، اور آزادی کی تحریک اور قربانی میں ان کا سر اونچا اور قد کاٹھ ممتاز ونمایاں ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ان حضراتِ اہلِ علم کے سامنے اس قسم کے غیر معتدل افکار وخیالات دیگر کسی اور بزرگ کی طرف سے بھی سامنے آتے، اس پر ردِّ عمل بھی ان کی شخصیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی نوعیت کا ہوتا، پس ان کا کسی سے منہ بننا یا نہ بننا صرف اللہ کے لیے ہے، اور اہلِ حق کا طرزِ عمل دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کا مصداق ہے، جن میں اللہ کے لیے ہی محبت وبغض رکھنے کی فضیلت آئی ہے، اور وہ احادیث پہلے ذکر کی جا چکی ہیں۔

اور شریعت کے اس حکم کے انطباق ومصداق میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے متعدد اشکالات وشبہات جنم لیتے ہیں، چنانچہ مولانا سندھی صاحب کے افکار وخیالات سے اختلاف کرنے والے پر فوراً ان کی شخصیت وذات پر حملہ کرنا سمجھ کر چڑھائی شروع کر دی جاتی ہے۔

## الزام نمبر 8 پر کلام

فاضل ناقد نے ماہنامہ ''الجمعیۃ'' میں شائع ہونے والے مضمون میں یہ بھی تحریر کیا کہ:

''ان (یعنی بندہ محمد رضوان) کا اپنے مکتوب میں اس سے انکار کہ میں جماعت اسلامی کے کہنے پر یہ کام نہیں کر رہا، یہ گلے پڑ گیا ہے، اور بہ قول ان کے، اس کا حساب یومِ محشر میں ہوگا''۔

فاضل ناقد نے بندہ محمد رضوان کے جس مکتوب کا حوالہ دے کر مندرجہ بالا بات کہی ہے، یہ بہت مجمل بلکہ خلافِ واقعہ ہے۔

اور فاضل ناقد کے ساتھ مکاتبت میں اس موضوع کے کئی پہلو جڑے ہوئے ہیں۔

پہلے بندہ محمد رضوان نے اس مکاتبت کے ذاتی اور نجی ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، لیکن اب فاضل ناقد نے اس کے حوالہ کو مجمل ومبہم انداز میں ذکر کر کے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو معلوم کیا جائے۔

بندہ محمد رضوان کے پاس فاضل ناقد کا ابتدائی خط اور بندے کی طرف سے اس کے جواب کی نقل اور فاضل ناقد کا دوسرا خط، بحمد اللہ تعالیٰ محفوظ ہے، اسی کے ساتھ فاضل ناقد کے ساتھ

مکاتبت پر جو بندے نے اصلاحی غرض سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی سے اس سلسلے میں ہدایت حاصل کی، اس کو بھی ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آگے اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

فاضل ناقد نے سب سے پہلے بندہ محمد رضوان کو درجِ ذیل خط تحریر کیا۔

---

جناب مفتی محمد رضوان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

جناب کی تالیف کردہ کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی .....الخ'' نظر سے گزری، آپ نے اس میں اکثر مضامین جھوٹے لگادیے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ [1]

کیا مولانا عبیداللہ صاحب کو ہمارے بزرگوں نے ''ملحد، زندیق، کافر'' وغیرہ کہا ہے؟ حیرت ہے کہ ایسی کتابیں جو مولانا سندھی کے حق میں تھیں، یا ان کو حق پر سمجھنے والوں نے لکھی تھیں، ان کے مضامین اپنی مطلب برآری کے لیے اپنی کتاب میں لگادیے۔

آپ اپنے نام کے ساتھ ''مفتی'' کا لاحقہ لگاتے ہیں، خدارا! بتایے تو یہ کون سے فقہی مسئلے کی بنا پر آپ کارنامہ انجام دے رہے ہیں؟ [2]

میں تو آپ کو سلوک وتصوف کا بندہ سمجھتا تھا، لیکن آپ تو جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں کھیلنے والے اناڑی ثابت ہوئے۔

---

[1] فاضل ناقد نے اکثر مضامین کو تو جھوٹا قرار دے دیا، لیکن بندے کے اس سلسلے میں رابطہ کرنے کے باوجود انھوں نے کسی ایک مضمون کے بھی جھوٹا ہونے کی دلیل پیش نہیں کی، تاکہ بندہ ان پر نظرِ ثانی کرتا۔ محمد رضوان

[2] یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے یہاں اردو کے استعمال میں مفتی نام کے ساتھ لاحقہ نہیں، بلکہ سابقہ کی جگہ آتا ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

آپ کے سامنے تازہ تازہ ''مرحوم ابن الحسن عباسی'' کا معاملہ ہے، جسے میں مولانا سندھی کا عالمِ برزخ میں صبر کا نتیجہ سمجھتا ہوں، خدا نہ کرے، آپ بھی اسی طرح متاثر ہوں۔ [1]

آپ بذریعہ خط اپنی وضاحت فرمائیں، تاکہ بدگمانی ختم ہو سکے۔

والسلام

.....

26 صفر 1437 ہجری 09.12.15

بندہ محمد رضوان نے فاضل ناقد کی طرف سے بدگمانی دُور کرنے کی خواہش پر ان کے اس خط کا درجِ ذیل جواب تحریر کیا۔

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی جناب مولانا .....صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

جناب کا مکتوب گرامی موصول ہوا، جس کے متعلق بذریعۂ خط جناب نے وضاحت کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

---

[1] اس کا شاید فاضل ناقد کو الہام ہوا ہو، اور شاید ان کو تو اپنے اس الہام پر شرح صدر ہو، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا الہام دوسرے پر حجت نہیں، دوسرے تو شرعی اصول وقواعد کے مطابق موقف اختیار کرنے کے مکلّف ہیں، اور اسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب ہیں۔ محمد رضوان

أما إلهام غير الأنبياء من المسلمين، فإنه ليس بحجة، لأن من ليس معصوما لا ثقة بخواطره لأنه لا يأمن من دسيسة الشيطان فيها، وهو قول جمهور أهل العلم، وهو المختار عند الحنفية، ولا عبرة بما قاله قوم من الصوفية بأنه حجة في الأحكام.

وقيل :هو حجة على الملهم لا على غيره، إذا لم يكن له معارض من نص أو اجتهاد أو خاطر آخر(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٦، ص١٨٨ ،مادة "إلهام")

www.idaraghufran.org

بندے نے اپنی کتاب کے شروع میں بھی وضاحت کردی ہے کہ بندے نے صرف مضامین کو جمع کیا ہے، خود سے کچھ نہیں کیا، اور جو مضامین اس میں درج ہیں، ان کے مکمل حوالہ جات ساتھ ہی ذکر کردیے گئے ہیں، اور وہ مضامین اصل مآخذ کے ساتھ بندے کے پاس محفوظ ہیں، اگر آنجناب خواہش مند ہوں، تو ان کی عکسی نقول جناب کو ارسال کی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا جناب کے ان مضامین کو جھوٹے قرار دینے کا معاملہ جناب کا موقف ہے۔

اور اگر بندے نے مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حق میں لکھی گئی کتابوں اور مضامین سے اپنی مطلب برآری کی ہے، جیسا کہ جناب کا موقف ہے، تو اس کی نشاندہی اور وضاحت کرنی چاہئے۔ [1]

جہاں تک بندے کے نام کے ساتھ مفتی کے لاحقہ کا تعلق ہے، تو یہ نام جناب کا رکھا یا دیا ہوا نہیں، اس کی سند بندے کے پاس موجود ہے، جس پر جید فقہاء واکابر کے دستخط وتصدیق ثبت ہیں۔

اور اس کتاب کی ترتیب وتالیف مفتی کے کون سے منصب کے خلاف ہے، اس کی نشان دہی فرمائی جائے، تو غور کیا جاسکتا ہے۔

جن مفتیانِ کرام اور اکابر نے اس کتاب پر آرا تحریر فرمائی ہیں، وہ جناب کی

---

[1] فاضل ناقد نے اپنی مرتبہ تالیف میں ایک جگہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کی کتاب میں جو مولانا سندھی صاحب اور مولانا لاہوری کے اختلاف سے متعلق مکاتبت ہے، اس میں یہ تاثر دیا ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کا یہ مکتوب مولانا سندھی صاحب کے حق میں ہے۔

حالانکہ اولاً تو جو کتابیں کسی کے حق میں لکھی گئی ہوں، ان کا حوالہ اس فریق کے حق میں زیادہ موثر ہوتا ہے، کیونکہ دوسرے کی بات کو مخالفت پر محمول کرنے کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، دوسرے اگر کوئی کسی بات کو اپنے لیے مفید سمجھ کر پیش کررہا ہو، مگر اس سے اس کے خلاف بھی ثبوت ہوتا ہو، تو یہ زیادہ موثر حوالہ ہوا کرتا ہے، پھر اس کو اپنی مطلب برآری کا نام دیا جائے یا کچھ اور، اور اس سے کسی کا مطلب نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، اس سے کیا بحث، اگر اس سے اصل مدعا ثابت ہورہا ہو، تو پھر اس الزام کی کیا حیثیت ہوگی؟ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

خدمت میں ارسال ہیں، جن سے آپ کے موقف کی تائید نہیں ہوتی، اگر جناب ان آرا سے بھی اختلاف رکھتے ہیں، تو اُن حضرات سے رجوع فرمایے، تاکہ اُن کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

اور جناب اگر پہلے بندے کو سلوک وتصوف کا بندہ سمجھتے تھے، مگر اب جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں کھیلنے والا ثابت ہوگیا، تو جناب کی غلط فہمی دور ہوگئی، جس پر آپ کو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیے۔

اور اس کے ثبوت کے اتنے قوی دلائل بھی یقیناً آپ کے پاس ہوں گے کہ جن کی بنا پر بروزِ قیامت اس دعوے کو ثابت کیا جاسکے، اگر ایسا ہی ہے، تو اس معاملے کو آخرت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ''فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ''

فقط والسلام

محمد رضوان 2 ربیع الاول 1437 ہجری

بندہ محمد رضوان کے درجِ بالا خط کے جواب میں فاضل ناقد نے دوبارہ بندے کے نام درجِ ذیل خط ارسال کیا۔

---

باسمہٖ تعالیٰ

جناب مفتی محمد رضوان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

جناب نے یہ تو کرم فرمایا کہ خط کا جواب دینے کی زحمت اٹھائی، اللہ تعالیٰ اس کی جزا آپ کو عطا فرمائے۔ آمین۔

لیکن یقین جانیے کہ آپ کے جواب نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ [1]

---

[1] بندہ محمد رضوان نے تو فاضل ناقد کے جواب کے مطالبے پر ان کو خط تحریر کیا تھا، ان کا متاثر ہونا نہ ہونا، یا ان کو متاثر کرنا بندے کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

اس لیے کہ جناب نے اعتراف فرمایا ہے کہ میں نے صرف مضامین کو جمع کیا ہے، جناب کو کتاب میں پھر یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ ضروری نہیں کہ ان مضامین سے میرا اتفاق ضروری ہو۔ [1]

مجھے اصل مضامین کی ضرورت نہیں ہے، آپ کی پیش کش کا شکریہ! میرے پاس بھی یہ اکثر موجود ہیں، حضرت تھانوی کی وہ تقریر بھی جس میں حضرت سندھی کی تعریف وتوصیف میں الفاظوں کا انتخاب ''بس'' ہے، حضرت تھانوی کی مدنی الطبع اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت مدنی کی طرف منسوب مضمون سے ہی سب اپنی مطلب برآری کرتے آئے ہیں، مولانا تقی عثمانی مدظلہٗ نے بھی اسی سے اپنا الّو سیدھا کیا ہے، مولانا محمود میاں صاحب (انوارِ مدینہ) نے اسے چھاپا، اور چھاپتے وقت یہ بھول گئے کہ ان کے دادا مولانا سید محمد میاں صاحب نے حضرت سندھی کے متعلق کیا نظریہ رکھا اور کیا لکھا؟ ان کے باپ مولانا سید حامد میاں صاحب کا کیا نظریہ تھا، اور مولانا سید حامد میاں صاحب کے شیخ اور استاذ حضرت مدنی نے حضرت سندھی پر نقشِ حیات میں قلم توڑ دیے، نقشِ حیات، منسوب مضمون کے بعد کی تحریر ہے، تو بعد کا اعتبار ہوگا؟

حضرت مدنی کی طرف منسوب مضمون جھوٹا ہے، حضرت مدنی نے فرمایا تھا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ میرے نام سے ''مدینہ اخبار'' میں کوئی مضمون اس معاملے کا چھپا ہے؟ یہ کارستانی ایک اور بزرگ کی تھی۔

---

[1] یہ فاضل ناقد کی چاہت ہے، جس کا دوسرے کا مکلّف ہونا ضروری نہیں، یہی وجہ ہے خود فاضل ناقد کی مرتب کردہ مفصل کتاب کے مضامین میں بھی کئی باتیں قابلِ نزاع ہیں، لیکن فاضل ناقد نے بھی اپنے مضمون میں یہ نہیں لکھا کہ:

''ضروری نہیں کہ ان مضامین سے میرا اتفاق ضروری ہو''

فاضل ناقد جس اصول کو اختیار کرتے ہوں، اس کی پابندی خود ان پر تو ضروری ہوگی، لیکن ان کے اختیار کردہ اصول کی پابندی دوسرے پر ضروری نہیں۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

کیا جناب نے ڈاکٹر ابوسلمان صاحب کی کتاب سے مضمون لے کر مطلب برآری کر کے بھونڈا پن نہیں کیا؟ [1]

جناب کی سندِ افتا پر یقیناً اکابر کے دستخط نہیں ہیں، ہاں وقت کے بزرگوں کے ضرور ہو سکتے ہیں، جناب کو ''اکابر'' کی اصطلاح کا بھی علم نہیں ہے؟ یاللعجب!

محدود ادارے کے اکابر تو اب بھی ہیں، لیکن مجموعی جماعتِ دیوبند کا اب کوئی اکابر نہیں ہے۔ [2]

اور آپ کی سند پر ان دستخطوں کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بزرگوں کو مطعون کریں۔

ہم تو اس کے بھی مخالف ہیں کہ مولانا تقی عثمانی مدظلہٗ کے جدید مسائل پر تحقیق کے خلاف کوئی بات کرے، اس میں مولانا کا مقام بس اپنی جگہ ہے، اس مقام پر کوئی نہیں ہے۔ [3]

---

[1] اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ محمد رضوان۔

[2] اولاً تو بندے نے یہ تحریر ہی نہیں کیا تھا کہ بندے کی سند پر ان فقہا و اکابر کے دستخط ہیں، جن کو فاضل ناقد بھی اپنے معیار کے مطابق فقہا و اکابر میں شمار کرتے ہوں، بلکہ بندے کے نزدیک جو حضرات اس کا مصداق ہیں، وہ مراد تھے، فاضل ناقد کی اصطلاح سے بندہ واقعتاً لاعلم تھا، اور اب ان کی اصطلاح کا علم ہو کر بندے کو بھی تعجب ہوا، اور ہمارا تعلق و نسبت اپنے بڑے حضرات سے اسی حیثیت سے ہے، یہ بات تو ممکن نہیں کہ سند کوئی جاری کرے، اور دستخط فاضل ناقد کی اصطلاح کے مطابق اکابر کریں، دوسرے اگر فاضل ناقد کے نزدیک کسی کے مفتی ہونے کے لیے جماعتِ دیوبند کے ان اکابر کی طرف سے سند پر دستخط ضروری ہوں، جو ان کے دعوے کے مطابق مجموعی جماعتِ دیوبند کے اکابر ہیں، تو پھر موجودہ دور میں شاید ہی کوئی اس شرط پر پورا اُترے، خواہ وہ فاضل ناقد کے نامزد حضرات ہی کیوں نہ ہوں۔ محمد رضوان

[3] ایک طرف تو فاضل ناقد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے بارے میں مذکورہ تحسینی کلمات لکھتے ہیں، اور دوسری طرف ان کے متعلق بلکہ کئی قابلِ احترام حضرات کے متعلق اپنے خط میں یہ بھی لکھتے ہیں:

''حضرت مدنی کی طرف منسوب مضمون سے ہی سب اپنی مطلب برآری کرتے آئے ہیں، مولانا تقی عثمانی مدظلہٗ نے بھی اسی سے اپنا اُلّو سیدھا کیا ہے، مولانا محمود میاں صاحب (انوارِ مدینہ) نے اسے چھاپا''

نیز ایک مقام پر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی طرف تخریب کی نسبت بھی کر چکے ہیں، جیسا کہ گزرا۔

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

جناب کی بھیجی ہوئی آرا نظر سے گزار لیں ہیں، اس میں کوئی بھی اکابر کے درجے کا نہیں ہے۔ [1]

میری غلط فہمی دور نہیں ہوئی، آپ جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں ہی کھیل رہے ہیں۔ [2]

آپ نے اپنی کالی کتاب میں مسعود عالم ندوی کا مضمون لگایا ہے، اس کو آپ جانتے ہیں؟ [3]

---

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ ہمارے نزدیک حضرت مدنی کے اس مضمون سے مستند و معتمد اہلِ علم و اہلِ فضل حضرات اپنی مطلب برآری کرنے کے بجائے مولانا سندھی صاحب کے متعلق حضرت مدنی کے اس انتہائی معتدل مضمون کے مطابق موقف اختیار کرتے آئے ہیں، اس کو پھر فاضل ناقد یا کوئی اور کچھ بھی نام دے دیں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ محمد رضوان۔

[1] اولاً تو بندے نے 'مفتیانِ کرام اور اکابر'' کے الفاظ اپنے خط میں تحریر کیے تھے، اور ان آراء میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا نام بھی داخل ہے، لیکن فاضل ناقد نے یہاں ان کی سند پر اکابر کے دستخط ہونے نہ ہونے کی بحث کی ضرورت نہیں سمجھی، بندے نے اپنے خط میں ایسی کوئی قید نہیں لگائی تھی کہ وہ ایسے اکابر ہیں، جن کو فاضل ناقد بھی اپنا اکابر تسلیم کرتے ہوں۔ محمد رضوان۔

[2] بندے نے فاضل ناقد کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اپنی صفائی میں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا، بلکہ بندے کا مقصود یہ تھا کہ اگر فاضل ناقد کو پہلے بندے کے متعلق خانقاہی نظام اور سلوک و تصوف کا بندہ سمجھنے کی غلط فہمی تھی، اور اب جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں کھیلنے والا ثابت ہو کر وہ سابقہ غلط فہمی دور ہو گئی، تو اس پر انھیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، چنانچہ بندے کے خط کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''جناب اگر پہلے بندے کو سلوک و تصوف کا بندہ سمجھتے تھے، مگر اب جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں کھیلنے والا ثابت ہو گیا، تو جناب کی غلط فہمی دور ہو گئی، جس پر آپ کو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہئے۔

اور اس کے ثبوت کے اتنے قوی دلائل بھی یقیناً آپ کے پاس ہوں گے کہ جن کی بنا پر بروزِ قیامت اس دعوے کو ثابت کیا جاسکے، اگر ایسا ہی ہے، تو اس معاملے کو آخرت پر چھوڑ دینا چاہئے۔

فَانْتَظِرُوا اِنِّی مَعَکُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِینَ

[3] جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ہم نے اپنی پہلی مفصل کتاب میں مضامین کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا اہتمام کیا تھا، ان مضامین اور ان کے محررین کے تعارف اور اس کی تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی تھی، بعد میں فاضل ناقد وغیرہ کی طرف سے جن اُمور کی نشاندہی اور توضیح و تنقید کی ضرورت سامنے آئی، ان پر زیرِ نظر مضمون اور ضمیمہ جات میں کلام کر دیا گیا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب اور ان کے مضمون پر بھی کلام تفصیل کے ساتھ اسی مضمون کی الگ فصل میں پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔ محمد رضوان

www.idaraghufran.org

آپ کی کتاب پر تبصرہ کرنے والوں میں موسیٰ بھٹو کون ہے؟ کیا یہ حضرت تھانوی کی سلوک وتصوف کی آڑ میں اپنے جماعتِ اسلامی کے تعلق کو چھپا سکتا ہے؟

جس کے تبصرے میں خوب واضح ہے کہ مولانا سندھی کے خلاف ہماری آرزو پر کسی نے کان نہیں دھرے، بس آپ ہی پھسلے، اس بے غیرت نے مولانا صادق صاحب کو بھی لپیٹ دیا ہے، مارکسزم کا کام ان کے ہاں اسّی سال سے ہو رہا ہے، مولانا حسین احمد پاگل تھے، جو اِن کے ہاں آتے تھے۔ [1]

اپنی سند کو جلا دیں، جو بزرگوں کے خلاف کام کرنے کے لیے دھوکا دہی سے حاصل کی گئی ہے، بجائے تعمیر کے تخریب میں یہ سند استعمال ہو رہی ہے۔ [2]

اور یہ شکیل عثمانی کون ہے؟ کیا یہ جماعتِ اسلامی کا نہیں ہے؟ اللہ کے ہاں فیصلہ تو بعد میں ہوگا، یہاں کی بھی فکر کیجیے۔ [3]

یہ مختصر سا اظہار ہے، اس سے مستقل تحریر کی ضرورت ہے، جس میں بتایا جائے

---

[1] جب دیوبند مکتبِ فکر کے بزرگوں کی رائے کا ذکر آتا ہے، تو فاضل ناقد ان کو اکابر کی فہرست سے خارج کر دیتے ہیں، اور جب کسی دوسرے مکتبِ فکر یا دوسرے ذوق کے حضرات کی رائے کا ذکر آتا ہے، تو وہاں کوئی دوسرا اعتراض کر دیتے ہیں، اور جب حضرت مدنی، حضرت تھانوی اور دیگر متعدد اکابرِ دیوبند کی مطبوعہ آراء کا ذکر آتا ہے، تو وہاں کوئی دوسری تاویل کر دیتے ہیں۔

فاضل ناقد کے مندرجہ بالا اعتراض کا جواب پہلی فصل کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ محمد رضوان

[2] یہ فاضل ناقد کی اپنی ذہنی سوچ ہے، جس سے دوسرے کا متفق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ فاضل ناقد نہ سند لینے والوں میں داخل ہیں، نہ دینے والوں میں، تو جو شخص کسی معاملہ کے ''تین میں نہ تیرہ میں'' شامل ہو، اس کے فیصلہ کا کیا اعتبار ہوگا۔ محمد رضوان

[3] فاضل ناقد اصل موقف پر گفتگو کرنے کے بجائے جان نہ پہچان، میں تیرا مہمان، کا مصداق بن کر، جس پر چاہیں، اپنی مرضی سے جماعتِ اسلامی یا کسی بھی فکر کا حامل قرار دینے کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔

جناب شکیل عثمانی صاحب کون ہیں؟ ان کے بارے میں پہلی فصل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

اگر اس کا فیصلہ دنیا میں ہونا مشکل ہو، تو آخرت میں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو ہی جائے گا، جب شکیل عثمانی صاحب بھی موجود ہوں گے، اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے؟ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

دیوبند کا لیبل لگانے والوں کے اخلاق کیا ہیں؟ [1]

والسلام

.....

5 جنوری 2016ء

فاضل ناقد کے دوسرے خط کے جواب میں بندہ محمد رضوان کو ان سے مکاتبت پر شرح صدر نہیں ہوا، البتہ بندہ محمد رضوان نے اس خط کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ نام کے اظہار کے بغیر ایک عمومی جواب تحریر کیا، جس میں فاضل ناقد کی طرف سے موضوع سے ہٹ کر تحریر کردہ کچھ غیر متعلقہ چیزوں کا بھی جواب تحریر کیا گیا تھا، لیکن بندے کو اس جواب کی اشاعت پر شرح صدر نہیں ہو رہا تھا، اس لیے اصلاح کی غرض سے اپنے شیخ و مصلح حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی خدمت میں بندے نے یہ جواب اور اس کا پسِ منظر لکھ کر اصلاح طلب کی، جس کا حضرت والا مدظلہم نے جواب تحریر فرمایا، جس کے بعد بندہ محمد رضوان نے، الحمدللہ تعالیٰ اسی کے مطابق عمل کیا۔

اس سلسلے میں بندہ محمد رضوان کے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے نام اصلاحی خط اور حضرت والا کی طرف سے موصول شدہ جواب کو بعینہٖ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معظم و محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

عرض ہے کہ بندہ کی تالیف جو مولانا عبیداللہ سندھی اور فکرِ ولی اللّٰہی کے موضوع پر

---

[1] جہاں تک اہلِ دیوبند کے اخلاق کا تعلق ہے، تو اس کے متعدد مناظر قارئین کے سامنے اسی تالیف میں گزر چکے ہیں، جن سے اہلِ دیوبند کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے، اور ان اخلاق کا مظاہرہ کسی سے اختلاف و اتفاق کی دونوں صورتوں میں قارئین کے سامنے ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

شائع ہوئی ہے، اس کے دوسرے ایڈیشن کا مرحلہ قریب ہے، جس میں ضمیمے کے طور پر اس کتاب پر حاصل شدہ آراو تبصرے بھی شامل کیے جارہے ہیں۔

اس کتاب پر ایک کراچی کے عالم صاحب کا مختصر خط موصول ہوا تھا، جس کے جواب میں بندے نے مختصر خط لکھ دیا تھا، اس کے بعد پھر انھوں نے دوبارہ خط لکھا تھا، جس میں کچھ باتیں بندے کی ذات سے متعلق یا غیر جواب طلب تھیں، اور کچھ باتیں ایسی تھیں کہ جن کا جواب تحریری طور پر اس کتاب کے ضمیمے میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

بندے نے اس کے متعلق ایک عام سی تحریر مرتب کی ہے، جس کا بہ ضرورت جواب کچھ سخت محسوس ہوا، اس لیے ان صاحب کا پہلا اور دوسرا خط اور بندے کے پہلے خط کا جواب، عکسی نقول کے ساتھ اور ضمیمے میں شائع ہونے والا مفصل جواب حضرت والا کی نظرِ ثانی واصلاح کے لیے مرسل ہے۔

اگر حضرت والا اس کو ملاحظہ فرما کر حذف واصلاح جو کچھ فرمانا مناسب سمجھیں، اس سے مستفید فرمادیں، تاکہ اس کے مطابق اشاعت ہوسکے، تو نوازش ہوگی۔

والسلام۔

محمد رضوان

12 / ربیع الآخر/ 1437 ہجری

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بندہ محمد رضوان کے مذکورہ خط کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے درج ذیل جواب سے مستفید فرمایا۔

**فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء.**

---

باسمہٖ سبحانہٗ

www.idaraghufran.org

مکرم بندہ! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

بندے نے خطوط اوران کا جواب دیکھا۔

بندے کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کے مکاتیب کا بالخصوص ذکر کرکے ان پر تبصرے کے بجائے ایک عمومی انداز سے دو باتوں کی تردید کردی جائے۔

ایک حضرت مدنی قدس سرہٗ کے رجوع کی بات، دوسرے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تعریف کی بات، جو آپ نے ماشاءاللہ مدلل انداز میں کردی ہے۔

لیکن خاص اس خط کا حوالہ دے کر اس کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے، صرف اتنا لکھ دیا جائے کہ بعض حضرات نے دو شبہے ظاہر کیے ہیں، ان کا جواب یہ ہے۔

اور اگر ان صاحب کو شخصی طور پر جواب دینا ضروری ہو، تو اتنا لکھ دیا جائے کہ مذکورہ دو باتوں کی تفصیل بندے نے نئے ایڈیشن میں کردی ہے، پھر مباحثے کو زیادہ نہ چلایا جائے۔

**ھٰذا ما عندی، والامر الیکم**

**واللہ سبحانہٗ اعلم**

**محمد تقی**

**1437/4/29 ہجری**

ایسی جگہ سے جواب لکھ رہا ہوں، جہاں مستقل کاغذ میسر نہیں، اس لیے پشت پر بے تکلفی سے لکھ دیا۔

---

حضرت والا کے اس مکتوب کی روشنی میں بحمداللہ تعالیٰ بندے نے دوسری باتوں کو حذف کرکے صرف دو شبہات کے جوابات ہی کے ذکر پر اکتفا کیا تھا، جس کے بعد مباحثے کو جاری رکھنے سے کنارہ کشی اختیار کی تھی، اور پہلے نجی خط وکتابت ہونے کے وقت اسی کے مطابق عمل

www.idaraghufran.org

بھی کیا گیا، جیسا کہ ہماری کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے ضمیمے سے ظاہر ہے۔

اور شروع میں ارادہ یہی تھا کہ اس مباحثے کو آگے نہ چلایا جائے، اگر فاضل ناقد صرف نجی خط وکتابت پر اکتفا کرتے، نیز اس سلسلے میں عادلانہ ومنصفانہ، اور غیر متعصّبانہ علم وتحقیق پر مبنی موقف اختیار کرنے والے اکابر، اصحابِ علم وفکر حضرات کی طرف اس طرح سے، ظلم و ناانصافی اور علمی خیانت کے ارتکاب کی نسبت کرکے شائع نہ کرتے، جس سے ان کی دیانت داری، اور علمی وتحقیقی سنجیدہ خدمات پر زَد پڑتی ہے۔

نیز یہ معاملہ مولانا سندھی صاحب یا فاضل ناقد یا کسی اور کی صرف ذات کا ہوتا، تو ہماری طرف سے، اس بحث کو آگے چلانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر افسوس کہ یہ معاملہ دین کا ہے، اور اس کو درگذر کردینے سے اسلامی افکار ومقتضیات اور سنجیدہ علمی ودینی شخصیات کے خلاف بدزبانی وبدکلامی، طعن وتشنیع اور ایک دوسرے کی تحقیر وتذلیل اور اس کو دین کے بجائے، ذات کی اونچ نیچ کا معاملہ سمجھے جانے کی جسارت، اور مسلمانوں میں فکری واخلاقی بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ [1]

---

[1] فجعل العفو مقروناً بالإصلاح. فالعفو قد يمكن أن يكون غير إصلاح، فقد يكون هذا الذى جنى عليك واجترأ عليك رجلاً شريراً معروفاً بالشر والفساد، فلو عفوت عنه لتمادى فى شره وفساده فالأفضل فى هذا المقام أن تأخذ هذا الرجل بجريرته، لأن فى ذلك إصلاحاً. قال شيخ الإسلام ابن تيميه: الإصلاح واجب، والعفو مندوب، فإذا كان فى العفو فوات الإصلاح فمعنى ذلك أننا قدمنا مندوباً على واجب، وهذا لا تأتى به الشريعة(مكارم الأخلاق،لمحمد بن صالح بن محمد العثيمين، ص٢٧،مجالات حسن الخلق)

العفو على قسمين: أحدهما: أن يصير العفو سببا لتسكين الفتنة ورجوع الجانى عنه جنايته.

والثانى: أن يصير العفو سببا لمزيد جرأة الجانى وقوة غيظه، فآيات العفو محمولة على القسم الأول، وهذه الآية محمولة على القسم الثانى وحينئذ يزول التناقض.

" روى: أن زينب أقبلت على عائشة تشتمها فنهاها النبى ـ صلى الله عليه وسلم عنها فلم تنته فقال النبى ـ صلى الله عليه وسلم ـ " : دونك فانتصرى "وأيضا فإنه تعالى لم يرغب فى الانتصار، بل بين أنه مشروع فقط، ثم بين أن مشروعيته مشروطة برعاية المماثلة فقال: (وجزآء سيئة سيئةمثلها) ثم بين أن العفو أولى بقوله: (فمن عفا وأصلح فأجره على الله) فزال السؤال(تفسير اللباب لابن عادل،ص ٤٤٧٢،سورة الشورى)

www.idaraghufran.org

ان حالات میں ان کی طرف سے شائع شدہ اعتراضات وشبہات کی تنقیحات اور توضیحات کی ضرورت کے پیشِ نظر، ماقبل میں تفصیل ذکر کردی گئی ہے، جس سے کسی کی ذات کی تحقیر وتنقیص اور دل آزاری مقصود نہیں، اگر پھر بھی کسی کو ایسا محسوس ہو، تو بندہ پیشگی معذرت خواہ ہے، اور اپنے اور دوسروں کے لیے افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کے لیے، اللہ کے حضور دعاء گو ہے۔

آخر میں یہی عرض ہے کہ اہلِ انصاف کے نزدیک افراط وتفریط کے درمیان اعتدال ہی کا راستہ ہمیشہ تاریخی اہمیت کا حامل اور فیصلہ کن رہا ہے، جو متنازع شخصیات کو ان کا صحیح درجہ اور حق دیتا ہے، اور تاریخ کا وہ معتدل فیصلہ ہی اہلِ انصاف کے لیے دیرپا طریقے پر موثر ومعتبر رہا ہے، اگرچہ اس کے خلاف جتنا کچھ بھی کیوں نہ کہا، سنا جاتا رہا ہو۔

وَاِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَاِنْ تَعُوْدُوا نَعُدْ الخ

فقط

وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ.

محمد رضوان خان

22/شوال المکرّم/1439ھ، 07/جولائی/2018ء بروز ہفتہ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

www.idaraghufran.org

جن مسالک وشخصیات کا باہم نظریاتی وفکری اختلاف ہوا، ان میں بھی سنجیدہ علمی شخصیات نے ایک دوسرے سے سخت سے سخت اختلاف کرنے کے باوجود، ایک دوسرے کے شخصی وذاتی احترام کو ہدف بنانے سے حتی الامکان اجتناب کیا، اور اسی کے ساتھ بوقتِ ضرورت دوسرے کی عمدہ صفات وغیرہ کا بھی اعتراف کیا، اور اختلاف کو اختلاف کی حد تک محدود رکھا، اختلاف برائے اختلاف سے کنارہ کشی اختیار کی۔

خود مولانا سندھی صاحب کے بعض متضاد ومتنازع اور شاذ افکار وخیالات پر تنقید کرنے والے مستند وسنجیدہ حضرات نے بھی بے جا تعصُّب وتحزُّب سے بچتے ہوئے مولانا سندھی صاحب کی ذات وشخصیت کا احترام اور ان کے اوصاف وخدمات کا اظہار واعتراف کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے متبعین میں مولانا سندھی صاحب کے متعدد افکار وخیالات سے اختلاف کے باوجود، ان کی خدمات وصفات کا اعتراف اور ان کا ذاتی وشخصی احترام آج تک قائم وباقی ہے۔ (ص ۱۳، ۱۴)

ادارۂ غفران راولپنڈی پاکستان